اضافہ شدہ

قرآن اور تعمیرِ سیرت

تالیف
جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹرایٹ لا
صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

پروگریسو بکس

قرآن اور تعمیرِ سیرت

اضافہ شدہ

تالیف
جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب
ایم اے پی ایچ ڈی (لندن) بیرسٹر ایٹ لا
صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

پروگریسو بکس
۴۰-بی-اردو بازار لاہور

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن اور تعمیر سیرت

مصنف ——— ڈاکٹر میر ولی الدین

بار اول ——— 1988ء

بار دوم ——— 2012ء

پرنٹرز ——— حاجی حنیف پرنٹرز

ناشر ——— چوہدری غلام رسول
میاں جواد رسول

قیمت ——— -/300 روپے

ملنے کے پتے

اسلام بک ڈپو
۱۲ گنج بخش روڈ لاہور 042-37112941

ملت پبلی کیشنز
فیصل مسجد اسلام آباد Ph: 051-2254111
E-mail: millat_publication@yahoo.com

شوروم ملت پبلی کیشنز دوکان نمبر 5 مکہ سنٹر نیو اردو بازار لاہور 0321-4146464

پروگریسو بکس یوسف مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور
فون 042-37124354 فیکس 042-37352795

Marfat.com

انتساب

مرشدی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام جن
کے فیضانِ توجہ اور برکاتِ تربیت سے اس خدمت کے
لائق ہوا۔

عمرِ حریص در طلبِ کیمیا گزشت
مارا قبولِ اہلِ نظر کیمیا بس است

میر ولی الدین

Marfat.com

مصنّف کی دُوسری کتابیں

۱۔ قرآن اور تصوّف
۲۔ فلسفہ کیا ہے ؟
۳۔ رموز اقبال
۴۔ مراقبات
۵۔ قنوطیت یا فلسفۂ یاس
۶۔ ابطالِ مادیت
۷۔ رسالۂ اخلاقیات

تراجم

۸۔ رہنمائے قرآن
۹۔ تاریخ فلاسفہ اسلام
۱۰۔ تاریخ مسائل فلسفہ
۱۱۔ مقدمہ فلسفۂ حاضرہ
۱۲۔ فلسفہ کی پہلی کتاب
۱۳۔ مقدمہ مابعد الطبیعات

Marfat.com

فہرست مضامین

تمہید	صفحہ ۹
عبادت و استعانت	۱۳
توحید الوہیت	۴۲
صالحیت	۱۰۹
نیکی علم ہے	۱۲۲
تعلیم کا مقصد	۱۳۰
انسانِ کامل	۱۴۰
امام غزالی کا فلسفۂ مذہب	۱۳۵
تصحیح فکر	۱۵۳
احساس	۱۵۹
قانونِ تجاذب اور تعمیرِ سیرت	۱۶۷
قرآن اور سیرت سازی	۱۷۴
قوت ایمانی اور ظہورِ غیب	۱۹۷
ماحول پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے	۲۱۲
کامیاب زندگی کا قرآنی تصور	۲۲۸
قرآن اور علاجِ خوف	۲۵۳
بے خوف زندگی	۲۶۵
دارو سے علاج	۲۷۵
قرآن اور علاجِ حزن	۲۸۳
زندگی میں غم کیوں ہے	۲۹۳
قرآن اور علاجِ غضب	۳۰۳
دعا کا فلسفہ	۳۱۴
دعاء اور دفع بلا	۳۲۳
اسرارِ حج	۳۳۱

Marfat.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اس کتاب کے بعض مقالات ۱۹۴۲ء میں "ادارۂ اشاعتِ اسلامیات" حیدر آباد دکن کے زیر اہتمام "قرآن اور سیرت سازی" کے عنوان سے شائع ہوئے تھے، پھر رفتہ رفتہ ان میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ اب ۱۹۵۵ء میں یہ ایک مکمل اور ضخیم کتاب کی صورت میں پیش کیے جا رہے ہیں۔ گویا یوں کہنا چاہیے کہ "قرآن اور تعمیرِ سیرت" ۱۹۴۲ء کی قرآن اور سیرت سازی سے اب ایک علیحدہ جدید تالیف کی صورت میں سامنے آرہی ہے۔

۱۹۴۷ء کے انقلاب سے ملک میں جو حالات رونما ہیں اُن کی موجودگی میں اردو کی کسی ضخیم علمی اور مذہبی کتاب کا شائع کرنا آسان نہیں رہا ہے، پوری فضا مایوسیوں اور تاریکیوں میں گھری ہوئی ہے، اردو کو خود اس کے بولنے والے اور اس کی آغوشِ شفقت میں تربیت پانے والے دیس نکالا دینے پر تلے ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ حیدر آباد دکن جس کے چپے چپے سے کبھی دل آویز اردو تالیفات کے چشمے اُبلا کرتے تھے آج ایک ویرانے میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے اور اس کے ادبی اور علمی مرکز یا تو انقلاب کی موجوں میں لپٹ کر فنا ہو گئے ہیں اور یا ان میں خاک اُڑ رہی ہے۔

لیکن سخت جان "ندوۃ المصنفین" جس کا وجود کسی حکومت یا ریاست کے اقتدار و سطوت سے وابستہ نہیں تھا تباہی و بربادی کی تمام منزلوں سے گزرنے پر بھی اس لائق ہے کہ اس کی نگرانی میں یہ روحانیت میں ڈوبی ہوئی پُر افادہ کتاب شائع کی جا رہی ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

"قرآن اور سیرت سازی" کے تعارف کے سلسلہ میں مولوی محمد اسحاق صاحب بی ایس سی ڈپٹی ایڈیٹر عثمانیہ نے "ادارۂ اشاعت اسلامیات" کے معتمد کی حیثیت سے جو دیباچہ لکھا تھا، ماضی کے مٹے ہوئے نقوش کی یاد تازہ رکھنے کے لیے اس جگہ اسی دیباچہ کا ضروری حصہ نقل کیا جاتا ہے:۔

"ڈاکٹر صاحب علماء ہند میں کسی تعارف کے محتاج نہیں، صاحب موصوف مذہب اور دنیداری

Marfat.com

کے زندہ پیکر ہیں اور ان کے فیضِ صحبت سے بیسیوں طالب علم صبغۃ اللہ میں رنگے جا رہے ہیں، رات دن کے اس مشغلہ سے ان کو انسانی کردار کی تعمیر کا ایسا ملکہ حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اس کی نفسیاتی کمزوریوں اور امراض کی تشخیص کر کے قرآن کے ذریعہ ان کے بہترین علاج تجویز فرماتے ہیں، مزید براں اپنے مقالات میں جا بجا احادیث اور صوفیائے محققین کے اقوالِ نظم و نثر سے بکثرت استشہاد فرماتے ہیں۔ اور باوجودیکہ ڈاکٹر صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی (لندن)، بار ایٹ لا اور جامعۂ عثمانیہ میں مغربی فلسفہ کے صدرِ شعبہ وغیرہ سب کچھ ہیں لیکن مقالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ تصوفِ قرآنی کے کسی رمز شناس عارف کے قلم سے یہ سطور نکلی ہیں۔

بہر حال یہ کتاب فلسفہ، تصوف اور ادب کا ایک خوشگوار امتزاج ہے۔"

میں اس تعارف میں اتنا ہی اضافہ کر سکتا ہوں کہ فاضل دیباچہ نگار نے محترم ڈاکٹر صاحب سے جن خصوصیتوں کو منسوب کیا ہے، میرے ذاتی مشاہدے میں بھی یہ تمام خصوصیات میر ولی الدین کے پیکر میں اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر ہیں، موصوف اس دور کے اول درجے کے روحانی فلسفی اور متکلم ہیں، اور ملتِ گم گشتہ کی نبض پر ایک ماہرِ فن طبیب کی حیثیت سے ہاتھ رکھنا جانتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساسِ کمتری، بے یقینی اور تذبذب کی ظلمتوں میں پھنسے ہوئے ہیں، یہ گراں قدر تالیف ان کے روحانی رشتے کو مضبوط و مستحکم کرنے میں "چراغِ راہ" کا کام دیگی۔

عتیق الرحمٰن عثمانی

ناظم ندوۃ المصنفین دہلی

یکم ذی قعدہ ۱۳۸۱ھ

Marfat.com

تمہید

پیشِ نظر کتاب بظاہر ایک کثرت ہے اور یہ کثرت مختلف موضوعوں کے اظہارِ خیالات پر مشتمل ہے مختلف اوقات میں مختلف تصورات کو واحد نصب العین کے زیر اثر پیش کیا گیا تھا اور اب انہیں یکجا حاضر کر دیا گیا ہے۔ لیکن نصب العین کی عینیت ہی وہ وحدت ہے جو اس کثرت میں متجلی ہے اور انہیں ایک شیرازہ میں باندھ رکھا ہے۔ اس نصب العین کو یہاں مختصراً پیش کرنا مقصود ہے، عہدِ حاضر کے نوجوانوں کا خیال ہے کہ دین معاملہ ہے ان چند ناکامیاب، افسردہ دل، آشفتہ دماغ ضعیفوں کا جن کے ہاتھ سے دنیا نکل چکی ہے، جن میں متاعِ دنیوی سے محظوظ ہونے کی نہ قابلیت باقی رہی ہے اور نہ خواہش، یہ مسرت و شادمانی کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ چکے ہیں اور حزن و غم کے آغوش میں ان کے دن گزر رہے ہیں۔ دنیا میں کامیابی، کامرانی، مسرت و راحت، کا حاصل کرنا دنیوی اصول کے عاقلانہ استعمال ہی سے ممکن ہے، دینی اصول کو ان میں کیا دخل ہے۔ شاید قبر کے اس طرف ان کا کام پڑتا ہو تو ہو!

پیش نظر اوراق میں اس مغالطہ کو اس کی تمام تفصیلات میں رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصولاً بتلایا گیا ہے کہ کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے سیرت کی تعمیر ضروری ہے اور جب تک سیرت کی تعمیر قرآنی اصول پر نہ ہو دنیا میں کامیابی و کامرانی کے ساتھ چین اور طمانیت کا جمع ہونا ممکن نہیں! کامیابی محض مال یابی کا نام نہیں، بلکہ مراد ہے طمانیتِ روح اور بردِ قلبی کا جو محض مالیاب کو کسی طرح حاصل نہیں ہوتی۔ واضح کیا گیا ہے کہ دنیوی عقلِ حائق (عقل

میں روشنی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ حرص و ہوٰی سے آزاد ہو کر علمِ وحی کے تابع ہو جاتی ہے۔ اور حقیقت میں عاقل و بالغ وہی ہے جو ہوٰی و ہوس سے آزاد ہے۔

خلق اطفال اند جز مستِ خدا　　نیست بالغ جز رہیدہ از ہوٰی (رومی)

کامیابی و کامرانی، مسرت و طمانیت اس مردِ حُر کا انعام ہے جس نے اپنی عقل کو محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل پر قربان کر کے اپنی ذات میں تقوٰی کے اوصاف پیدا کر لیے ہیں۔ اور حق تعالیٰ کو مہماتِ دینی و دنیوی میں کافی تصور کر لیا ہے۔ الیس اللہ بکافٍ عبدہٗ۔

عقل قرباں کن بہ پیشِ مصطفٰی　　حسبی اللہ گو کہ اللہ ام کفٰی

زیں خرد جاہل ہمی باید شدن　　دست در دیوانگی باید زدن

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد　　ایں عسس را دید و در خانہ نہ شد (رومی)

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اسی طریقہ سے تسخیرِ جہات میں کامیابی حاصل کی تھی، ان کے شکوہ و جلال سے سلاطین کانپ اٹھتے تھے، انہوں نے حریت و آزادی کا تسلط دنیا میں قائم کر دیا اور جبر و استبداد کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اسی اسوہ پر ایک بار پھر زندگی کو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اور ان اوراق کا مقصد عہدِ حاضر کے نوجوانوں کو اس کی طرف دعوت دینا، اور اس کی تفصیلات کو ان پر واضح کرنا ہے۔

خود مؤلف کو اس اسوہ کی طرف کچھ سال قبل ایک عارف تام المعرفت[۱] نے بلایا اور اپنی زبان فیض ترجمان سے اس کی تفصیلات کو سمجھایا اور سات سال کے دوران میں مختلف اوقات میں ہر جزی کی کلی وضاحت فرماتے رہے۔ مغربی و مشرقی فلسفہ کے گہرے مطالعہ سے جس دماغ نے تربیت پائی تھی، اور جس کی عقل کو بقول اقبال "تنقید سے فرصت

---

[۱] میرا اشارہ ہے مولائی و آقائی حضرت محمد حسین صاحب قبلہ کی طرف جو ۲۲۔ ربیع الاول ۱۳۶۳ھ اپنے فرزندوں کو مغموم چھوڑ کر رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے فروح و ریحان و جنتِ نعیم۔

Marfat.com

رہتی ہے، اور جو بالآخر عقل کی گتھیوں کو سلجھانے سے عاجز آگیا تھا اس "صاحبِ جنون" نے اپنے ایک نکتہ سے کہ عقل تابع وحی ہو کر ہی اپنے بتوں سے نجات پا سکتی ہے، لات و منات کی بندگی سے آزاد ہوسکتی ہے۔ اس کو "دل نیازمند و نگاہِ پاک باز" کا شیدا کر دیا جو حصول معرفت کا واحد طریقہ ہے۔ اس نکتہ کے قلب میں اترنے کے بعد وہی ہوا جس کی اقبال نے خبر دی تھی۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود ۔۔۔ جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

اس روحانی انقلاب کے بعد جہان جیسا نظر آنے لگا اس کو ان صفحات میں پیش کیا گیا ہے۔ اولاً اصول موضوعہ کو پیش کیا گیا ہے، ان کو اپنی ہمت اور اختیار کے استعمال سے عمل میں لانے کی تاکید کی گئی ہے، پھر انہی اصول کو مختلف مسائل کے حل کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ سیرت سازی کے لیے خوف و حزن و غضب کے دفعیہ کے لیے، کامیاب زندگی کے لیے، طمانیت و بردِ قلبی کے حصول کے لیے ان نسخوں میں سے اکثر کو "معارف" کے صفحات میں پیش کیا گیا، اور اہلِ ملک نے ان کو پسند بھی فرمایا ہے۔ یہاں یہ سب یکجا حاضر ہیں، یہ اس دل کی سوغات ہیں جو عقل کا غلام نہیں!

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہے وہ دل نہ کر قبول! (اقبال)

مگر زبان عقل کی ہے، تصورات و تعقلات سب عقلی ہی ہوتے ہیں اور انہی میں مفہومات روحانی کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا مقصود مفہوم ہے نہ کہ زبان جو محض ذریعہ ہے۔

والسلام علی من اتبع الہدیٰ!

۲۷۔ مارچ ۱۹۴۵ء

میر ولی الدین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عبادت واستعانت

اے درد دلِ من اصل تمنا ہمہ تو   وے در سرِ من مایۂ سودا ہمہ تو
ہر چند بہ روزگار در می نگرم   امروز ہمہ توی و فردا ہمہ تو (ابوسعید عنہ)

انسان بلکہ تمام حیوانات کی زندگی کا پہلا قانون جلبِ منفعت و دفعِ مضرت ہے، تحفظِ ذات اور تولیدِ نسل دونوں کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ ان چیزوں کو طلب کرے جو اس کی زندگی کے حفظ و بقا میں ممد و معاون ہیں، اور ان چیزوں سے گریز کرے جو اس کو عدم کی طرف لیجاتی ہیں، یا قوتِ حیات کی تحدید کا باعث ہوتی ہیں۔ اشیاء کی ابتدائی تقسیم اسی نقطۂ نظر سے کیجاتی ہے، اشیاء یا تو نافع ہیں یا ضار، مفید ہیں یا نقصان رساں، اچھی ہیں یا بری! عضویت پر جب ان کے اثرات کا ترتب ہوتا ہے تو لذت، محبت، فریفتگی یا اطاعت پیدا ہوتی ہے، یا الم، نفرت، خوف اور توحش۔ ان میں سے ایک بالطبع محبوب ہے، مرغوب ہے، تو دوسری فطرۃً غیر محبوب و نامرغوب، ایک کے حصول کا وہ کوشاں ہوتا ہے تو دوسرے سے گریزاں انسان کی زندگی کا تار و پود یہی جذبات ہیں، ان کا زور مرد افگن ہوتا ہے۔ ان کے شر و شور سے اس کو فرصت ملتی ہے اور نہ نجات، یہاں تک کہ زندگی کے مقررہ دن ختم ہو جاتے ہیں، اور وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہوتا ہے:

من بلغ جہاں راقفسے دیدم و بس   مرغش ز ہوا و ہوسے دیدم و بس
از صبحِ وجود تا شباں گاہِ عدم   چوں چشم کشودم نفسے دیدم و بس (سحابی استرآبادی)

اپنی زندگی کے مختصر قیام میں ہر شخص اشیاء کی تغیر و حدوث کا اچھا مشاہدہ کرتا ہے، کائنات میں ایک دائمی تغیر جاری ہے، کوئی شے ساکن نظر نہیں آتی، سکون و ثبات فریبِ نظر معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ذرۂ کائنات میں ایک تڑپ سی نظر آتی ہے، کاروانِ وجود کو کہیں قیام نہیں، شانِ وجود ہر لحظہ تازہ ہوتی ہے، قہری تجلی ہر شے کو ہر لحظہ فنا کر رہی ہے اور جمالی تجلی ہر لحظہ وجود بخش رہی ہے۔

هستی کہ عیاں نیست دواں در حالے ۔۔۔ در شان دگر جلوہ کند ہر آنے

این نکتہ بجو ز کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ ۔۔۔ گر بایدت از کلامِ حق برہانے

جامی

اشیاء کے اس تغیر و تبدل، تلوّن و حدوث، فنا پذیری و زوال کی جہت جب چشمِ بصیرت رکھنے والے انسان پر نمایاں ہو جاتی ہے تو اپنے اپنے فقر و احتیاج کی وجہ سے ذل و افتقار یا بندگی کی نسبت جو ان سے قائم کر رکھی تھی، وہ یکدم کٹ جاتی ہے، ذواتِ خلق کا فقر اس کی نظروں میں واضح ہو جاتا ہے، اور اس کو اس ذات کی تلاش ہوتی ہے، جو حدوث و تغیر سے منزہ ہو، جو قائم بالذات ہے .... جو واجب و قدیم ہے، صفاتِ کمالیہ سے موصوف ہو، فعّال ہے، سارے جہان کی مالک و حاکم و مولیٰ و رب ہے۔

اب مذہب یا دین کا ماحصل بھی اتنا ہی ہے، کہ ذل و افتقار کی نسبت (جس کو دین کی زبان میں عبادت و استعانت سے تعبیر کیا جاتا ہے) ذواتِ خلق سے قائم نہ کی جائے اور احتیاجات اور حاجات میں استعانت ذواتِ خلق سے نہ کی جائے، بلکہ عبادت و استعانت کا مرکز ذاتِ اللہ رہے، یہی مفہوم ہے اس دعوتِ کلمۂ طیبہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا کہ اللہ کے سوا کوئی ذات قابلِ عبادت و مستحقِ استعانت (الٰہ) نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، اس پیام کو ساری دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔

فقر و احتیاج انسان کی فطرت میں شامل ہے، اسی فقر یا احتیاج کو رفع کرنے کے لیے وہ ہر نفع و ضرر پہنچانے والی چیز کو اپنا "الٰہ" قرار دیتا ہے، خواہ یہ چیز عناصر سے ہو یا جمادات سے،

بلے معنی محاجاتی

نباتات سے ہو یا حیوانات سے، فوق الفطرت ہو یا فوق البشر ان سے رفعِ احتیاج کے لیے اعانت طلب کرتا ہے، اور استعانت کے لیے ان سے ذل و افتقار کی نسبت قائم کرتا ہے، اپنے جہل اور نادانی کی وجہ سے ان کو مستقل طور پر نافع اور ضار خیال کرتا ہے، اور یہی خیال اس کو اپنے سے کم تر مخلوق کے آگے سجدہ ریز ہونے پر مجبور کرتا ہے۔

حواس کے اس التباس اور عقل کے اس دھوکے کو دور کرنے کے لیے دینِ حق کا پیام محمد عربی (فداہ ابی و امی) نے عالم کو سنایا کہ انسان اشرف المخلوقات ہو کر، فطرت کا شہکار ہو کر اپنے سے ادنیٰ اور کمتر مخلوق کے آگے ذلیل نہیں ہو سکتا۔ اس کی گردن اگر جھک سکتی ہے تو اسی ایک ہمہ خیر، ہمہ داں و ہمہ بیں و ہمہ تواں ہستی کے آگے جس کے دستِ قدرت میں ساری کائنات کی باگ ہے، جو جملہ صفاتِ کمالیہ سے متصف ہے، اور تمام عیوب سے منزہ اور مبرا ہے! یہی ہستی ہماری الٰہ ہے، یہی قابلِ عبادت ہے، یہی مستحقِ استعانت ہے، یہی ہماری خالق ہے، مالک ہے، ہمارا رب ہے، مولیٰ ہے، حاکم ہے، اسی کے ہم مخلوق ہیں، مملوک ہیں، مربوب ہیں، عبد ہیں، محکوم ہیں، اسی کی ہم عبادت کرتے ہیں، اور اسی سے تمام حاجات و مرادات میں بھیک مانگتے ہیں، یہی ذات غنی ہے اور ہم سب اسی کے فقیر ہیں، اس کے فقیر ہو کر ہم سارے عالم سے غنی ہیں:

یہ پیام صدقِ محض ہے، ہماری عزتِ نفس کے عین مطابق ہے، حق و خلق کے رابطہ کا سچا اظہار ہے! اس کو مان کر انسان حقیقی معنی میں انسان بنتا ہے، بے خوف، بے جگر مجاہد جس کی امید و بیم کا مرکز وہی ایک اللہ ہوتا ہے، جو سارے عالم کا مالک اور حاکم ہے اب مجاہد کی زندگی کی ہر جنبش اسی مالک و حاکم کے حکم کے تحت ہو جاتی ہے، اور اس کے احکام کی تعمیل میں، امر کے امتثال میں وہ ایک جان دیتا ہے، تو ہزار جان پاتا ہے۔ اس کا ضعف قوت سے، اس کی ذلت عزت سے، اس کا فقر غنا سے بدل جاتا ہے۔ موجوداتِ عالم میں سے وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ[1] کا حکم اس کو سارے عالم سے

[1] اگر تم مومن ہو تو ان سے خوف نہ کرو مجھ سے خوف کرو۔

Marfat.com

بے خوف کر دیتا ہے، نہ وہ کسی سے اُمید و رجا رکھتا ہے، اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ[1] اُس کو ساری کائنات سے غنی کر دیتا ہے، ذواتِ خلق سے اُمید و بیم کی نسبت کٹتے ہی وہ نفسِ مطمئنہ حاصل کرلیتا ہے، اور اپنے رب سے راضی ہو جاتا ہے، اللہ کو راضی رکھ کر وہ غیراللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے، اب وہ غنی عن الشئ ہے، کونسی چیز اللہ سے برتر ہو سکتی ہے، جس کے حصول کی وہ خواہش کرے، اب سب کچھ اسے حاصل ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ[2]۔ علوئے تمکین اسی کو حاصل ہے، وہی مخاطب ہے اس قول کا: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰہُ مَعَکُمْ[3]؛

دیکھو "الٰہ" کے فہم نے اس کو کیا سے کیا کر دیا، یا تو وہ ایک حقیر اور ذلیل جانور کی طرح ہر ایک سے ڈرتا اور لرزتا تھا، ہر ایک کو نافع و ضار قرار دیتا تھا، سرِ عبودیت خم کرتا تھا، مدد و اعانت کا خواہاں تھا، ان ہی کی عبادت و عبودیت میں زندگی گزار رہا تھا، مشوش، پریشان، حیران، خود ضعیف اور مطلوب بھی ضعیف "ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ" یا اب علمِ رسالت کے جاننے اور ماننے کے ساتھ ہی لا کی شمشیر ہاتھ میں لے کر وہ آگے بڑھتا ہے اور اپنے جاہل ساتھیوں سے قرآن کے الفاظ میں پوچھتا ہے:

اَفَغَیْرَ اللّٰہِ تَاْمُرُوْنِّیْٓ اَعْبُدُ اَیُّھَا الْجٰھِلُوْنَ[4]؛

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی   بگزر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

غیراللہ کی عبادت و عبودیت کا جُوا وہ گردن سے نکال کر پھینک دیتا ہے، عمر میں پہلی مرتبہ حُرّیت محسوس کرتا ہے، خوف کا بھاری پتھر اس کے سینے سے اُٹھ جاتا ہے، اپنے حقیقی مولیٰ کے آگے جھک جاتا ہے، اور ان کو رحیم پاتا ہے، کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا کی بشارت

---

[1] کیا اللہ بندے کے لیے کافی نہیں۔
[2] تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ نہ آیا، اور نہ شیخی کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا ہے۔
[3] تم ہی بلند ہو اللہ تمہارے ساتھ ہے۔
[4] اے جاہلو کیا تم مجھے غیراللہ کی عبادت کرنے کا امر کرتے ہو۔

Marfat.com

اس کو ہر طرح مطمئن کر دیتی ہے، اب اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ اس کے ساتھ ایمان کے بعد شانِ رحمت ہی سے پیش آئینگے، ان کے علاوہ رحیم ہونے کے حاکم و حکیم ہونا، اس کے دل کو اور قوی کر دیتا ہے، وہ انہیں اپنے ہر امر میں متصرف سمجھتا ہے اور ان کے ہر فعل کو سراسر حکمت سے مملو دیکھتا ہے، ان ہی کے حکم کے مطابق ان کو اپنے کاموں میں وکیل بناتا ہے فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا ان کا فرمان ہے كَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيلًا کہہ کر وہ آزادی و اطمینان کے ساتھ معروفِ عمل ہو جاتا ہے، اب کہاں یہ اور کہاں وہ جاہل جو غیر اللہ سے ذل و انتقار کی نسبت جوڑ رہا ہے۔ سچ ہے:

وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمٰى وَالْبَصِيرُ وَلَا الظُّلُمٰتُ وَلَا النُّورُ وَلَا الظِّلُّ وَلَا الْحَرُورُ وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ[1] (الفاطر ۱۵)

دین کا اجمال، عبادت و استعانت، اس کا ماحصل تحفظ توحید۔ اب اس اجمال کی کسی قدر تفصیل ضروری ہے۔

عبادت غایتِ تذلل کا نام ہے جس کا اظہار معبودِ حقیقی کے آگے کیا جاتا ہے۔ اس کے معروف طریقے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں، نماز کے تمام اعمال و ارکان پر غور کرو۔ عبادت یا اظہارِ ذلت کا مفہوم بخوبی تمہارے دل نشین ہوگا، عابد نماز کا قصد کر رہا ہے مصلے کی طرف بڑھ رہا ہے، زبان پر ہے۔ اِنِّي ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّي سَيَهْدِيْنِ[2]۔ دل غیر حق سے پاک ہی حق تعالیٰ کے سوا کسی کو بزرگی کا مستحق نہیں سمجھتا، اور اسی فہم کے ساتھ تکبیر تحریمہ "اللہ اکبر" کہتا ہے اور جب حق تعالیٰ کے روبرو ہو کر کہتا ہے اِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيفًا وَمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔ دل پوری طرح متوجہ بحق ہے، ورنہ جانتا ہے کہ جھوٹ کی سزا کیا ہے يُخَادِعُونَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ[3]۔ اب نیت میں بھی خلوص ہے حق تعالیٰ

---

[1] برابر نہیں اندھا اور دیکھتا اور نہ اندھیرا اور اُجالا اور نہ سایہ اور لو، اور برابر نہیں جیتے اور نہ مردے

[2] میں اپنے رب کی طرف چلا ہوں وہ میری ہدایت کریگا۔

[3] دغا بازی کرتے ہیں اللہ سے اور وہی ان کو دغا دیگا۔

Marfat.com

ہی کے لیے نماز پڑھ رہا ہے، عاشقانہ ایمان کے پیدا ہونے کے لیے پڑھ رہا ہے، عادت کے تحت نہیں، انہی کے حول وقوت سے پڑھ رہا ہے، ثنا میں حق تعالیٰ کی عظمت وجلالت وجبروت کا اظہار کر رہا ہے، اور توحید کا اقرار لَا اِلٰہَ غَیْرُکَ سے ہو رہا ہے، اب حضوری میں دست بستہ نظر نیچی کیے ذلت ومسکنت کی تصویر بنا کھڑا ہے، زبان پر جاری ہے الحمد للہ اور دل میں سمجھ رہا ہے کہ عالم میں کوئی ذات مستحق حمد نہیں، سارے محامد ومحاسن کی وہی ایک ذات لاشریک لہ سزاوار ہے، جب رَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہتا ہے تو جانتا ہے کہ سارے رب ما سواہ، ربوبیت اسی کو زیبا ہے، عالم تمام اُس کا مربوب ہے۔ الرحمٰن الرحیم کہتے وقت عالم رجا میں داخل ہوتا ہے، رحمت وکرم کی اُمید دل میں پیدا ہوتی ہے، جانتا ہے کہ رحمانیت کا تعلق تو ساری کائنات سے ہے، رحیمیت خصوصی شے ہے، اور مومنین سے مختص کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا، مَالِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہتے وقت عالم خوف کا مشاہدہ کرتا ہے، روز قیامت حق ہے، اور یہ وہ دن ہے کہ اس کی شان میں فرمایا گیا یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَیْئًا[1] اس امید و بیم کی حالت میں عرض کرتا ہے کہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ حق تعالیٰ ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں، ذل وافتقار کا رشتہ آپ ہی سے جوڑتے ہیں، وایاک نستعین آپ ہی سے استعانت کرتے ہیں، جانتے ہیں کہ لَا فَاعِلَ فِی الْوُجُوْدِ اِلَّا اللہ ماسوی اللہ سے بالکلیہ اعراض کرکے آپ ہی کی طرف بالکلیہ رجوع ہوتے ہیں، ہم آپ کے سوا استعانت کی جہت سے غیر کو کیوں پکاریں جب کہ ہمیں یہ سنا دیا گیا ہے اور ہم نے بھی تجربہ سے اس کی توثیق کرلی ہے کہ آپ کے سوا کسی میں حول وقوت نہیں لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ اس لیے کہ وہ نہ ہمیں نفع پہنچا سکتے ہیں، نہ ضرر، اس مدح و ثنا و اقرار عبودیت کے بعد التماس ودعا اھدنا الصراط المستقیم حق تعالیٰ راہ مستقیم کی ہدایت فرمائے، نفس وہوی سے چھوٹیں، آپ کا قرب نصیب ہو، صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ۔ اہل ایمان کی راہ پر چلنا نصیب ہو جو انبیاء و

---

[1] جس دن نہ کرسکے کوئی نفس کسی نفس کا کچھ۔

Marfat.com

اولیاء کی راہ ہے، یہی اہلِ انعام ہیں والَّذِینَ اَنعَمَ اللّٰہُ عَلَیھِم مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیقِینَ وَالشُّھَدَاءِ وَالصَّالِحِینَ۔ مغضوبین وضالین کی راہ نہیں جنہوں نے غیر اللہ سے عبادت واستعانت کا رشتہ قائم کر کے ہمیشہ کے خسارہ میں اپنے کو مبتلا کر لیا۔ اُولٰئِکَ ھُمُ الخَاسِرُونَ الَّذِینَ خَسِرُوا اَنفُسَھُم!

اس حمد وثنا، التماس ودعا، کے ساتھ وہ کلامِ ربانی کی چند اور آیتیں احکامِ خداوندی کے معلوم کرنے، تکرار سے ان کو اپنے ذہن میں جمانے، ہر حرف کی تلاوت پر دس نیکیاں کمانے اور حق تعالیٰ سے سرگوشی کرنے کے لیے پڑھتا ہے، اور پھر فوراً پیشی میں جھک جاتا ہے، گویا اپنے رحمان ورحیم آقا کے پیٹ میں مونڈی دے دیتا ہے، اس طرح اپنی ذلت کا مزید اظہار کرتا ہے، اسی حالت میں اس کی زبان سے اس کے مولیٰ کی تقدیس وتنزیہ وتحمید جاری ہوتی ہے اپنی بے مائگی، فقر وذلت کا احساس قلب میں واضح طور پر موجود ہوتا ہے، جب سر اٹھاتا ہے تو حق تعالیٰ اسی کی زبان سے فرماتے ہیں سَمِعَ اللّٰہُ لِمَن حَمِدَہٗ اس طرح اس کا مرتبہ بلند کرتے ہیں۔ جو سر معبودِ حقیقی کے آگے جھکتا ہے، وہ مخلوق کے آگے جھک نہیں سکتا، وہ سب سے بلند ہوتا ہے، ممتاز ہوتا ہے، بے نیاز ہوتا ہے، وہ ایک لاقیمت جوہر ہوتا ہے، یہی ہے۔ من رکن الی المولیٰ ومال الیہ احرقہ اللہ بنورہ حتی یصیرہ جوھرا لاقیمۃ لہ[1] (حدیث)

اس سرفرازی کے شکریہ میں وہ حق تعالیٰ کی حمد کرتا ہے، اور پیروں پر گر جاتا ہے، پیر پکڑ لیتا ہے اور اس طرح غایتِ تذلل کا اظہار کرتا ہے، زبان پر آقا کی عظمت ورفعت وعلو کا اقرار جاری ہوتا ہے! اس اظہارِ تذلل میں وہ اپنی آنکھ کی ٹھنڈک پاتا ہے وجعلت قرۃ عینی فی الصلوٰۃ[2] یہ آنکھ کی ٹھنڈک اس کو اپنے محبوب مولیٰ کے مشاہدہ سے ہو رہی ہے، یہی اس کا کمال ہے، یہی اس کی معراج ہے۔ الصلوٰۃ معراج المؤمنین۔

---

[1] جو اپنے مولیٰ کی طرف جھکتا ہے، اور اس کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ اس کو اپنے نور سے جلا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ لاقیمت جوہر ہو جاتا ہے۔

[2] میری آنکھ کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔ (نسائی باب عشرۃ النساء)

Marfat.com

معبود کا نہ صرف خیرِ محض ہونا ضروری ہے، بلکہ اس کا ہمہ تواں یا قادرِ مطلق ہونا بھی لازمی ہے، یہ اپنی لامحدود قوت اور لامتناہی طاقت کی وجہ سے ہماری حفاظت کرتا ہے، ہماری حاجتوں کو پورا کرتا ہے، مرادوں کو برلاتا ہے، اس کے اعتصام کے بعد ہی اس کی نصرت واعانت کا قطعی یقین ہو جاتا ہے، شر کے مسئلہ کی توجیہ سے عاجز ہو کر نتائجیت[1] (Pragmatists) نے خدا کے ہمہ تواں ہونے کا انکار کر دیا، لیکن جو خدا قادرِ مطلق نہ ہو، وہ معبودِ حقیقی کب قرار دیا جاسکتا ہے، جو خود شر پر غالب نہ ہو ہماری مدد کیسے کر سکتا ہے، ہمارا مولی اور نصیر کیسے ہو سکتا ہے۔ شر کی توجیہ کا یہ موقع نہیں، لیکن ہم اپنے معبود کو فعالِ مطلق، ہمہ تواں مانتے ہیں، افعال و آثار کا مرجع اسی کو قرار دیتے ہیں، حول و قوت کا اسی کو مبدء سمجھتے ہیں، اسی لیے اس سے استعانت چاہتے ہیں، اور اس کے "نعم المولی ونعم النصیر" ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔ اعتصموا باللہ ھو مولٰکم نعم المولٰی ونعم النصیر[2]!

جب قوت صرف اسی کو حاصل ہے لا قوۃ الا باللہ حرکت کا بھی وہی مبدء ہے لا حول ولا قوۃ الا باللہ تو فعل جو حرکت و قوت ہی کا نتیجہ ہے، صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے ثابت ہوتا ہے اور ذاتِ خلق سے اس کی بالکلیہ نفی ہو جاتی ہے۔ اس حقیقت کے سمجھتے ہی اس کی بصر و بصیرت سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے، اور وہ لا تتحرک ذرۃ الا باذن اللہ[3] کے معنی سمجھ جاتا ہے، غیر اللہ سے استعانت کی نسبت کاٹ کر اسلم عبدی واستسلم کا مصداق بن جاتا ہے!

اپنے رب سے استعانت کے طریقے کیا ہیں؟ بصیرتِ محمدیہ نے جن طریقوں کی تعلیم فرمائی ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں۔

اپنی حاجتوں اور مرادوں میں حق تعالیٰ سے دعا کرو۔ دعا کا حکم ہے، اور اجابت کا وعدہ

---

[1] زمانہ جدید کے فلسفیوں کا ایک گروہ جن میں ولیم جیمس، ایچ جی ویلس، برنارڈ شا وغیرہ داخل ہیں۔
[2] تمہیں اپنے مولیٰ کا اعتصام چاہیے، وہی تمہارا اچھا مولیٰ ہے، اور اچھا مددگار۔
[3] کوئی ذرہ بغیر اللہ کے حکم کے حرکت نہیں کرتا۔

ادعونی استجب لکم حق تعالیٰ جود محض ہیں، عطا محض ہیں، ان میں بخل کا شائبہ نہیں، مایوسی و محرومی ان کی درگاہ سے نہیں، تسلی کے لیے فرما رہے ہیں۔ لاتایئسوا من روح اللہ۔[1] وہ حکیم بھی ہیں، ان کا ہر فعل حکمت رکھتا ہے، وہ ہمارے خیر کو ہم سے بہتر جانتے ہیں، اگر وہ ہماری کسی دعا کو قبول نہیں فرما رہے ہیں تو اسے نہ قبول فرمانے ہی میں ہمارا فائدہ ہے، اسی لیے کہا گیا ہے منعہٗ عطائہٗ، مرد کا کمال اس میں ہے کہ ان کے منع کو عطا جانے، کسی عاشق نے اسی جذبہ کے تحت کہا ہے:

اگر مرادِ تو اے دوست نامرادی ماست   مرادِ خویش دگر بار من نخواہم خواست

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ فرمایا کرتے تھے لا ابالی علیٰ ای حال اصبح علی ما اکرہ او علیٰ ما احب لانی لا ادری الخیر فیہما۔[2] حق تعالیٰ خود ہمیں تعلیم فرما رہے ہیں، اور ایک نہایت دقیق نکتہ کی تعلیم فرما رہے ہیں:۔

عَسٰی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ[3] (البقرہ - ۱۰)

اسی نکتہ کو سمجھ کر عارف کہنے لگتا ہے "ہمہ آں باد کہ او خواہد آں مباد کہ ما خواہیم" اور خواجہ شبلی نے عارف کی تعریف ہی اس طرح کر دی کہ "عارف اوست کہ منع نزد او دوست تر از عطا باشد" یہیں سے رضا کا مقام شروع ہو جاتا ہے، جو استعانت کا بلند ترین طریقہ ہے۔

بہر حال اگر حق سبحانہ تعالیٰ کسی حکمت و مصلحت سے بندۂ مومن کی دعا قبول نہیں فرماتے تو اس کے قلب کی حفاظت فرما دیتے ہیں، مطلوب کی جانب سے خیال پلٹ دیتے ہیں

---

[1] اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔ [2] مجھے اس امر کی پروا نہیں کہ میں کس حال میں صبح کروں گا، ایسی حالت میں جس کو میں پسند نہیں کرتا یا ایسی حالت میں جس کو میں پسند کرتا ہوں، کیونکہ میں نہیں جانتا کہ میرے لیے بھلائی کس حالت میں ہے۔

[3] شاید کہ بری لگے تم کو ایک چیز اور وہ بہتر ہو تمہارے حق میں، اور شاید تم کو بھلی لگے ایک چیز، اور وہ بری ہو تمہارے حق میں، اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

Marfat.com

حکایت شکایت، جزع فزع کی طرف مائل نہیں کرتے، رضا کے مقام میں پہنچا دیتے ہیں، اور وہ "لکل اجل کتاب" کہہ کر حق تعالیٰ سے راضی ہو جاتا ہے، اجابتِ دعا کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مطلوب تو حاصل نہیں ہوتا، لیکن حق تعالیٰ اس کی دعا کو رد نہیں فرماتے بلکہ اس کی کسی بلا کو دور کر دیتے ہیں، گو اس کو بدل کا علم نہیں ہوتا۔ ایک آخری صورت یہ بھی ہے کہ مدعا اگر وہ دنیا میں نہیں پاتا تو آخرت کے لیے یہ ذخیرہ کیا جاتا ہے

اِنَّ العبدَ یریٰ فی صحائفہ یومَ	قیامت کے دن بندہ اپنے اعمال نامہ پر وہ نیکیاں
القیامۃ حسنات لا یعرفہا فیقال	دیکھیگا، جن کو وہ نہیں پہچانیگا۔ اس سے کہا جائیگا کہ یہ
انہا بدل سوالك فی الدنیا	اس سوال کا بدل ہیں جو تو نے دنیا میں کیا تھا۔
لم یقدر قضائہ فیہا (حدیث)	لیکن تیرے مقدر میں دنیا میں ان کا ملنا نہ تھا۔

بہرصورت اجابتِ دعا کا وعدہ سچا ہے، لیکن یہ وعدہ مطلق ہے، مقید نہیں کہ اسی وقت اور اسی صورت میں پورا کر دیا جائے، جس وقت اور جس صورت میں کہ بندے نے دعا مانگی ہے، فافہم۔ اگر آپ اس نکتہ کو سمجھ جائیں تو پھر آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ کیوں رسولِ عربی نے اس کی تعلیم فرمائی تھی۔

اللھم اکفنی کل مھم من حیث شئت وکیف شئت وانی شئت ومن این شئت

استعانت کا دوسرا طریقہ اپنے کاموں میں حق تعالیٰ پر توکل کرنا ہے، اگر ہمیں اس بات کا یقین ہو، محض علم نہیں، یعنی تحقیق ہو، محض تعقل نہیں، یا جدید نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ اگر یہ بات ہمارے تحت شعوری نفس میں اتر گئی ہو، کہ فاعلِ حقیقی حق تعالیٰ ہیں، کرنے والے خود بدولت ہیں، افعال وآثار کا مرجع خود ہیں، حول وقوۃ کا مبدا خود ہیں، اور پھر اس کا بھی تیقن ہو کہ ایمان کے بعد وہ رحیم بھی ہیں۔ کان بالمومنین رحیما۔ ولی ہیں، واللہ ولیّ المومنین۔ تو ہم اپنے تمام امور ان کو تفویض کرنے میں خوشی سے آمادہ ہو جائیں گے، اور اس تفویض کے ساتھ ہی فکر سے آزاد ہو جائینگے، طمانیت ومسرت سے ہمارے

Marfat.com

قلوب بھر جائینگے، اور کسی مست محبت کے الفاظ میں کہہ اُٹھینگے۔

وکلت الی المحبوب امری کلّہ ـــــ فان شاء احیانی وان شاء اتلفا[1]

توکل اپنی حول و قوۃ سے بری ہونا ہے، اعتصام باللہ ہے۔ ذوالنون نے توکل کی تعریف اسی طرح کی ہے: التوکل ترک تدبیر النفس والانخلاع من الحول والقوۃ[2]، اور سری سقطیؒ نے بھی ان کے ساتھ اتفاق کیا ہے التوکل الانخلاع عن الحول والقوۃ، ان تعریفوں کا ماخذ حدیث نبوی: لاحول ولا قوۃ الا باللہ اور قول عزوجل لا قوۃ الا باللہ توکل قلبی عمل ہے، یعنی قلب میں یقین جاگزیں ہو کہ مجھ میں اور کسی شے میں نہ اثر ہے نہ قوت ہے، نہ حرکت ہے، مجھ میں اور ہر شے میں اثر و قوت و حرکت حق تعالیٰ ہی پیدا کرتے ہیں، وہ جس طرح میرے خالق ہیں میرے اعمال کے بھی خالق ہیں، خَلَقَکُمْ وَ مَا تَعْمَلُوْنَ۔ میرے اقتضاءِ فطرت کے عین مطابق افعال کی تخلیق فرما رہے ہیں، میرا اقتضا، میرا اختیار ہے، لیکن فعل کی تخلیق حق تعالیٰ کی جانب سے ہو رہی ہے۔ اس لیے اسبابِ قطعیہ کے استعمال و اختیار کا مجھے حکم ہے، حکم کے تحت میں ان کو استعمال کر رہا ہوں جانتا ہوں کہ اگر مجھے اولاد کی خواہش ہو تو جماع کو ترک نہیں کر سکتا، بھوک کی تشفی کے لیے نوالہ کا اُٹھانا اور اس کا چبانا اور حلق سے نیچے اُتارنا قطعی ضروری ہے، توکل یہاں ترکِ عمل و تعطل کا نام نہیں، علم و حالت کا نام ہے، قلبی کیفیت کا نام ہے، اس یقین کا نام ہے کہ ہاتھ میں قدرت، حرکت، فعل سب حق تعالیٰ ہی کے حکم سے پیدا ہوئے ہیں، ان کی مشیت اور ارادے سے پیدا ہوئے ہیں، وہ چاہیں تو نوالہ مُنہ تک نہ پہنچے، ہاتھ شل ہو جائے، کھانا بھی چھن جائے، نظر ان کے فعل پہ ہے، فضل پہ ہے۔ اپنے زور بازو پر نہیں، کسب پر نہیں، دست بکار دل بیار! توکل ترکِ اسباب نہیں، ترک رویت اسباب ہے[3]

---

[1] میں نے اپنا کام اپنے محبوب کے حوالے کیا، خواہ اب وہ مجھے زندہ رکھے یا مار ڈالے۔
[2] توکل اپنے نفس کی تدبیر کو چھوڑنا اور اپنی حول و قوت سے نکل آنا ہے۔ [3] حضرت شاہ میر قبلہؒ

مبادیات کو سمجھ جانے کے بعد رزق کے مسئلہ پر ذرا غور کرو۔ رزق کا ذمہ حق تعالیٰ نے لیا ہے۔ وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا[1] صرف ذمہ داری پر اکتفا نہیں کیا، قسم بھی کھائی ہے، صرف قسم پر اکتفا نہیں کیا، مثال بھی بیان کی ہے۔ وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ، فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ[2] (پارہ ۲۶ رکوع ۱۱) حق تعالیٰ ان لوگوں کو بھی رزق دیتے ہیں، جو غفلت و معصیت میں مبتلا ہیں، فسق و فجور میں چور ہیں، پھر جو ان کی اطاعت و رعایت کرتے ہوں، وہ کیسے محروم ہو سکتے ہیں۔ دیکھو جو درخت بوتا ہے وہی سینچتا بھی ہے! خلقت کو وہی مدد دیتا ہے، جو ان کا خالق ہے، مخلوق کے لیے یہ بات کافی ہے کہ ان کا خالق ان کو کافی ہے أَلَيْسَ اللَّهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ۔ ایجاد ان سے ہے، دوامِ امداد بھی ان ہی سے ہے، تخلیق ان سے ہوئی، رزق کا دینا بھی ان کے ذمہ ہے، اس کی مثال انسان اپنے نفس میں پاتا ہے، یہ جب کسی کو گھر پر دعوت دیتا ہے تو ان کے لیے غذا کا بھی انتظام کرتا ہے، حق تعالیٰ نے جب ہمیں اپنی مشیت ارادے سے پیدا کیا ہے تو رزق کی ذمہ داری بھی انہی پر ہے، ان ہی کے خوانِ کرم سے ہمیں برگ و نوا حاصل ہے، حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں، ہم ان کے عبد ہیں، غلام ہیں، اب آقا پر غلام کا تفقد ضروری ہے جس طرح کہ غلام پر آقا کی اطاعت واجب ہے، اگر ہم ان کے ہو رہیں، ان کے سوا نہ کسی کی عبادت کریں نہ کسی سے حاجت و مراد برآری چاہیں تو کیا یہ ممکن ہے وہ اپنا حق ادا نہ کریں[3]؟ اس کی بشارت اس آیۂ کریمہ میں دے رہے ہیں:۔

مَن يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا — جو تقویٰ اختیار کرتا ہے اللہ اس کے لیے راستہ

يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ — نکالتے ہیں اور ایسی جگہ سے رزق فراہم کرتے ہیں جہاں

---

[1] اور زمین پر کوئی ایسا چوپایہ نہیں جس کے رزق کا ذمہ اللہ پر نہیں۔ [2] اور آسمان میں ہے روزی تمہاری اور جو تم سے وعدہ کیا گیا، سو قسم ہے آسمان و زمین کے رب کی کہ یہ بات تحقیقی ہے جیسے کہ تم بولتے ہو۔
[3] مثالیں ابوالعطا اسکندری رحمۃ اللہ علیہ کی ہیں۔

Marfat.com

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۔ کسی کا شان و گمان بھی نہیں ہوتا، جو اللہ پر توکل کرتا ہے، اللہ اس کے لیے کافی ہے۔

رزق کا وعدہ قطعی، صرف ہمیں اپنا حقِ عبادت و عبودیت ادا کرنا ہے، پھر نا ممکن ہے کہ وہ ہمیں اپنے گھر بلائیں اور پھر ہمیں اپنے احسانات سے محروم رکھیں، وجود بخشی کریں اور پھر مدد نہ کریں، ہست کریں اور اپنے کرم سے محروم رکھیں، اپنا حق (عبادت) ہم سے طلب کریں اور ہمارا (حق) رزق ہمیں نہ دیں؛ وہ کریم ہیں ان سے معاملہ کرکے ان کی خدمت ادا کرکے کون خسارہ میں رہتا ہے

من ذا الذی سألك فحرمته ولجأ الیك فاهملته او تقرب الیك فابعدته او هرب الیك فطردته[1] (از اسبوع حضرت غوث اعظمؒ)

اسی خیال کے تحت کسی عاشق نے کہا ہے "گمان توانیست کہ از رزق چارہ نیست امارزق راز تو چارہ نیست" ؎

بدنبالِ روزی چہ باید دوید تو بنشیں کہ روزی خود آید پدید

ایک دوسرے عاشق نے اسی خیال کو یوں ادا کیا ہے:

ہیں توکل کن ملرزاں پاودست رزقِ تو بر تو زتو عاشق ترست

بہر حال اتباعِ نبوت اسی میں ہے کہ رزق کی طلب میں کوشش کریں لیکن اجملوا فی الطلب[2] کو پیش نظر رکھ کر اور یاد رکھیں کہ ہماری طلب رزق کے حصول کا مستقل سبب یا قطعی علت نہیں، شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ شارح فتوح الغیب نے مسئلہ کو اجمالاً خوب ادا کیا ہے "بعد از طلب می یابی آمانہ بطلب می یابی" یہی مفہوم اس شعر میں ادا ہوا ہے:-

بجستجوئے نیابد کسے مراد دلی کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد

---

[1] وہ کون ہے جس نے تجھ سے سوال کیا، اور تو نے اس کو محروم رکھا، یا تجھ سے ملتجی ہوا اور تو نے اس کو بیکار چھوڑا، یا تجھ سے ملاپ چاہا اور تو نے اس کو دور کر دیا، تیری طرف دوڑ کر آیا، اور تو نے اس کو دھتکار دیا۔

[2] یعنی دنیا کمانے میں دل توڑ کر کوشش نہ کرو۔

۲۰-۲۵
(۱)

Marfat.com

شعر کا مطلب یہ ہے کہ جستجو کو مراد یابی کی مستقل علت قرار نہ دینا چاہیے کیونکہ معاملہ فضل پر منحصر ہے، ہاں جستجو ضرور کی جائے، عادت الٰہی یہی ہے کہ حرکت میں برکت دیتے ہیں۔

استعانت کا تیسرا طریقہ مصیبتوں میں صبر کرنا ہے۔ دنیا دار الحزن ہے، دار المحن ہے، "سجن" یا قید خانہ غم کی وادی ہے، شیطان کی دکان[1] ہے۔ جس میں سوا شر و فساد کے کچھ نہیں،

اُفٍ للدنیا وایامها　　فانها للحزن مخلوقه

همومها لا تنقضی ساعة　　عن ملكٍ فیها او سوقه[2]

درویش ہو کہ شاہ، امیر ہو کہ گدا سب غم و ہم میں مبتلا ہیں ہدف بلا ہیں، لقد خلقنا الانسان فی کبد[3]۔ چونکہ حق تعالیٰ ہی ہماری غم سے آزمائش کرتے ہیں مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، رلاتے ہیں اور ہنساتے ہیں وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى۔ مارتے اور جلاتے ہیں وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيٰى۔ اور غنی کرتے اور فقیر کرتے ہیں وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى۔ اس لیے حق تعالیٰ ہی ہمیں مصائب سے بچنے کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں، اور وہ طریقہ صبر ہے، کیا حکیمانہ ارشاد ہے۔

یا ایها الذین اٰمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا الله لعلکم تفلحون

ایمان والو موجودہ مصائب پر صبر کرو، دوسروں کے ساتھ صبر و استقلال سے کام لو (صابروا) اور ایسے کاموں میں ثابت قدم رہو جس کا وقت ابھی نہیں آیا (رابطوا) اور اللہ سے ڈرو اسی میں تمہاری فلاح و بہبودی ہے، یہی نجاح کا راستہ ہے، صرف صبر اور حق تعالیٰ ہی کے حکم پر اصبر لحکم ربك اور حق تعالیٰ ہی کے لیے وما صبرك الا بالله ہاں صرف صبر کرنے سے مصائب کی برداشت سہل ہو جاتی ہے، غم کے بادل چھٹ جاتے ہیں، فکر کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے، اسباب کی راہ سے اگر انسان مصائب کو دور کرنا چاہے، غم سے گلوخلاصی حاصل کرنا چاہے اور راحت کی امید باندھے تو سوائے حسرت و یاس کے کچھ نہیں ملتا ہو لانا

---

[1] قول یحییٰ بن معاذ۔　[2] دنیا اور ایام دنیا پر افسوس ہو کہ وہ حزن و غم کے لیے بنائی گئی ہے، اس کے غم ایک گھڑی کے لیے ختم نہیں ہوتے، خواہ بادشاہ کے لیے ہوں یا بازاری آدمی کے لیے۔

[3] ہم نے انسان کو سختی میں پیدا کیا۔ (الآیہ)

Marfat.com

رومؒ نے اسی چیز کو کس خوبی سے ادا فرمایا ہے۔

گر گریزی با اُمید راحتے ہم از آنجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

حق تعالیٰ سے اگر محبت ہو، اور مصیبت کو ان ہی کی طرف سے دیکھے، تو مصائب کا آسان ہونا ضروری ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ تم ایک تاریک کمرے میں ہو، کوئی چیز تمہیں آ لگی، اور تم تڑپ اُٹھے، تمہیں معلوم نہیں کہ مارنے والا کون ہے، جب تم نے چراغ منگوایا اور دیکھا کہ یہ تو تمہارا شیخ ہے، یا باپ ہے، یا کوئی عزیز، محبوب ہستی ہے جس سے تم کسی صورت میں آزار کی توقع نہیں کر سکتے تو تمہارا یہ جاننا بیشک تمہاری تسلی اور صبر کا باعث ہوگا۔ کیونکہ تم اس تکلیف میں بھی دقائقِ لطف کا معائنہ کروگے[1] اسی طرح وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ میں حق تعالیٰ اپنے بندۂ خاص سے بطریقِ منت فرمارہے ہیں کہ اپنے پروردگار کی رضا و خوشنودی کے لیے اس کے حکم و بلا پر صبر کر، کیونکہ ایمان کی حلاوت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ تیرِ بلا کا ہدف نہ بنے ؏

من ساختہ جاں را ہدفِ تیرِ بلا ئیت!

اگر تم کو حق تعالیٰ کے بیحد مہربان، رحیم، اور ودود ہونے کا یقین ہو جائے اِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ پر ایمان ہو كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا پر اذعان ہو، اور وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ پر ایقان قائم ہو جائے، تو پھر تم اپنے دُکھ درد کو پوشیدہ رحمت سمجھوگے۔ مثالوں سے اس نکتہ کو سمجھو، مشفق باپ اپنے بچے کو چھپنے لگاتا ہے لیکن دکھ پہنچانا مقصود نہیں ہوتا، فاسد خون جو اس کے بدن میں زہر ہے آسان طریقہ سے نکال رہا ہے، ماں اپنے چھوٹے بچے کو غلیظ دیکھنا نہیں چاہتی، صابون اور گرم پانی سے اس کو نہلاتی اُس کے جسم کو رگڑتی اور مالش کرتی ہے، بچہ چیختا چلاتا ہے، دکھ محسوس کرتا ہے، لیکن ماں کا مقصد آزار پہنچانا نہیں ہوتا تمہارا

[1] یہ مثال ابوالعطا اسکندری نے دی ہے۔ بہ تغیر یسیر یہاں استعمال کی گئی۔

Marfat.com

خیرخواہ طبیب تمہیں ایارج دیتا ہے، اور تم اُسے ناپسند کرتے ہو، لیکن اگر وہ تمہارے اختیار کا اتباع کرے تو شفا تم سے کوسوں بھاگے، اگر تم کو کوئی ایسی چیز نہ دی جائے جس پر تمہارا دم نکل رہا ہو اور تمہیں یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ یہ نہ دینا عین شفقت و مہربانی کے باعث ہے تو تم کہو گے کہ یہ نہ دینا ہی میرے حق میں دینا ہے۔ شیخ ابوالحسن شاذلی نے کیا خوب فرمایا ہے:

جان لو کہ اگر حق تعالیٰ تم کو کوئی چیز نہیں عطا فرماتے تو ان کا نہ دینا ہی دینا ہے لیکن نہ دینے میں دینا وہی سمجھتا ہے جو صدیق ہے عَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّ یَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا کَثِیْرًا[1] میں اسی راز کی طرف اشارہ ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شدائد پر بھی اسی طرح شکر فرماتے جس طرح کہ نعمتوں پر الحمد للہ علیٰ ما یساء ویسّر[2]

صرف ایمان کی ضرورت ہے اور شدتِ حب کی، ہر مصیبت کے وقت حق تعالےٰ کی جو تجلی ہوتی ہے مومن کو اس تجلی میں ایسی حلاوت نصیب ہوتی ہے کہ وہ سختیِ غم کو آسانی سے جھیل لیتا ہے اور اکثر اوقات غلبۂ تجلی سے اس کو دکھ بھی نہیں محسوس ہوتا یہ بات اگر تمہاری سمجھ میں نہ آ رہی ہو تو زلیخا پر طعنہ کرنے والی حسین بیبیوں کے حال پر غور کرو۔ یوسف کے ہوش رُبا جمال سے وارفتہ ہو کر انہوں نے اپنا ہاتھ کاٹ لیا، اور خبر بھی نہ ہوئی کہ درد کیا چیز ہے۔ فَلَمَّا رَاَیْنَهٗٓ اَکْبَرْنَهٗ وَ قَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ[3]۔ زبانِ حال سے وہ کہہ رہی تھیں ؎

بسم اللہ اگر تابِ نظر است کسے را | این است کہ خوں خوردہ و دل بردہ بسے را

شاید یہی معنی ہیں عرفاء کے اس قول کے کہ "انسِ قرب سے ادراکِ الم مفقود ہو جاتا ہے۔

ایمان اور محبت میں پختہ ہونے کے بعد تم کو بیماریوں، بلاؤں، فاقوں میں وہ اسرار لطف و رحمت نظر آنے لگیں گے کہ تم کہہ اُٹھو گے کہ رسول اللہ نے سچ فرمایا حُفَّتِ الْجَنَّةُ

---

[1] شاید تم کسی چیز کو بُرا جانو اور اللہ تعالیٰ نے اس میں خیر کثیر رکھی ہو۔
[2] شکر ہے اللہ تعالیٰ کا اس چیز پر جو بُری معلوم ہو، اور جو خوش نظر آئے۔
[3] پھر جب دیکھا اس کو ششدر رہ گئیں اور کاٹ ڈالے اپنے ہاتھ۔

Marfat.com

بالمکارہ وحفت النار بالشہوات[1]۔ بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، ان سے ربط قائم کر لیتا ہے، اور سبھوں سے ٹوٹ جاتا ہے، خلق سے فانی ہو جاتا ہے، غم سے زیادہ مؤثر سیرت سازی کے لیے کوئی اور شے نہیں، غم ہی کے ذریعہ نفس کی خامیاں دور ہوتی ہیں، قلب کا تزکیہ ہو جاتا ہے، روح کا تجلیہ ہو جاتا ہے۔ بلا و غم کی وجہ سے اگر تم نے اپنے امراضِ قلبی کا معالجہ کر لیا، استقامت پیدا کر لی، تو یاد رکھو کہ غم نے تمہیں فوزِ عظیم کے حاصل کرنے میں مدد دی، اور ایسے غم پر ہزاروں خوشیاں قربان ہیں، وہ خوشیاں جن کی وجہ سے تم شہوتوں میں گرفتار تھے، ہوا و ہوس کے شکار تھے، ظلمتوں میں گھرے ہوئے تھے اور نور سے دور تھے! حق تعالیٰ سے تمہارا کوئی ربط نہ تھا، شیطان تمہارا قرین تھا، تم پر مسلط تھا، اور اس وعید کے تم مصداق تھے:۔

وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَهٗ شَیْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِیْنٌ[2]

بلا کے اسی فلسفہ سے واقف ہو کر حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ افضل عیش (بہترین زندگی) ہم نے صبر میں پائی، حضرت ابوبکر صدیقؓ بیمار ہوئے، لوگوں نے عیادت کی اور کہا کیا ہم طبیب کو بلائیں؟ فرمایا، طبیب نے مجھے دیکھ لیا۔ کہا کہ پھر کیا کہا؟ فرمایا کہ یہ کہا ہے کہ اِنِّیْ فَعَّالٌ لِّمَا اُرِیْدُ[3]، معروف کرخی فرمایا کرتے تھے لیس بصادق فی دعواہ من لم یتلذذ بضرب مولاہ جو اپنے مولا کی ضرب سے متلذذ نہیں ہوتا وہ سچا غلام نہیں، اپنے دعوائے عبودیت میں صادق نہیں، بعض عارفین کی جیب میں یہ لکھا رہتا تھا وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا[4] مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے اور محض اس خیال سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں، دیکھ رہے ہیں، جھومتے رقص کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت پر

---

[1] جنت تو ان باتوں سے گھری ہوئی ہے جو نفس کو ناگوار ہیں، اور دوزخ شہوتوں، خواہشوں سے گھری ہوئی ہے۔ [2] اور جو کوئی آنکھ چرائے رحمٰن کی یاد سے، ہم اس پر مقرر کر دیں ایک شیطان پھر وہی ہے اس کا ساتھی۔ [3] وہی کرتا ہوں جو میں چاہوں۔ [4] اور اپنے رب کے حکم پر صبر کر کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

Marfat.com

وجد فرمایا تھا اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ آپ کے پاؤں پر گر گئی تھیں، اس لیے سلف کے بعض بزرگ تعزیتِ مصائب یوں کیا کرتے تھے اصبر لحکم ربک اس کے ساتھ اس قول نبی صلعم کا سُنا دینا بھی مومن کی خاص تسلی کا باعث ہوگا:

اذا احب اللہ عبداً ابتلاہ	جب اللہ بندہ سے محبت کرتا ہے تو اس کو مصیبت
فان صبر اجتباہ وان رضی	میں مبتلا کرتا ہے۔ اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ اور
اصطفاہ۔	راضی رہے تو برگزیدہ بنالیتا ہے۔

اب ایک کلی نفسیاتی قانون پر غور کرو، انسان کے لیے مصیبتوں اور آفتوں کا برداشت کرنا اس وقت کسی قدر آسان اور سہل ہوتا ہے جب اس کو کسی اچھے بدل کی توقع ہوتی ہے۔ مثلاً اگر میں اپنے وطن سے دور، اہل وعیال سے مہجور کسی جگہ تمام دن محنت ومشقت میں گزار رہا ہوں، تو واقعی میرے لیے یہ ایک مصیبت ہے، لیکن میں اس کو مصیبت نہیں سمجھتا، کیونکہ مہینے کے ختم پر مجھے اس کا معاوضہ معقول تنخواہ کی صورت میں مل جاتا ہے، یہ میرے غموں کو بھلا دیتا ہے، میرے زخموں کے لیے مرہم کا کام دیتا ہے۔ اسی اصول کو پیشِ نظر رکھ کر ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو قرآنِ کریم میں اس شخص سے کی جا رہی ہیں جو مبتلائے مصیبت ہے اور صبر کر رہا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا و آخرت کی ساری بھلائیاں صبر ہی میں رکھی ہیں!

امام احمد رضی اللہ عنہ کی تحقیق ہے کہ قرآن میں صبر کا ذکر نوّے جگہ آیا ہے، ہم یہاں چند بشارتوں کا ذکر کرتے ہیں جو صابر کے حق میں آئی ہیں۔ اگر وہ ان کو پیشِ نظر رکھے ان پر یقین واذعان کے ساتھ تفکر کرے تو چیخ اُٹھے کہ "بلا از دوست عطا است واز عطا نالیدن خطا است!"

صبر سے ہم حق تعالیٰ کے محبوب بنتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ[1]۔ اور جو

---

[1] اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

حق تعالیٰ کا محبوب ہوا اس کو کس چیز سے حزن ہو سکتا ہے اور کس چیز سے خوف؟ صابر کو حق تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ[1]۔ اور یہ معیت سو کھی معیت نہیں جس کے ساتھ حق تعالیٰ ہوں وہ کیسے ذلیل ہو سکتا ہے، کیسے مقہور ہو سکتا ہے، خلق اس کا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ لاطاقۃ لمخلوق مع قدرۃ الخالق! صبر ہی سے امامت و پیشوائی نصیب ہوتی ہے وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا[2] خلق کی ہدایت کا منصب سپرد ہوتا ہے، صابر کے لیے اس کا صبر اعداء کے مکر و فریب کے مقابلہ میں ایک زبردست سپر ہے۔ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا[3]۔ بالآخر ان پر غالب ہونا اس کے لیے یقینی ہے فَاصْبِرْ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ[4]۔ اس کا اپنے مطلب پر فائز ہونا ضروری ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا! یعنی تیرے پروردگار نے جو وعدہ بنی اسرائیل کے ساتھ کیا تھا یعنی دشمنوں سے نجات اور ملک و حکومت کے عطا کرنے کا وعدہ صبر ہی کی وجہ سے ایفا ہوا، صابرین کے لیے غیر محدود اجر کا وعدہ ہے اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ سلیمان بن قاسم نے کہا ہے کہ ہر عمل کا ثواب معلوم ہے، مگر صبر کا اجر "بغیر حساب" ہونے کی وجہ سے نامعلوم و ناقابلِ علم! حق تعالیٰ نے صابروں کے لیے اپنی رحمت، ہدایت اور صلوٰۃ یکجا جمع کیے ہیں۔ اور یہ اکٹھے ان کے سوا کسی اور کو نہیں دیے وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ o اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ[5]۔

اگر درد گریز پا، سریع الزوال، فانی درد صبر کے ساتھ برداشت کر لیا جائے (اور

---

[1] اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ [2] اور کیے ہم نے ان میں سے پیشوا جو بتاتے تھے ہمارے حکم سے جب وہ صبر کرتے رہے۔ [3] اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کے مکر سے تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔

[4] پس صبر کرو کیونکہ متقین کا انجام نیک ہوتا ہے۔

[5] اور بشارت دو صابرین کو جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کے صلوات ہیں اور رحمت اور یہی ہدایت یافتہ ہیں۔

Marfat.com

اس کی برداشت ناممکن بھی نہیں کیونکہ ناقابلِ برداشت تکلیف کسی کو دی بھی نہیں جاتی، تو دیکھو اس کے معاوضہ میں کیا مل رہا ہے؟ کن چیزوں کا وعدہ ہو رہا ہے؟ اور کون وعدہ کر رہا ہے؟ کس کی زبانی وعدہ کیا جا رہا ہے؟ اگر تمہارے قلب میں ایمان کی شمع روشن ہے[1]، اگر وہ "غلاف" میں نہیں باندھ دیا گیا ہے، اوندھا نہیں ہو گیا ہے، اگر وہ ادراک کی قوت رکھتا ہے، اور ان حقائق کا ادراک کر رہا ہے تو کیا درد اس کے لیے ایک نعمتِ بے بہا نہیں، وہ اس سے متلذذ نہیں ہوگا، اس کا مشتاق نہ ہوگا، اور فرطِ اشتیاق میں یہ چیخ اس کی زبان سے نہیں نکلیگی۔

زہرِ غمِ دوست جز شکر نیست — این تیر نصیبِ ہر جگر نیست

بد کے دہد آں حبیب جانی — شیریں بود انچہ تلخ می دانی!

اب غور کرو اس حدیث کے مفہوم پر:۔

یتعاھد اللہ عبدہ بالبلاء کما یتعاھد الوالد الشفیق ولدہٗ۔

حق تعالیٰ اپنے بندے کی بلا کے ذریعہ خبر گیری کرتے ہیں اسی طرح جس طرح کہ مہربان باپ اپنے بچہ کی خبر گیری کرتا ہے

صحابۂ کرام کے یہی ادراکات تھے، اور ان ہی کی قوت سے انہوں نے اپنا سارا تن من دھن اسلام کی راہ میں قربان کر دیا تھا۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔

صبر کا ادب یہ ہے کہ زبان کو شکوہ شکایت سے روکا جائے، سوائے حق تعالیٰ کے اپنی مصیبت کا کسی سے گلہ نہ کیا جائے اِنَّمَآ اَشْکُوْا بَثِّیْ وَحُزْنِیْٓ اِلَی اللّٰہِ[2]

دردم نہاں بہ زطبیبانِ مدعی — باشد کہ از خزانۂ غیبم دوا کنند

---

[1] ابو سعید سے مرفوعاً روایت ہے، دل چار طرح کے ہوتے ہیں (۱) اجرد (برہنہ) اس میں چراغ سا جلتا ہے، یہ مومن کا دل ہے، (۲) غلف جس کو غلاف میں باندھ دیا گیا ہو، یہ کافر کا دل ہے (۳) منکوس (اوندھا) یہ خالص منافق کا دل ہے (۴) مصفح وہ دل جس میں ایمان و نفاق دونوں موجود ہیں، یعنی زبانی ایمان کا دعویٰ اور دل میں اس کا یقین نہیں۔

[2] میں تو کھولتا ہوں اپنا اضطراب و غم اللہ کے سامنے۔

Marfat.com

غور تو کرو کہ مخلوق سے شکوہ کرنے کے کیا معنی ہیں، یہی نہ کہ ایک رحیم کریم ذات کا ایک غیر رحیم و کریم سے شکوہ کیا جارہا ہے، ایسا شخص کبھی حق تعالیٰ کی اطاعت کی حلاوت اپنے دل میں نہ پائیگا، راسِ صبر یہ ہے کہ مصیبت کو چھپایا جائے، من کنوز البر کتمان المصائب وما صبر من بث۔[1] (حدیث انس مرفوعاً) لیکن مصیبت میں یا درد کی حالت میں زبان سے ہائے وائے نکل جائے تو یہ منافی صبر نہیں بشرطیکہ ان سے شکوہ شکایت مقصود نہ ہو اور محض استراحت منظور ہو، کیونکہ کراہنے سے توجہ درد کی طرف سے ہٹ کر اس میں ایک قسم کی کمی محسوس ہوتی ہے، اسی لیے "انین" (نالہ) کی دوسری قسم کے متعلق حکم ہے کہ لا یکرہ و لا یقدح فی الصبر۔ یعنی صبر کے منافی نہیں، اور پہلی قسم کو بروایتِ امام احمدؒ قادحِ صبر قرار دیا گیا ہے۔

بلا اور مصیبت کے وقت صبر کے معنی یہی ہیں کہ توافق بالقضا کیا جائے، گو فطری طور پر درد و حزن ہو رہا ہو اور ہو گا کیسے نہیں یہ تو اقتضائے بشریت ہے۔ انسانِ کامل، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم کے انتقال پر فرما رہے تھے انا بفراقك یا ابراهیم لمحزونون (تیرے فراق نے اے ابراہیم ہمیں محزون کر رکھا ہے) لیکن عقلی صدمہ نہ ہونا چاہیے یعنی اس مصیبت کے واقعہ کو بے محل اور قبل از وقت خیال نہ کیا جائے، اس کے ساتھ توافق کیا جائے، زبان پر ہو ؎

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود!

اور دل میں یہ خیال ہو ؎۔

جہاں دار داند جہاں داشتن

اب حکم کے تحت اسبابِ قطعیہ کا استعمال جائز ہے بلکہ ضروری ہے، اور انسان کی فطرت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ بغیر چارہ کار اختیار کرنے کے خاموش نہیں رہتی لیکن

---

[1] نیکی کا خزانہ مصائب کے چھپانے میں ہے جس نے اپنے مصائب کو ظاہر کردیا اس نے صبر نہیں کیا۔

Marfat.com

اسباب کے استعمال میں نظر اسباب پر نہ ہو مسبّب پر ہو تو اسباب میں اثر پیدا ہوتا ہے۔ علاج کا یہ طریقہ استعمال کیا جائے اس کے تمام اجزاء کو سمجھ کر ان کی پابندی کی جائے تو رفتہ رفتہ رضا کا مقام حاصل ہو جاتا ہے، جو راحتِ کبریٰ ہے، دنیا میں جنتِ عالیہ ہے۔

استعانت کا چوتھا طریقہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا ہے۔

انسان کی زندگی میں غم بھی ہے اور خوشی بھی، رنج بھی ہے اور راحت بھی، ظلمت بھی ہے اور نور بھی۔ قنوطیہ نے اپنی کوری عقل سے دنیا کے مبدء ہی کو شر قرار دیا، اور بالآخر ہمہ شیطنت (Pandiabolism) کے نظریے کے حامی بن گئے۔ ان کے تجربے میں یہ دنیا بدترین دنیا ثابت ہوئی۔ سوائے غم و حزن کے کوئی شے انہیں حقیقی نظر نہ آئی، اس کے برخلاف رجائیہ نے اس دنیا کو بہترین دنیا قرار دیا، غم و الم ان کی رائے میں محض منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہیں۔ تضاد سے لذت کی کیفیت میں اشتداد پیدا کرتے ہیں، حقیقی نہیں اعتباری ہیں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں غم بھی حقیقی ہے، اور خوشی بھی حقیقی، ان میں سے کسی ایک کو التباس قرار دینا خود کو دھوکے میں مبتلا کرنا ہے، حقیقت سے چشم پوشی کرنا ہے، اس کی تصدیق ہر شخص اپنے تجربے سے ہر روز کر رہا ہے، وہ نہ بلا کو قائم پاتا ہے نہ نعمت کو ہر دم دے سے گزر رہا ہے، خوشی کے احساس کا انکار کر سکتا ہے، نہ غم کے ادراک کا، بلا و نعمت کا پایا جانا ان کا محسوس ہونا ہے اور یہیں بارکلے[1] کی بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ موجود ہونا دراصل محسوس ہونا ہی ہے (ESSBIST PEROOHI) بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے اسماء جلالی بھی ہیں اور جمالی بھی اور یہ ہر وقت مصروفِ عمل ہیں، ایک لحظہ کے لیے معطل اور بیکار نہیں۔ خیر و شر، رنج و راحت، لذت و الم، نعمت و بلا انہی کی تجلیات کا نتیجہ ہیں اور حقیقی ہیں۔

---

[1] تصوریت کا بانی اٹھارویں صدی عیسوی کا ایک نہایت ذہین اور تیز فہم فلسفی ۱۶۸۵ء تا ۱۷۵۳ء مادہ کے وجود ہی سے انکار کیا۔ کائنات غیر مادی روحانی شے ہے اور محض نفوس یا ارواح کی جماعت پر مشتمل ہے۔

Marfat.com

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ بلا سے نجات چاہتا ہے، اور نعمت میں اضافہ، بصیرتِ محمدیہ نے دونوں کے لیے قلبی طریقے بتلائے ہیں، بلاؤں میں صبر اور نعمتوں میں شکر قلبِ انسانی میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا کردیتے ہیں، اس کو ایک طرف تو نالہ، فریاد، ماتم، سینہ کوبی، یاس و قنوط سے نجات دیتے ہیں، اور دوسری طرف کبر، عجب، فخر، غرور، تبختر سے چھڑاتے ہیں، ان سلبی و مضر جذبات سے نجات پاکر وہ قوت، ہمت اور عمل کا مخزن بن جاتا ہے اور اس کے لیے کائنات کی تسخیر آسان ہوجاتی ہے، اس کی توانائیاں رائیگاں نہیں جاتیں صحیح جانب لگ جاتی ہیں، اور وہ ایک نقطہ پر مرکوز ہوکر حیرت انگیز نتائج پیدا کرتی ہیں مصیبت میں صرف اتنی احتیاط ضروری ہے کہ ارادہ بالکل شکستہ نہ ہوجائے ہمت بالکل ٹوٹ نہ جائے۔ بلا کا بہادری سے مقابلہ کیا جائے، حواس بجا ہوں یہی چیز صبر سے حاصل ہوتی ہے، اور نعمت میں خطرہ اس بات کا لگا رہتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کو بھول نہ جائے، جو تمام حسنات و محامد کا منبع ہیں اور اس طرح اس منبع سے دور نہ ہوجائے اور ظلمتوں میں گرفتار نہ ہوجائے، شکر سے یہ خطرہ رفع ہوجاتا ہے، کیونکہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ نعمت کو حق تعالیٰ کی جانب سے دیکھا جائے، اپنی ذات یا خلق کی طرف اس کی نسبت نہ کی جائے، کیونکہ دراصل حق تعالیٰ ہی ضار ہیں اور نافع، نفع و ضرر انہی کے دستِ قدرت میں ہیں، گو حواس کی نگاہ کو یہی نظر آتا ہے، کہ نعمت خلق ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی ہے، لیکن چشم بصیرت جانتی ہے کہ یہ محض بمنزلہ اسباب و آلاتِ نعمت ہیں، قاسم، مجری و فاعل و مسبب حق تعالیٰ ہی ہیں، وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ جب انسان اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھ کر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو وہ اس کی نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں، یہ ان کا قطعی وعدہ ہے، کسی استثنا کی گنجائش نہیں۔ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ[1] اجابتِ دعا، رزق و غنا، توبہ و مغفرت کا الخصا

---

[1] اگر تم شکر کرو تو یقیناً ہم (نعمتوں میں) اضافہ کرتے ہیں۔

Marfat.com

اپنی مرضی پر رکھا ہے لیکن شکر کے عوض زیادتی نعمت کا حصول بلا تخلف ہے، اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ؛ مَن نزلت الیہ نعمۃٌ فلیشکرھا۔ جس کسی پر نعمت کا نزول ہو اس کو چاہیے کہ شکر ادا کرے ۔

سیدِ مرسلاں و مرسلِ راز | داد فرمان بشکر نعمت و ناز
گلِ نعمت برائے ہر کہ شگفت | شکرِ آں روز و شب بباید گفت

اس عظیم الشان صداقت کو جس پر نعمتوں کا بقا منحصر ہے افصح العرب والعجم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اور نفسیاتی طریقے سے ادا فرمایا ہے ۔

النعمۃُ وحشیۃٌ قیّدوھا بالشکر ۔ | نعمت ایک وحشی جانور ہے، شکر کی زنجیروں سے اس کو باندھ رکھو

خاتمِ ملکِ وحی و خاتمِ دیں | شکر فرمود بر نحیف و سمیں
باز نعمت چو ہست وحشی را | صید از قیدِ شکر کن اورا
چوں گذاری تو شکر نستیزد | ورشوی ناسپاس بگریزد

نفسیات کا یہ ایک مسلّمہ قانون ہے کہ انسان کو جب نعمت حاصل ہوتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے، لیکن چند روز بعد یہ نعمت اپنی مانوسیت کی وجہ سے اپنی قدر و قیمت کھو دیتی ہے، اب اس میں کوئی ندرت باقی نہیں رہتی، اس کے وجود سے اس کو کوئی خاص فرق اپنی زندگی میں محسوس نہیں ہوتا، اور باوجود ناز و نعم میں گھرے ہونے کے وہ ضیق محسوس کرتا ہے، لیکن اگر یہ مفقود ہو جائے، یا ہاتھ سے چھین لی جائے تو اب اس کو اس کی قدر ہوتی ہے، قدرِ نعمت بعد زوال اسی صداقت کا اظہار ہے، علاوہ ازیں احساسِ نعمت کا مفقود ہونا گو یا نعمت ہی کا مفقود ہونا ہے، اگر نعمت سے مجھے خوشی نہ ہو، کوفت ہو، تعب ہو تو یہ میرے لیے نعمت نہیں زحمت ہے، ان حقائق کو سمجھ لینے کے بعد تمہیں معلوم ہوگا کہ ازدیادِ نعمت میں شکر کا کتنا دخل ہے ۔ نعمت کے شعور سے نعمت کا بقا ہے، شعور کا فقدان

نعمت کا فقدان ہے، اسی لیے احساسِ نعمت کو زندہ رکھنا چاہیے، اور یہی چیز شکر سے حاصل ہوتی ہے۔ حضرت حسن بصری شکر کو "جالب" "حافظ" کہتے تھے، کیونکہ وہ موجودہ نعمتوں کی "حافظ" اور مفقود نعمتوں کی "جالب" ہے۔ شکر سے نعمت سلب و نقصان سے محفوظ ہو جاتی ہے، اور چونکہ شعور میں نعمتوں کے ادراک کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، وہ ان چھوٹی چھوٹی عنایتوں کا بھی مشاہدہ کرنے لگتا ہے جو اس کے قبل نظر سے پوشیدہ تھیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شکر سے نعمتوں میں قطعی اضافہ ہوتا ہے۔ الشاکر یستحق المزید (شاکر زیادتی کا مستحق ہے) ایک نفسیاتی صداقت ہے، اسی لیے ہمارے اسوۂ حسنہ کو جب بھی کوئی امر خوشی کا پیش آتا تو شکر الٰہی کی ادائی کے لیے سجدہ میں گر جاتے۔ (رواہ احمد)

انسان کی کچھ عجیب فطرت ہے، نعمتوں کو بہت جلد بھول جاتا ہے اور مصیبتوں کا ہمیشہ شکوہ کرتا رہتا ہے، کسی عرب شاعر نے اس پر خوب تہدید کی ہے۔

یا ایھا الظالم فی فعلہ　　والظلم مردود علی من ظلم
الی متیٰ وحتیٰ متیٰ　　تشکو المصیبات وتنسی النعم

ذرا ہمیں اپنی ان نعمتوں کو دہرانا چاہیے جن کی طرف ہماری نظر نہیں جاتی، پہلے "نعمتِ نفع" کو لیجیے، پھر "نعمت دفع" کو دونوں بیشمار ہیں۔ "نعمت نفع" میں آدمی اپنے صحیح و سالم قد و قامت پر نظر کرے، صحت و عافیت پر غور کرے، ان لذتوں کا خیال کرے جو کھانے پینے اور جنسی خواہشوں کی تکمیل میں اس کو میسر ہیں، پھر "نعمتِ دفع" کے سلسلہ میں یہ دیکھے کہ وہ اپاہج نہیں، ہزاروں بیماریوں سے محفوظ ہے، دشمنوں اور مخالفوں کے شر سے مامون ہے، صاحبِ ایمان پھر نعمت کو ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھ سکتا ہے۔ اس کو "نعمتِ توفیق" بھی حاصل ہے اور "نعمت عصمت" بھی! نعمتِ توفیق یہ کہ

ؔ اے اپنے فعل میں ظلم روا رکھنے والے تجھے معلوم ہے کہ ظلم ظالم پر لوٹ کر آتا ہے۔ کب تک اور کہاں تک تو مصیبتوں کا شکوہ کرتا رہیگا اور نعمتوں کو بھلاتا جائیگا؟

Marfat.com

اس کو ایمان توحید، صدق و استقامت حاصل ہے، نعمتِ عصمت یہ کہ وہ کفر، شرک، نفاق وارتداد، بدعت وفسق وغفلت سے محفوظ رکھا گیا ہے، اگر ان نعمتوں کی وہ تفصیلات میں جائے، ان کی جزا پر نظر کرے، اپنی صلاحیت واستعداد پر غور کرے، یہ دیکھے کہ اس کو ان نعمتوں کا کیا حق ہے، تو بے اختیار چیخ اُٹھے۔

بے لطفِ تو من قرار نتوانم کرد ـــ احسانِ تو شمار نتوانم کرد

گر برتنِ من زباں شود ہر موئے ـــ یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد (ابو سعید ہمنہ)

سچ ہے اِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرو تو گن نہ سکو گے) اب ان لاتعداد احسان کا شکر انسان کیسے ادا کر سکتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ "شکر ادائے شکر سے اپنے عجز کا جان لینا ہے" ادائے شکر کے ساتھ ہی ایک اور شکر لازم آتا ہے، کیونکہ شکر کی توفیق بھی تو حق تعالیٰ کی جانب سے ہوتی ہے، اور یہ توفیق خود ایک بڑی نعمت ہے جس کا شکر ضروری ہوا، پھر اس شکر کا شکر، وہلم جرًا الیٰ نہایۃ۔ اس لیے احسان ومنت باری تعالیٰ کا مشاہدہ خود شکر ہے، ان کی نعمتوں کا اعتراف خود شکر ہے۔ ان کے حصول کے بعد مرضیات حق پر قائم رہنے کی دعا خود شکر ہے، ان پر حق تعالیٰ کی ثنا خود شکر ہے۔

حق تعالیٰ سے استعانت کے دوسرے طریقے اجمالاً یہ ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ گناہوں کے صدور پر توبہ کریں حق تعالیٰ مغفرت سے ہماری استعانت فرماتے ہیں۔ اِنَّہٗ کَانَ لِلْاَوَّابِیْنَ غَفُوْرًا۔ وہ رجوع کرنے والے کو معاف کرتے ہیں، کتنا تسکین بخش اور محبت آمیز پیام ہے اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اھْتَدٰی میں معاف کر دیتا ہوں اس کو جس نے توبہ کی، ایمان لایا، نیک عمل کیے اور پھر اس راستہ پر چلا، توبہ وندامت سے گناہ کی سیاہی قلب سے محو ہو جاتی ہے۔ گناہوں سے تنفر پیدا ہو جاتا ہے نیکیوں سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور تائب حق تعالیٰ کا محبوب ہو جاتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ۔

ہم نے اوپر تفصیل سے دکھلایا ہے کہ قوت واثر اصالۃً صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے ثابت

ہیں۔ لا قوۃ الا باللہ۔

ہماری خوف و رجا کی نسبت صرف حق تعالیٰ ہی سے قائم ہو جاتی ہے اور اس کے قیام کے ساتھ ہی حق تعالیٰ ہمیں مخلوق سے غنی اور بے نیاز کر دیتے ہیں اور اس غنا کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اس قاتل جذبہ کے چنگل سے آزاد ہو جاتے ہیں جس نے سنگ پرستوں کی زندگی کو سکون و طمانیت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا ہے۔ یہ خوف کا جذبہ ہے جس نے ان کو سوتے جاگتے ہر وقت پریشان، مضطر و حواس باختہ کر رکھا ہے اور جس کی وجہ سے انہیں ہر کونہ میں ایک دام دکھائی دیتا ہے اور ہر گوشہ میں ایک درندہ!

اگر ہم اس امر میں حق تعالیٰ سے استعانت چاہیں کہ وہ ہمیں یاد رکھیں اور ہم سے راضی رہیں، تو ہمیں چاہیے کہ ہم حق تعالیٰ کو یاد رکھیں اور ان کے ہر حکم و فعل سے راضی ہو جائیں فاذکرونی اذکرکم۔ تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کرونگا، اسی لیے حکم فرمایا کہ اذکروا اللہ ذکرًا کثیرًا۔ اور ہمارے راضی ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ہم سے راضی ہو جاتے ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ و رضوا عنہ۔

آنانکہ رضائے حق بجاں می جویند　　در راہِ رضائے او بسر می پویند

ہر یک ہمہ آں کنند کہ حق فرماید　　حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

اوپر جو کچھ ہم نے کہا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب یا دین مشتمل ہی دو اجزا پر عبادت و استعانت پر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار سے ہمارے قلوب سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو جاتی ہے۔ اس قلب کی عظمت کا کیا کہنا جس سے غیر اللہ کی معبودیت و ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی ربوبیت و معبودیت متمکن ہو گئی ہے، جس کے الٰہ قطعاً اللہ ہیں، یعنی جس کے معبود، جس کے مسجود، جس کے مطلوب، جس کے مقصود قطعاً اللہ ہیں، جس کے رب جس کے مستعان قطعاً اللہ ہیں! اس قلب میں توحید کا جلوہ ہے، ایمان کا نور ہے، وہ نورانی قلب ہے، حق تعالیٰ کا محبوب ہے اور حق تعالیٰ

Marfat.com

اس کے وکیل ہیں، کفیل ہیں، ولی ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں، حفیظ ہیں اور ہادی ہیں۔

اس ضمن میں چند تعریفات یاد رکھو، جیسا کہ تم نے دیکھا ہے۔ ذات اللہ ہی کو الٰہ قرار دینا یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا توحید ہے، اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید داخل ہو جاتی ہے، جس ذاتِ پاک نے یہ پیام ہم تک پہنچایا (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی رسالت کے اقرار و تصدیق سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے اور ایمان جلوہ افروز ہو جاتا ہے۔ ایمان میں دو چیزیں ہیں اور توحید میں بھی دو چیزیں۔ ایمان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی الوہیت کی تصدیق ہے، توحید میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔ اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک نفاق ہے۔ اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے۔ یہ مثل شرک کے دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے، اور اس لیے ناقابلِ معافی اور بدعت بھی بُری بلا ہے۔ یہ دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا ہے، جو دین کی بات نہیں اس کو دین سمجھنا ہے۔ غیر شریعت کو شریعت بتلانا افترا علی اللہ اور ایک گونہ "ادعائے نبوت" ہے، بدعتی کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے، کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ رہا ہے، پھر توبہ کیوں کریگا۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار۔

قبل ایمان کفر و شرک سے توبہ لازم ہے، پھر ایمان یعنی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی قلبی تصدیق اور لسانی اقرار جس سے غیر اللہ کی معبودیت اور ربوبیت فنا ہو کر اللہ کی معبودیت و ربوبیت متمکن ہو جائے۔ اب نفاق، ارتداد، بدعت، فسق و فجور سے احتراز ایمان اور عملِ صالح پر استقامت، یہ ہے دین یا "بندگی" جس کے متعلق عارف روم نے کیا خوب کہا ہے ؎

گر تو خواہی حرّی و دل زندگی　　　بندگی کن بندگی کن بندگی

Marfat.com

زندگی مقصود بہر بندگی است — زندگی بے بندگی شرمندگی است
جز خضوع و بندگی و اضطرار — اندریں حضرت ندارد اعتبار
ہر کہ اندر عشق یابد زندگی — کفر باشد پیشِ او جز بندگی
ذوق باید تا دہد طاعات بر — مغز باید تا دہد دانہ شجر

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (یوسف ۱۲۶)

ضمیمہ

مندرجہ ذیل نقشہ سے دین کے سارے اجزاء کی تلخیص پیشِ نظر ہو جاتی ہے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

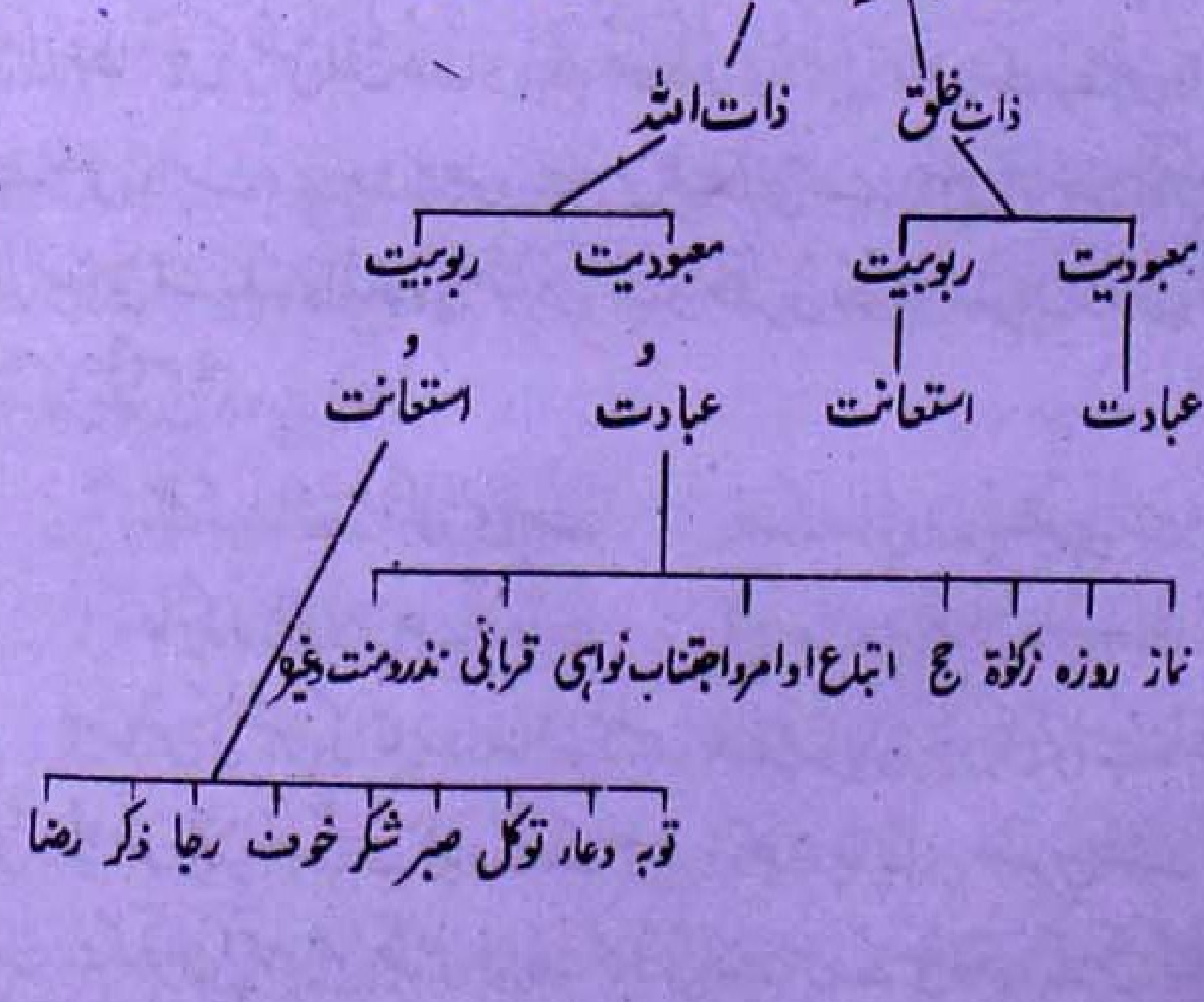

توحیدِ الوہیت [1]

سیری بہ حریم جان و دل منزل کن قطع نظر از صورتِ آب و گِل کن

جز معرفتِ الٰہ ہیچ است ہمہ بگذر ز ہمہ معرفتے حاصل کن! (سیری غزنوی)

تخلیقِ عالم کی غایت کیا ہے؟ جن و انس پیدا کیوں ہوئے؟ "از آمدن و رفتن ما سودے کو؟" فلسفیوں کو اپنے کودکِ عقل کے ساتھ کھیلتا چھوڑ کر (ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ) ہم اس اساسی سوال کے جواب کے لیے قرآن کریم کی طرف توجہ کرتے ہیں جو مبدء ہے علم حقیقی کا اور جو ریب و شک، ظن و تخمین، قیاس و وہم سے منزہ ہے! یہیں ہمیں وہ نورِ ہدایت نصیب ہوتا ہے جس کو عقل نظری ہمیں عطا نہیں کرسکتی! اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى! یہیں مومن کے لیے یقین و اذعان کا ذخیرہ ہے۔ یہیں بداہت و ہدایت کا جلوہ ہے یہیں علمِ حقایق ہے اور یہیں طمانیت و تسکین۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ [2]! (پ ۸ ع ۶)

علمے کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی است واللہ کہ بجز ابی ازاں تشنہ لبی ست

جائیکہ بود جلوہ حق حاکم وقت تابع شدن حکم خرد بولہبی ست (شاہ ولی اللہ)

جن و انس کی تخلیق کی غایت صاف و بلیغ الفاظ میں یوں بیان کی گئی ہے "مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ" عبادت کے معنی ہیں "توحید"۔ چنانچہ امام المفسرین حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ قرآنِ کریم میں جس جگہ بھی عبادت کا ذکر آیا ہے اس کے معنی توحید کے ہیں [3]۔ گویا محاورہ قرآن

---

[1] یہ مقالہ رسالہ برہان دہلی، ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔
[2] اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس کا تم کو اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم احتیاط رکھو۔
[3] بخاری حدیث وفد عبد القیس۔

میں عبادت ہر جگہ توحید کے معنی میں آئی ہے "ایاک نعبد و ایاک نستعین" کے معنی ہونگے نوحدک ونطیعک اور "ایای فاعبدون" کا مفہوم ہوگا کہ میری ہی توحید تمہارے سینوں میں بس جائے۔ عبادت کی تعبیر توحید کے لفظ سے کرنے میں خوبی یہ ہے کہ اس سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ عبادت صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے جو واحد لاشریک ہے۔ اس سے شرک کی قطعی نفی ہو جاتی ہے جس کو کسی دوسری جگہ کھول کر اس طرح بیان کیا گیا ہے وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا(پ۵ ع۳)[1] ہمیں اپنی عبادت و معرفت کے لیے پیدا کیا ہے، ہماری زندگی کا مقصود یہی عبادت و بندگی ہے۔ یہی عرفان یہی توحید ہے، تمام انبیاء نے اسی توحیدِ الوہیت کو پیش کیا۔ یہی ان کی بعثت و دعوت کا اصل مقصود تھا۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم | خاکے شوم و بزیرِ پائے تو زیم!
مقصودِ من خستہ ز کونین توئی | از بہرِ تو میرم و برائے تو زیم!
(تمام)

تمام پیغمبروں کے پیغام کا یہی نچوڑ تھا کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ یعنی اے قوم تم اللہ ہی کی عبادت کرو کہ اس کے سوائے تمہارا کوئی معبود و رب نہیں! یا اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو! حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے خطاب فرمایا: اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ، اور یہ عبادت اسی توحید و تقویٰ و اطاعت پر مشتمل ہے! حضرت ہودؑ حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ نے بھی انہی الفاظ سے کہ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ سے اپنی قوم کو توحید کی طرف بلایا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کو یوں مخاطب کیا اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اور مشرکین سے اپنی برأت اس طرح ظاہر فرما دی۔ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ[2] (پ۲۵ ع۹) انہوں نے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہ وصیت فرما دی تھی کہ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ[3] (پ۱ ع۶)

---

[1] تم اللہ ہی کی عبادت اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی اور چیز کو شریک مت کرو

[2] میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر ہاں جس نے مجھ کو پیدا کیا پھر وہی مجھ کو رہنمائی کرتا ہے۔

[3] اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے اس دین کو تمہارے لیے منتخب فرمایا ہے سو تم بجز اسلام کے اور کسی حالت پر جان مت دینا!

Marfat.com

حضرت لوطؑ نے اپنی قوم کو اور حضرت موسیٰؑ نے فرعون اور اہلِ فرعون کو یہی بات پہنچائی تھی کہ تم صرف اللہ ہی کو پوجو۔ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اسی تعلیم، اسی دعوتِ توحید کے ساتھ ہمارے نبی النبی الخاتم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے اور حق تعالیٰ نے آپ کی ذات پر اس دعوت الی التوحید کو ختم فرمادیا، آپ کو ارشاد ہوا۔ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ﰳالَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ[1] (پ ۹ ع ۹)

غرض توحیدِ الوہیت پر سارے انبیائے اولین و آخرین کا اجماع ہے، جو بھی رسول آیا وہ توحید کی دعوت لے کر آیا۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ[2] (پ ۱۷)

اسی لیے لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اسلام کا دعوتی کلمہ ہے جس میں توحیدِ الوہیت اور رسالتِ محمدی کو پیش کیا جا رہا ہے جن کا جان کر اقرار کرنا ایمان کے لیے ضروری ہے، فرض اول ہے۔ اِلٰہ اسم صفت ہے اور باجماع اہلِ علم اس کے معنی "معبود" کے ہیں اور اس پر آیاتِ قرآنی دلیل ہیں ان میں سے بعض پر غور کرو۔

(۱) وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّ فِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ — یعنی وہی ذات پاک آسمان اور زمین کا معبود ہے۔

(۲) اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ — یعنی کیا اللہ کے سوا ان کا کوئی معبود ہے؟

(۳) وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰى — ہم نے بنی اسرائیل کو دریا سے پار اتار دیا پس ان لوگوں کا ایک قوم پر گزر ہوا جو اپنے چند بتوں کو لگے بیٹھو

---

[1] آپ کہہ دیجیے کہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اس اللہ کا بھیجا ہوا ہوں جس کی بادشاہی ہے تمام آسمانوں اور زمین میں اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہی زندگی دیتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، سو اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول پر۔ [2] ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا پیغمبر نہیں بھیجا جس کے پاس ہم نے یہ وحی نہیں بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، پس میری عبادت کیا کرو۔

اَصْنَامٍ لَّهُمْ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ	ہیں کہنے لگے اے موسیٰ ہمارے لیے بھی ایک معبود ایسا
لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ قَالَ اِنَّكُمْ	ہی مقرر کر دیجیے جیسے ان کے یہ معبود ہیں، آپ نے
قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ (پ ۹ ع ۶)	فرمایا کہ واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے۔
(۴) وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِىْ ظَلْتَ	اور تو اپنے معبود کو دیکھ جس پر تو جما ہوا بیٹھا تھا ہم
عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ	اس کو جلا دینگے پھر اس کو دریا میں بکھیر دینگے بس
فِى الْيَمِّ نَسْفًا اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ	تمہارا معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی
الَّذِىْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَسِعَ كُلَّ	عبادت کے قابل نہیں، وہ علم سے تمام چیزوں کو
شَىْءٍ عِلْمًا	احاطہ کیے ہوئے ہے۔

(۵) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش سے کہا تھا کہ اگر تم ایک کلمہ کا اقرار کر لو تو تمام عرب تمہارا مطیع ہو جائے اور تمام عجم تمہاری خدمت گزاری کرنے لگے۔ ابو جہل نے خوش ہو کر کہا کہ بتلائیے وہ کلمہ کیا ہے، ہم ایسے دس کلمے ماننے کے لیے تیار ہیں۔ فرمایا دس نہیں بس ایک ہی کلمہ ہے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ یہ سنتے ہی ان سب کو طیش آیا، کہنے لگے "اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَىْءٌ عُجَابٌ (پ ۲۳ ع ۱۰) یعنی اس نے تو اتنے معبودوں کی جگہ ایک ہی معبود رہنے دیا۔ واقعی یہ بہت ہی عجیب بات ہے"۔ (ترمذی شریف کتاب التفسیر)

ان تمام آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اِلٰہ سے مراد معبود ہے اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ سے اسی توحید الوہیت کو پیش کیا جا رہا ہے جس کو سارے انبیاء نے پیش کیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی مستحقِ عبادت ہے اسی کی عبادت کی جانی چاہیے۔ اسی سے فقر و ذلت کی نسبت جوڑنی چاہیے۔ افرادِ عبادت لِلّٰہ ہی تمام پیغمبروں کے پیام کا حاصل ہے یعنی صرف اللہ ہی اِلٰہ ہے، غیر اللہ بحیثیت اِلٰہ قلب سے فنا ہو جائے ؎

دل عاشقِ روئے تست با عہدِ درست
جاں طالبِ وصلِ تست از روزِ نخست
آں کس کہ نجست وصلِ تو ہیچ نیافت
واں کس کہ ترا یافت دگر ہیچ نجست (شیخ عطار)

Marfat.com

توحید فی العبادت کی ضد تشریک فی العبادت! موحد اللہ ہی کو اِلٰہ مانتا ہے یعنی اللہ ہی کی عبادت کرتا ہے اور مشرک غیر اللہ کو بھی اِلٰہ مانتا ہے اور اس کی بھی عبادت کرتا ہے۔ سورۂ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر یعنی ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمٰعیل، یسع، یونس علیہم السلام کا ذکر کر کے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر یہ نفوسِ قدسیہ حق تعالیٰ کی عبادت میں کسی کو شریک کرتے تو ان کی ساری طاعتیں باطل ہو جاتیں کیونکہ شرک کے ساتھ کوئی عمل مقبول نہیں۔ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (پ ۱۵۶)

تصریحاتِ بالا سے یہ امر روز روشن کی طرح واضح ہے کہ اس عالم میں انسان کی تخلیق عبادتؔ معرفت کے لیے ہوئی ہے، اسی لیے تمام انبیاء و رسل توحید ہی کی دعوت کے لیے مبعوث ہوئے، انھوں نے بنی نوع انسان کو توحید فی العبادت کی طرف بلایا، شرک سے ڈرایا، ہر ایک نے باآواز بلند فرمایا:-

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ۔

نقطۂ ادوارِ عالم لَآ اِلٰہ　　انتہائے کارِ عالم لَآ اِلٰہ!

اور جب مقصودِ زندگی توحید فی العبادت ہے تو ہمیں عبادت کے مفہوم پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے۔ شرک کی ماہیت کو بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیے تاکہ جس مقصد کے لیے ہم پیدا ہوئے ہیں اس کے تحقق میں کامیاب ہوں اور کامیاب عمل ہونا بغیر علمِ صحیح کے ممکن نہیں! یاد رکھو کہ یہ دو روزہ پُر فریب زندگی اپنے مختلف ادوارِ طفلی و جوانی و پیری کی مخصوص نعمتوں اور بلاؤں سے گزر کر بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اور آخری دور میں پہنچ کر ہم بیدل کے الفاظ میں کہہ اُٹھتے ہیں :-

طفلی کہ زمانِ بازی می آراست　　دامن افشاند

انگاہ جوانی کہ داغش پیداست　　گل کرد و نماند

اکنوں پیری نَفَس شماری دارد　　بیدل چہ علاج

زیں نسخہ ہم آخر ورق چند بجاست　　باید گرداند

لیکن ورق اُلٹنے کے بعد قصہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اب دنیوی زندگی کے اعمال کی جزا و سزا کا دور شروع

Marfat.com

ہوتا ہے اور یہ ابدی ہے، اس کی انتہا نہیں، یہاں یا تو سکھ ہی سکھ ہے یا پھر دکھ ہی دکھ۔ توحید پر خاتمہ ہوا تو سوائے سکھ[1] کے کچھ نہیں اور اگر شرک پر[2] دم توڑا تو سوائے دکھ کے کچھ نہیں۔ اسی لیے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت داؤدؑ نے اپنی اولاد کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ!

اب ذرا عبادت کے تضمنات پر تفصیل سے غور کرو۔

لغت میں عبادت نام ہے "غایتِ تذلل" کا یعنی نہایت درجہ کی خاکساری و نیازمندی کا اور شرع میں عبادت مراد ہے بندوں کے ان افعال و اقوال و احوال سے جن کا تعلق خاص طور پر حق تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے ساتھ ہوتا ہے۔ عبادت اسمِ جنس ہے اس کی بہت ساری انواع ہیں

(۱) عبادتِ اعتقادی: یہ اصل ہے سب انواع کی، اس کا دوسرا نام "توحیدِ الوہیت" ہے، جیسا کہ اوپر بتایا گیا۔ محاورۂ قرآن میں عبادت کے معنی اسی توحید کے ہیں۔ یہ اس امر کا اعتقاد ہے کہ اکیلا اللہ ہی اِلٰہ یعنی معبود و رب واحد احد ہے، وہی خالق ہے، اسی کی سب خلق ہے اور اسی کا امر، وہی مالک ہو وہی حاکم، اسی کے ہاتھ میں نفع و ضرر ہے، وہی مولیٰ ہے۔ اسی طرح الوہیت کے دوسرے لوازم کا اعتقاد۔ لہٰذا دعا، ندا، استغاثہ، استعانت، التجا، رجا، خوف سب صرف اللہ ہی سے ہوں، غیر اللہ سے نہ ہوں۔

(۲) عبادتِ لفظی: کلمۂ توحید لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا زبان سے اقرار جس نے دل سے اس کا اعتقاد رکھا لیکن زبان سے اقرار نہ کیا تو اس کا خون و مال محفوظ ہوگا اور جس نے

---

[1] ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملٰئکۃ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون، نحن اولیاء کم فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاٰخرۃ ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون، نزلا من غفور الرحیم (پ ۲۴ ع ۱۸) جن لوگوں نے اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر مستقیم رہے، ان پر فرشتے اتریں گے، کہ تم اندیشہ نہ کرو اور نہ رنج کرو، اور تم جنت پر خوش رہو، جس کا تم سے وعدہ کیا جایا کرتا تھا، ہم تمہارے رفیق تھے دنیوی زندگی میں، اور عقبیٰ میں بھی رہیں گے اور تمہارے لیے جس چیز کو تمہارا جی چاہے گا موجود ہے، اور نیز تمہارے لیے اس میں جو مانگو گے موجود ہے۔

[2] انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ و ماوٰئہ النار (پ ۶ ع ۱۴) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک قرار دیگا سو اس پر اللہ جنت کو حرام کر دیگا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

Marfat.com

زبان سے کہا مگر دل سے معتقد نہ ہوا تو اس کا خون و مال تو بچ گیا لیکن وہ منافق ہے اور اس کا حساب اللہ پر ہے۔

(۳) عبادتِ بدنی: جیسے قیام و رکوع و سجود نماز میں۔

(۴) عبادت صوم و افعالِ حج و عمرہ جیسے طواف، ذبح، نحر، حلق وغیرہ

(۵) عبادت مالی: حق تعالیٰ کے امتثال امر میں انفاق مثلاً زکوٰۃ، صدقہ۔

اسی طرح واجبات و مندوبات کی افعال و اقوال، اموال و ابدان میں اور انواع ہیں جو عبادت میں داخل ہیں، ان کا حصر یہاں ضروری نہیں، صرف امہاتِ عبادت کی یہاں تصریح کر دی گئی۔ کلی طور پر یوں سمجھو کہ نیبی نفع کے لیے مخلوق جو کام کرتی ہے وہ عبادت ہے۔ اگر اس کی اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے (اَذِنَ بہ اللہ) ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے، اگر اس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت نہیں دی وہ (مالم یأذن بہ اللہ) ہے تو وہ غیر اللہ کی عبادت ہے۔

خوب سمجھ لو کہ شرک واقع ہوتا ہے عبادت کے ان ہی افعال اور عقائد میں۔ بنی نوعِ انسان کے اکثر افراد عبادت ہی کے معاملہ میں شرک میں گرفتار ہوتے رہے۔ انہوں نے غیر اللہ کو اپنا اِلٰہ یا معبود قرار دیا، اپنے نفع کے لیے ان کی مرضی کا اتباع کیا یعنی اپنا نافع و ضار سمجھا، باعتقاد نفع و ضرر ان کی تعظیم کی، وقت حاجت ان سے فریاد رسی چاہی، ان سے استعانت کی، ان کو پکارا، ان سے التجا کی، استغاثہ کیا، رجا و خوف کا تعلق ان سے رکھا، ان کی نذر و نیاز میں اپنے مال کا ایک حصہ صرف کیا اور ذبح و نحر سے ان کا تقرب چاہا۔ غرض فقر و ذلت کی نسبت ان سے جوڑی، ان کے سامنے خضوع کیا اور جب انبیائے کرام نے انہیں افراد عبادت اللہ کی دعوت دی، توحید فی العبادت کی تلقین کی انہیں للکارا کہ

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی — بگذر ز خدائے کہ بصد رنگ تراشی

تو ان مشرکین نے از راہِ تکبر و عناد پلٹ کر پوچھا اَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ اللّٰہَ وَحْدَہٗ وَنَذَرَ مَا کَانَ یَعْبُدُ اٰبَاؤُنَا؟ (پ ۸ ع ۱۶) کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہم سے یہ کہو کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور اپنے

باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں؟ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا، اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ (پ۲۳ ع ۱۰)
یعنی بڑے تعجب کی بات ہے کہ سب معبودوں کو اس شخص نے تو ایک معبود کر ڈالا۔

دیکھو ان مشرکین نے اللہ تعالیٰ کے وجود کا انکار نہیں کیا تھا، وہ اللہ تعالیٰ کے قائل تھے، مقر تھے اس پر ایمان رکھتے تھے، ان کو اس بات کا بھی اقرار تھا کہ اللہ ہی ہمارا خالق ہے لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ (پ۲۵ ع ۱۳) زمین و آسمان کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا ہے لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ۔ رزاق بھی وہی ہے۔ محی و ممیت بھی وہی اور مدبر امر بھی وہی: قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (پ۱۱ ع ۹) اسی کے ہاتھ میں تمام چیزوں کا اختیار ہے اور وہی ہر شے کی پناہ گاہ ہے: قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (پ۱۸ ع ۵) وہی آسمانوں کا اور عرش عظیم کا مالک اور رب ہے: قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ، سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ، قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ (پ۱۸ ع ۵)۔ زندگی گذارنے کے قانون میں اپنے کو آزاد سمجھتے تھے، ہدایت رب کا محتاج نہ جانتے تھے۔

فرعون جس کو کفر میں اتنا غلو تھا اس کے متعلق بھی حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ کی زبانی کہلوایا ہے۔ لقد علمت ما انزل ھؤلاء الا رب السموٰت والارض بصائر (پ۱۵ ع ۱۲) تو یہ خوب جانتا ہے کہ یہ عجائبات خاص آسمان و زمین کے پروردگار نے بھیجے ہیں جو کہ بصیرت کے لیے ذرائع ہیں، اور تمام مشرکین کے بارے میں ابلیس لعین تک نے کہا۔ انی اخاف اللہ رب العلمین نیز رب انظرنی اور رب بما اغویتنی؛

صاف ظاہر ہے کہ ان مشرکین کا جرم "اشراک فی الذات" نہیں تھا، یعنی یہ اللہ کی ذات کے برابر کسی غیر کو واجب الوجود یا ازلی و ابدی نہیں مانتے تھے، اور نہ ان کو اللہ تعالیٰ کی الوہیت سے انکار تھا سوائے ثنویہ کے دنیا میں کوئی فرقہ اس کا قائل ہی نہیں ملتا۔ مشرکین کہ توحید ربوبیت تک کے مقر

Marfat.com

تھے۔ وہ حق تعالیٰ کی خالقیت اور رزاقیت، مالکیت وحاکمیت و ربوبیت کو مانتے تھے اور غیر اللہ کو حق تعالیٰ ہی کا مربوب، مرزوق، مخلوق مملوک ومحکوم جانتے تھے چنانچہ وہ اپنے تلبیہ میں کہتے تھے۔ لبیک لا شریک لک الا شریک ھولک تملکہ وما ملک یعنی "اے اللہ میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک کہ تو اس کا مالک ہے اور وہ کسی شئے کا مالک نہیں"۔

اس طرح وہ نہ صرف حق تعالیٰ کے وجود کا اقرار کر رہے ہیں بلکہ اسی کو مالک وحاکم قرار دے رہے ہیں اور اسی کی ربوبیت کے قائل ہو رہے ہیں لیکن باوجود اس اعترافِ وجود باری اور اس کی الوہیت و ربوبیت کے انہیں کافر و مشرک کیوں ٹھہرایا گیا، ان کے تمام نیک اعمال کیوں حبط اور برباد قرار دیے گئے۔ خلود فی النار کی وعید ان کو کیوں سنائی گئی؟ ان کا "ایمان باللہ" کیوں ان کی جان ومال کو مسلمانوں کے ہاتھ سے محفوظ نہ کر سکا؟ اس ایمان کے باوجود "أعداء اللہ" کیوں قرار پائے؟ ان کو کذاب، مسحور، ظالم کیوں کہا گیا؟ ان کا شمار "مھلکین" میں کیوں ہوا؟ انہیں بے عقل حیوان بلکہ ان سے بدتر کیوں ثابت کیا گیا؟ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا؟ کا فیصلہ ان کے متعلق کیوں فرمایا گیا؟

اس کا جواب تم اوپر پڑھ چکے ہو وہ ایک لفظ میں صرف یہ ہے: اشراک فی العبادۃ: ہر قوم اور ہر امت کے لیے ایک نبی مبعوث ہوا اور اس نے "توحید فی العبادت" ہی کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی: ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ (پ ۶) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی لوگوں کو افراد عبادت الٰہی کی طرف بلایا کہ جس طرح تم افراد ربوبیت کے مُقِر ہو، اللہ ہی کو رب جانتے ہو، اسی طرح اللہ ہی کو معبود جانو۔ لا الٰہ الا اللہ کے قائل ہو جاؤ، اس کے معنی ومقتضیٰ پر عمل کرو۔ اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو، تمہاری ساری عبادت سراً وعلانیۃً قلبی وقالبی طور پر خالص اللہ کے واسطے ہو۔ استعانت ہو یا استغاثہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت، یا پرستش کی کوئی سی شکل صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص ہو

اس وقت غیر کا تصور بھی تمہارے ذہن میں نہ آئے! تم اللہ ہی کے فقیر ہو، ذل وانتقار کی نسبت اللہ ہی سے جوڑلو، جھوٹے معبودوں سے اپنی بندگی کی نسبت قطعاً توڑلو، ان سے نفع وضرر کی توقع مطلقاً چھوڑدو، اللہ تمہارے لیے بہر حال کافی ہے۔ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ تمہیں صرف اللہ ہی کا ہو کے رہنا چاہیے۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

با خلق آشنا نہ شود مبتلائے تو   بیگانہ باشد از ہمہ کس آشنائے تو

میخواہم از خدا بدعا صد ہزار جاں   تا صد ہزار بار بمیرم برائے تو

مشرکین نے اس پیغام کو سن کر کہا دیکھو ہم اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل ہیں، اس کا انکار نہیں کرتے اپنے بتوں کو اللہ تعالیٰ کے برابر نہیں جانتے بلکہ ان کو اللہ ہی کا مخلوق اور بندہ مانتے ہیں اللہ ہی کو مالک وحاکم ورب سمجھتے ہیں مستقل معبود بھی اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اپنے بتوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں، ہم ان کو محض اپنا "شفیع" (وکیل اور سفارشی) جانتے ہیں۔ ہم ان کی عبادت اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ اپنی وجاہت کی وجہ سے ہماری سفارش یا شفاعت اللہ تعالیٰ کے پاس کر سکتے ہیں هٰؤُلَاءِ شُفَعَاءُنَا عِنْدَ اللّٰہِ (پ ۱۱ ع ۵) ان کی عبادت ہمیں اللہ تعالیٰ کی ناراضی وخفگی سے بچاکر اس کا قرب عطا کر سکتی ہے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا اِلَی اللّٰہِ زُلْفٰی (پ ۲۳ ع ۱۵) یہی ان کا کذب، کفر اور شرک تھا! اِنَّ اللّٰہَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ کَاذِبٌ کَفَّارٌ (پ ۶) سُبْحٰنَهٗ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (پ ۶)

اب ذرا اسی موقع پر تحقیق کرلو کہ ان مشرکین کے یہ معبود کون تھے جن کو وہ شفیع اور مقرب سمجھ رہے تھے؟ امام فخر الدین رازیؒ نے تفسیر کبیر میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے ان کی تحقیق کی رو سے بت پرستوں (عابدان اوثان) کے دین سے کوئی دین قدیم نہیں کیونکہ انبیا میں سب سے پہلے نبی جن کی تاریخ ہم تک پہنچی ہے وہ حضرت نوح علیہ السلام ہیں اور جب انہوں نے ان بت پرستوں کو توحید معبودیت کی طرف متوجہ کیا اور فرمایا اعبدوا اللہ واتقوہ واطیعون (پ ۲۹ ع ۹) تو ان بت پرستوں نے ان کی دعوت شب وروز کے جواب میں اپنے ساتھیوں سے کہا کہ

Marfat.com

لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا۔ یعنی تم اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور نہ ود کو اور سواع کو اور نہ یغوث کو اور یعوق کو اور نسر کو چھوڑنا (پ ۲۹ ع ۱۰)

اب ان کے یہ معبودانِ باطل ود و سواع وغیرہ کون تھے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم[1] نے نشان دہی کی ہے کہ یہ حضرتِ نوح علیہ السلام کی قوم کے چند نیک بخت اور بزرگ لوگ تھے، ان کی موت کے بعد ان کے بیٹھنے کی جگہ پر ان کے نشان قائم کیے گئے، ان کا بھی وہی نام رکھا گیا اور پھر کچھ عرصہ بعد ان نشانوں کی پرستش شروع کر دی گئی۔ اعتقاد یہ تھا کہ جس طرح یہ بزرگ زندگی میں مجاب الدعا رہے ہیں، روز حشر بھی مقبول الشفاعت رہیں گے، اور اللہ تعالے کے ہاں ہماری شفاعت کریں گے۔ ان ہی کے حال کی خبر ہمیں اس آیت میں دی گئی ہے:۔

يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا	یعنی یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت
يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ	کرتے ہیں جو نہ ان کو ضرر پہنچا سکیں اور نہ ان کو نفع
هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ قُلْ	پہنچا سکیں اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس ہمارے
اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي	سفارشی ہیں آپ کہہ دیجیے کہ کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر
السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ سُبْحٰنَهٗ	دیتے ہو جو خدا کو نہیں معلوم، نہ آسمانوں میں اور نہ زمین
وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (پ ۱۱ ع ۶)	میں وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے۔

اس تحقیق سے صاف ظاہر ہے کہ بت پرست اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بالاستقلال بتوں کو معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی بت پرستی کا منشا اولیاء انبیاء وغیرہ کی تعظیم تھی۔ انہوں نے اپنے بتوں کو انہی کی صورت پر تراشا، اور انہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع سمجھ کر اپنا سرِ نیاز ان کے سامنے جھکاتے تھے۔ اس طرح وہ اصل میں ولی پرست، صالح پرست اور نبی پرست تھے! اب ذرا فخر رازی کی عبارت بھی سن لو جو اوپر کی آیت کی توجیہ و تفسیر میں انہوں نے لکھی ہے۔

انھم وضعوا ھذہ الاصنام والاوثان	یعنی بت پرستوں نے یہ اصنام و اوثان اپنے انبیاء و
علی صور انبیاءھم واکابرھم وزعموا	اکابر کی صورتوں پر تراشے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ

[1] رواہ البخاری۔

انھم متی اشتغلوا العبادۃ ھذہ التماثیل	جب ہم ان کی عبادت میں مشغول ہونگے تو یہ اکابر
فان اولئک الاکابر تکون شفعاء ھم	اللہ کے پاس ہماری شفاعت کرینگے۔ اس کی نظیر
عند اللہ تعالیٰ ونظیرہ فی ھذا الزمان	اس زمانہ میں اکثر لوگوں کی اپنے بزرگوں کی قبروں
اشتغال کثیر من الخلق بتعظیم قبور	سے مشغولیت ہے اس اعتقاد سے کہ اگر ہم ان
الاکابر علی اعتقاد انھم اذا عظموا قبورھم	قبروں کی تعظیم کرینگے تو یہ اللہ کے نزدیک ہمارے
فانھم یکونون شفعاء لھم عند اللہ[1]	شفیع ہونگے"

اوپر کی توضیحات سے مندرجۂ ذیل چار امور صاف طور سے لازم آتے ہیں۔ انہیں خوب ذہن نشین کرلو:۔

(۱) زمانۂ قدیم کے بت پرست حقیقت میں انبیاء پرست اور اولیاء پرست تھے۔ حق تعالیٰ نے انہیں "مشرک" قرار دیا۔

(۲) وہ خود اس امر کے قائل تھے کہ بت ہمارے بالاستقلال معبود نہیں بلکہ بالاستقلال ہمارا معبود اللہ ہی ہے اور یہ صرف ہمارے سفارشی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کو شفیع یا سفارشی جان کر بھی اس کی عبادت کرنا موجبِ شرک ہے (یعنی کسی کو سفارشی یا شفیع سمجھنا یہ شرک نہیں ہے بلکہ ان کی عبادت اس لیے کرنا کہ ہماری سفارش کرینگے یہ شرک ہے۔

(۳) جو افعالِ عبادت ان مشرکین سے صادر ہوئے اگر کسی کلمہ گو سے بھی صادر ہوں تو اس پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائیگا اور اس کا دعوئے اسلام اور اس کی کلمہ گوئی اطلاق شرک سے مانع نہ ہوگی چنانچہ اسی وجہ سے امام رازیؒ نے گور پرستوں کو بت پرستوں کا نظیر قرار دیا۔

(۴) جب غیر اللہ کو شفیع جان کر ان کی عبادت کرنا شرک ہوا تو پھر ان کو بالاستقلال عالم میں متصرف جان کر پوجنا تو بدرجۂ اولیٰ شرک ہوگا۔ مثلاً اولیاء و انبیاء سے اولاد مانگنا، رزق کی کشادگی چاہنا، قضاء حاجات کی دعا کرنا وغیرہ۔

[1] تفسیر کبیر ج ۴ ص ۵۵۲ سورۂ یونس تحت آیہ ھٰؤلاء شفعاء نا عند اللہ۔

Marfat.com

مشرکین کی عبادت بس یہی تھی کہ وہ اپنے اصنام واوثان (غیر اللہ) کو مقرب و شفیع اور
نافع وضار خیال کر ان کے سامنے ذلیل وخوار بن کر کھڑے ہوتے اور

(۱) ان سے وقت حاجت فریاد رسی چاہتے تھے یعنی ان کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے۔

(۲) اپنے مال کا ایک حصہ ان کی نذر ونیاز کے لیے صرف کرتے تھے، ان سے منتیں مانگتے ان کے لیے جانور ذبح کرتے اور ان کے اردگرد پھرتے یا طواف کرتے تھے۔ گو وہ حق کی ربوبیت کے قائل تھے اور اس کو خالق ورازق، محی وممیت، مدبر زمین وآسمان مانتے تھے: ما یؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون!

اب قرآن کریم کی طرف رجوع کرو اور دیکھو کہ ندا، دعاء، استغاثہ، استعانت، نذر، طواف وغیرہ سب افعال عبادت ہیں، جب حق تعالیٰ ہی معبود ورب واحد واحد ہیں تو پھر ان افعال کا تعلق صرف انہی سے ہونا چاہیے اور کسی غیر سے نہیں اعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا (پ۵ ۳۶) یہی ہے "افراد عبادت للہ فاعبد اللہ مخلصا لہ الدین، الا للہ الدین الخالص (پ۲۳ ع۱۶) مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے روا رکھا تھا اور اسی لیے انہیں تہدید کی گئی تھی کہ فلا تجعلوا للہ اندادا وانتم تعلمون یعنی تم جانتے ہو کہ حق تعالیٰ کا کوئی ند، ہمسر نہیں پھر تم کیوں غیر اللہ کی عبادت کر کے ان کو معبود قرار دے کر انہیں حق تعالیٰ کا ہمسر بنا رہے ہو؟ تمہارا یہ عقیدہ کہ اگر تم ان کا تقرب ندا و دعا، نذر ونیاز، ذبح ونحر، طواف وعکوف کے ذریعہ حاصل کرو گے تو یہ تمہیں حق تعالیٰ کے "قریب" کر دینگے اور تمہارے شفیع بن جائینگے قطعاً باطل ہے کفر بحت ہے، شرک محض ہے!

دعا عبادت ہے دعاء (دعوت، دعایۃ، دعوی) کے معنی ندا یا پکارنے کے ہیں۔ اس پر ائمہ لغت کا اجماع ہے۔ چنانچہ امام راغب نے اپنی مفردات میں تصریح کی ہے کہ الدعاء کالنداء یعنی دعا ندا کے معنی میں ہے، صراح میں بھی دعا بمعنی خواندن ہے۔ مدارک میں ندا اور دعا کا فرق وامتیاز اس طرح ظاہر کیا گیا ہے: النداء ما یسمع والدعاء قد یسمع وقد لا یسمع۔ اس سے دعا وظیفہ لسانی قرار پاتی ہے، مجمع البحار میں بتلایا گیا ہے

۱؎ سو آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ کی عبادت کرتے رہیے، یاد رکھو عبادت جو کہ خالص ہو اللہ ہی کے لیے سزاوار ہے۔

Marfat.com

کہ الدعاء الغوث یعنی دعا فریاد کرنا اور دہائی مانگنا ہے اور بطور شہادت آیت اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ پیش کی ہے اور اس کے معنی اس طرح کیے ہیں: ای استغیثوا اذا نزل بکم الضر یعنی جب تم پر کوئی مصیبت نازل ہو تو مجھ سے فریاد رسی چاہو۔ قرآن کریم کی اس آیت سے بھی وَاٰخِرُ دَعْوٰھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ دعا کے معنی پکارنے کے ثابت ہوتے ہیں۔ نیز اس آیت سے لَا تَجْعَلُوْا دُعَاۗءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَکُمْ کَدُعَاۗءِ بَعْضِکُمْ بَعْضًا۔ اگر یہاں دعا کے معنی عبادت کے لیے جائیں (جیسا کہ بعض کا زعم ہے) تو لازم آتا ہے کہ صحابہؓ ایک دوسرے کی عبادت کرتے تھے۔ وحاشاھم عن ذلك۔

دعا شرع میں عبادت کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس سے عجز عباد اور قدرت رب العباد، کا اظہار ہوتا ہے، مانگنا، گڑگڑانا، عجز کا ظاہر کرنا لوازم عبودیت سے ہے جس طرح عظمت و کبریا، ہیبت و قدرت، جلال و استغنا لوازم معبودیت سے ہیں۔ لوازم عبودیت ظاہر ہے کہ عبادت ہیں۔ چنانچہ صاحب تفسیر نیشاپوری نے اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ کے ذیل میں خوب تصریح کردی ہے۔

اعلم ان الدعاء مصدر، دعوت ادعو، وقد تکون اسما تقول سمعت دعاءً کما تقول سمعت صوتاً، وحقیقۃ الدعاء استدعاء العبد ربہ جل جلالہ العنایۃ والاستمداد والمعونۃ، وقال جمھور العقلاء: ان الدعاء من اعظم مقامات العبودیۃ وانہ من شعائر الصالحین ودأب الانبیاء والمرسلین والقراٰن ناطق بصحتہ عن الصدیقین والاحادیث مشحونۃ بالادعیۃ الماثورۃ بحیث لامساغ للانکار ولا مجال للعناد۔ (مطبوعہ ایران ۱۲۸۰ھ ج ۱ ص ۱۹۳)

"خلاصہ یہ کہ دعا، مصدر ہے اور کبھی اسم بھی ہوتا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ میں نے دعا کو سنا جس طرح آواز کو سنا اور دعا کی حقیقت یہ ہے کہ عبد اپنے رب سے استدعا کرتا ہے اور اس مدد و معونت و عنایت کا خواستگار ہوتا ہے۔ جمہور عقلاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دعا بلند ترین مقامات عبودیت سے ہے یہ صالحین کا شعار اور انبیاء و مرسلین کا طریقہ رہا ہے۔ قرآن ناطق ہے کہ وہ صدیقین سے ثابت ہے، اور احادیث ادعیۂ ماثورہ سے بھری ہوئی ہیں، یہاں مجال انکار نہیں"

Marfat.com

جب دعا عبادت ہے تو پھر غیر اللہ سے دعا کرنا شرکِ صریح قرار پائیگا۔ لیکن قرآن کریم نے مخلوق سے مدد و معونت اور استغاثہ اس صورت میں جائز رکھا ہے کہ جب یہ ایسے امور میں کیا جائے جو ان کی قدرت و قوت کے احاطہ میں ہوں، دیکھو قرآن میں اس اسرائیلی کا قصہ مذکور ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کسی قبطی کے خلاف استغاثہ کیا تھا۔ فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِي مِنْ شِيعَتِهِ عَلَى الَّذِي مِنْ عَدُوِّهِ[1] (پ ٥٦) کسی دوسری جگہ دین کے کاموں میں مدد چاہنا اور مدد دینا واجب قرار دی گئی ہے: وَإِنِ اسْتَنْصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ[2] (پ ١٦) اسی طرح نیکی اور تقویٰ میں استعانت کا حکم دیا گیا ہے: تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ[3] (پ ٦)

جب مظلوم کسی ظالم کے خلاف حاکم کے پاس فریاد کرتا ہے، یا بیمار حکیم سے کہتا ہے کہ تم میرا علاج کر دو یا کسی مقدمہ میں وکیل سے مدد لیجاتی ہے تو اس طرح کی استعانت و استغاثہ منع نہیں۔ اسباب دنیویہ کا استعمال نہ صرف جائز بلکہ مامور بہ ہے لیکن بنیادی عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اسباب بالذات مؤثر نہیں حق تعالیٰ ہی ان میں اثر پیدا کرتے ہیں، ہر چیز اپنے اثر کے ظہور میں اللہ تعالیٰ کے اذن کی محتاج ہے۔ یہ عقیدہ باطل ہے کہ اشیاء کی وجود بخشی کے وقت ہی ان میں اثرات رکھ دیے گئے ہیں اور اسی راہ سے وہ اثر کرتی ہیں اور اب حق تعالیٰ کے حکم و امر کی حاجت نہیں، یا ان میں یہ قوت ہے کہ کبھی بھی اپنے آثار و احکام سے تخلف نہ کریں! دیکھو جب حضرت ابراہیمؑ آگ میں ڈالے گئے تو حق تعالیٰ نے آگ میں اثرِ احراق پیدا نہ کیا اور نہ جلے!

غرض آثارِ اشیاء حق تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہیں اور باراں صفت اشیاء پر برستے رہتے ہیں۔ اسی طرح مخلوق میں فعل کی جو قدرت ہوتی ہے وہ فعل کے وقت ہی عنایت ہوتی ہے اور اس سے فعل کا صدور ہوتا ہے، یہ نہیں کہ فعل کی قدرت پہلے ہی سے مخلوق میں موجود ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے افعال پر قادر ہے اور خالق کا محتاج نہیں، ورنہ یہ لازم آئیگا کہ تمام مخلوقات وجود میں آنے

---

[1] وہ جوان کی برادری کا تھا اس نے موسیٰ سے اس کے مقابلہ میں جو کہ ان کے مخالفین میں سے تھا مدد چاہی۔
[2] اگر وہ تم سے دین کے کام میں مدد چاہیں تو تمہارے ذمہ مدد کرنا واجب ہے۔ [3] نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی اعانت کرتے رہو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کرو۔

Marfat.com

کے بعد حق تعالیٰ سے مستغنی ہوں اور بے پرواہ، مستقل ہوں اور غیر محتاج، واللازم باطل فالملزوم مثلہ
ملا علی قاری ؒ نے شرح فقہ اکبر میں اسی چیز کی طرف اشارہ کیا ہے:۔

ثم اعلم ان ارادۃ العبد التی تقترن — یعنی جان لینا چاہیے کہ بندہ کا ارادہ جو فعل کے ساتھ
فعلہ و قدرتہ علیحال صنعہ — ہوتا ہے اور اس فعل کی قدرت وقت وقوع فعل،
مخلوقتان مع الفعل لا قبلہ ولا بعدہ — دونوں فعل کے ساتھ ہی مخلوق ہوتے ہیں نہ پہلے ہوتے ہیں نہ بعد۔

یعنی ارادہ، قدرت اور فعل سب مخلوق الٰہی ہیں، یہی عقیدہ ہے اہل سنت وجماعت کا، اور مبنی ہے اس آیتِ صریح پر: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (پ ۲۳ ع ۷) نیز اس آیت پر مَا تَشَاۤءُوْنَ اِلَّاۤ اَنْ يَّشَاۤءَ اللّٰهُ (پ ۲۹ ع ۲۶) نیز لا قوۃ الا باللہ پر۔

اس طرح عقیدہ کی تطہیر ہونے کے بعد ہی یہ سمجھ میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا نہ کوئی مغیث ہے اور نہ غیاث، نہ کوئی معین ہے اور نہ مستعان، ہماری ہر فریاد رسی علی الاطلاق حق تعالیٰ ہی سے ہے۔ دیکھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک منافق تھا جو مسلمانوں کو دق کیا کرتا تھا حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا چلو حضرتؐ سے استغاثہ کریں۔ آپ نے سُن کر فرمایا کہ مجھ سے استغاثہ نہ کرنا چاہیے استغاثہ تو اللہ ہی سے کرتے ہیں (رواہ الطبرانی) اگر کسی غیر کے ہاتھ سے کوئی چیز حاصل ہو جائے تو وہ مجاز ہے نہ کہ حقیقت، کیونکہ حقیقت اللہ ہی کے لیے ہے اور اسی کا اسم مبارک غیاث و مغیث ہے
تاہم امورِ اختیاریہ میں خلق سے استعانت جائز ہے مگر اسی عقیدہ کے ساتھ جس کا ابھی ذکر ہوا۔

جن امور میں سوا حق تعالیٰ کے کسی اور کو قدرت نہیں ان میں کسی اور کو پکارنا اور ان سے استغاثہ کرنا، یا اعانت چاہنا حرام یا شرک ہے جیسے رزق کا دینا[1]، مینہ کا برسانا[2]، بیمار کو شفا بخشنا[3]، ہدایت کرنا[4]، گناہ کا بخشنا[5] وغیرہ۔ اب پہلے بعض ان آیاتِ قرآنی پر بھی غور کر لو جن سے دعا کا عبادت ہونا صاف

[1] ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض۔ [2] وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا و ینشر رحمتہ۔ [3] واذا مرضت فھو یشفین۔ [4] انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء۔ [5] ومن یغفر الذنوب الا اللہ۔ [6] صفحہ ۱۳۸ مطبع مجتبائی دہلی

Marfat.com

ثابت ہوتا ہے۔

دیکھو حق تعالیٰ اپنے بندوں کو دعا کا حکم فرما رہے ہیں۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ؁ (پ۸ ع ۱۴) دوسری جگہ ارشاد ہے: وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ؕ اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (پ۸ ع ۱۴) ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں سے دعا چاہتے ہیں اسی سبب سے دعا عبادت ہے۔ اس کی مزید توثیق اس امر سے ہوتی ہے کہ غیر کو پکارنے سے منع فرما رہے ہیں فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (پ۲۹ ع ۱۱) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (پ۱۹ ع ۲۸) پھر دعا کو اپنے ہی لیے مخصوص کر رہے ہیں۔ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ (پ۱۳ ع ۸) اس طرح اثباتاً و نفیاً دعا کو حق تعالیٰ اپنی ہی ذات کے لیے مخصوص فرما رہے ہیں اور اپنے سوا کسی کو اس کے لائق نہیں قرار دے رہے ہیں یعنی منادیٰ صرف حق تعالیٰ ہی ہیں! پھر دعا کا حکم دے کر اس کو صاف طور پر عبادت قرار دیا گیا ہے: اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (پ ۶)

اسی طرح جب دعا کا عبادت ہونا آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہوا تو اب احادیثِ نبویہ پر ایک نظر ڈالو، جو دعا کو عین عبادت قرار دے رہی ہیں۔

(۱) عن نعمان بن بشیر قال قال رسول اللہ صلعم: الدعاء ھو العبادۃ" ثم قرأ و قال ربکم ادعونی استجب لکم (رواہ احمد والترمذی و ابوداؤد والنسائی وابن ماجہ) یعنی دعا عبادت ہی تو ہے، پھر آپ نے یہ آیت پڑھی ادعونی استجب لکم۔ اس آیت کے پڑھنے سے مراد یہ ہے کہ دعا کے عبادت ہونے کا سبب یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کا حکم کیا ہے۔

(۲) عن انس قال قال رسول اللہ صلعم "الدعاء مخ العبادۃ" (رواہ الترمذی) یعنی دعا مغز ہے عبادت کا، جس طرح مغز شے، شے کی حقیقت ہوتا ہے اسی طرح دعا یعنی خضوع و خشوع و تذلل کے ساتھ پکارنا عبادت کی حقیقت ہے اور اس لیے مخصوص ہے حق تعالیٰ ہی کے ساتھ جو مجیب الدعوات ہیں۔

ـ تم لوگ اپنے پروردگار سے دعا کیا کرو تذلل ظاہر کرتے بھی اور چپکے چپکے بھی اور واقعی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں

(۳) عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلعم: من لم یسأل اللہ یغضب علیہ (رواہ الترمذی) یعنی جو اللہ سے نہ مانگے اس سے اللہ ناراض ہوتا ہے جب اللہ سے نہ مانگنا غصہ کا باعث ہوتا ہے تو اس سے نہ مانگ کر اوروں سے مانگنا تو اور زیادہ غضب ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دعا اللہ تعالیٰ کو کس قدر محبوب ہے۔

جب دعا کا عبادت ہونا ثابت ہوگیا تو اب صاف ظاہر ہے کہ غیر اللہ سے دعا مانگنا شرک ہے، شرک فی العبادت ہے۔ اس مقصد کے لیے آیاتِ قرآنیہ کا پیش کرنا ضروری نہیں لیکن مزید تقویت کے لیے چند آیات پر غور کرلو:

(۱) وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُكَ وَلَا یَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ یعنی مت پکار اللہ کے سوا ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ نقصان پھر اگر تو ایسا کرے تو تو بھی اسی وقت ظالموں میں ہو جائیگا۔ (پ ۱۱ ع ۱۶)

جلبِ منفعت و دفع مضرت کے لیے غیر اللہ کو دور دور سے پکارنا، اپنی حاجتوں اور ضرورتوں کو ان سے عرض کرنا اور اس طرح ان کی پرستش کرنا بڑے ظلم وستم کی بات ہے، کیونکہ جس اللہ کی قدرت میں بندہ کا نیک و بد نفع و نقصان سب کچھ ہے اس پروردگار کو چھوڑ کر، اس سے منہ موڑ کر ایسی ہستیوں کی طرف متوجہ ہونا اور ذلت و فقر کی نسبت ان سے جوڑنا جو نہ کسی کے نفع پر قادر ہیں اور نہ نقصان پر، اس سے بڑھ کر دنیا میں ظلم وستم کیا ہو سکتا ہے! شرک ہی سب سے بڑا ظلم ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ (پ ۲۱ ع ۱۱)

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ بعض مفسرین نے "دون اللہ" اور "غیر اللہ" کی توجیہ میں اصنام و اوثان کا ذکر کر دیا ہے۔ اس لیے بعض شرک پسندوں نے یہ سمجھ لیا کہ شرک اس وقت ہوگا جب بتوں سے دعا کی جائے۔ انبیاء و اولیاء سے دعا کرنا، مرادیں مانگنا شرک نہیں۔ یہ صریحاً غلط ہے اور اس کی دو وجہیں ہیں۔

(۱) علمِ اصول کا یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ "العبرۃ بعموم الالفاظ لا بخصوص المواد" یعنی اعتبار

عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ موارد کا، غیر اللہ اور دون اللہ دونوں عام الفاظ ہیں۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوقات ہیں سب ان میں داخل ہیں، خواہ ولی نبی ہو، یا بھوت پری۔ چنانچہ بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں کہ قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُم مِّن دُونِهِ لکھتے ہیں کہ قل ادعوا الذین زعمتم انھم الھۃ من دونہ کالملئکۃ والمسیح وعزیر یعنی ان لوگوں کو پکارو جن کو تم نے معبود سمجھ رکھا ہے اللہ کے سوا جیسے ملائکہ، مسیح و عزیز۔ اس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ جو ملائکہ اور انبیاء کو پکارے وہ بھی مشرک ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کی ویسی ہی زجر و توبیخ کی ہے جیسی کہ بت پرستوں کی کی ہے۔ اس عمومِ الفاظ کے اعتبار سے صاحب جلالین نے اکثر مقامات پر دون اللہ کا ترجمہ غیر اللہ سے کیا ہے۔

(۲) جیسا کہ ہم نے اوپر تصریح کی ہے، کفار نے اپنے بت اپنے اکابر (انبیاء و اولیاء) ہی کے نام پر تراشے تھے اور ان کی بت پرستی کا منشا ان ہی اکابر کی تعظیم تھی، لہٰذا وہ دراصل پتھروں اور درختوں کی عبادت نہیں کر رہے تھے بلکہ انبیاء و اولیاء و صلحاء کو پوج رہے تھے۔

غرض غیر اللہ و دون اللہ سے مراد نہ صرف بت ہیں بلکہ انبیاء، اولیاء سب اس میں شامل ہیں۔ اعتبار عمومِ الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص موارد کا۔ اور عقلاً غور کرو کہ انبیاء و اولیاء غیر اللہ ہیں کہ عین اللہ؟ جب غیر اللہ کی عبادت شرک ہے تو صنم و وثن، نبی و ولی، پیر، شہید، بھوت، پری سب حرمتِ عبادت میں مساوی ہیں اور ان میں تفریق باطل ہے۔ اگر ہم تفریق کے قائل ہو جائیں کہ عبادت من دون اللہ کی حرام و شرک ہے بخلاف عبادت اولیاء و انبیاء کے تو لازم آتا ہے کہ انبیاء اور اولیاء عین اللہ ہیں اللازم باطل فالملزوم مثلہ۔

(۱) إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (پ ۹ ع ۱۴) یعنی واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں سو تم ان کو پکارو، پھر ان کو چاہیے کہ تمہارا کہنا کر دیں اگر تم سچے ہو!

اس آیت میں اس امر کی صاف طور پر تصریح ہے کہ مشرکین اللہ کے سوا بعض اولیاء

Marfat.com

انبیاء اور ملائکہ کو دفعِ مضرت و جلب منفعت کے لیے پکارا کرتے تھے اس لیے ان سے کہا گیا کہ جن کو تم امداد کے لیے پکارتے ہو وہ بھی تمہارے مانند بندے ہیں محض اصنام و اوثان پر عباد کا اطلاق نہایت بعید معلوم ہوتا ہے اور اگر مجازاً اصنام بھی مراد لیں تو امثالکم کا لفظ اس سے ابا کرتا ہے۔ اسی لیے مقاتل رح نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ مراد ان عباد سے ملائکہ ہیں اور اس آیت کے مخاطب وہ ہیں جو ملائکہ کو پوجتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مقبول بندوں سے دعا کرنے والا بھی مشرک ہے اور مردود، اس لیے کہ وہ من دون اللہ سے دعا کرتا ہے اور مِنْ دُوْنِ اللہ عام ہے اور اس میں تمام مخلوقات شامل ہیں، مقبول ہوں یا مردود۔

(۲) قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝ یعنی جن کو تم خدا کے سوا قرار دے رہے ہو ذرا ان کو پکارو تو سہی سو وہ تم سے نہ تکلیف کو دور کرنے کا اختیار رکھتے ہیں نہ ان کے بدل ڈالنے کا، یہ لوگ جن کو مشرکین پکار رہے ہیں وہ خود ہی اپنے رب کی طرف ذریعہ ڈھونڈھ رہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرب بنتا ہے اور وہ اس کی رحمت کے اُمیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔"

اس آیت میں اس امر کی خوب تصریح کی گئی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں کہ کسی کی مصیبت اور تکلیف کو دور کر سکے یا اس کو راحت و نعمت میں بدل دے، کوئی نبی، ولی، فرشتہ وغیرہ کسی کی مصیبت و ضرر کو دور کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ اور یہ احمق مشرک جن ہستیوں کو اچھے بُرے کا مختار جان کر پکارتے ہیں ان کا خود یہ حال ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے اُمید رکھتے ہیں اور اسی کے عذاب سے لرزاں و ترساں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سے مراد خدا کے مقبول بندے ہیں نہ کہ اصنام و اشرارِ عباد، کیونکہ حق تعالیٰ سے اُمید و رجا رکھنا، اس کے قرب کا طالب ہونا اشرار سے ممکن نہیں اور اصنام سے تو اور زیادہ غیر ممکن ہے پھر جب مقبول بندوں کو پکارنے اور ان سے اپنے مصائب کا دفیعہ چاہنے والوں پر یہ عتاب ہو رہا ہے تو مردودین کے

Marfat.com

ماننے والوں کا کیا حال ہوگا۔

تفسیرِ بیضاوی میں اس آیت کی تفسیر یوں کی گئی ہے۔ قل ادعوا الذین زعمتم انھم الھۃ من دونہ کالملائکۃ والمسیح وعزیر۔ فلا یملکون فلا یستطیعون کشف الضر عنکم کالمرض والفقر ولا تحویلا ولا تحویل ذالک منکم الی غیرکم۔[ل] دیکھو بیضاوی نے صراحت کردی ہے کہ ملائکہ اور مسیح اور عزیر تک "کشف ضر" یعنی مرض وفقر وقحط یا مصائب وآفات کے رفع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے اور نہ اس کو بطور خود پھیر سکتے ہیں۔ جب ان ابرارِ کبار کا یہ حال ہو تو ان سے کم درجہ کے لوگوں کا کیا پوچھنا!

(۳) یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْھُمُ الذُّبَابُ شَیْئًا لَّا یَسْتَنْقِذُوْہُ مِنْہُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۔ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ (پ ۱۷ ع ۴) یعنی اے لوگو! ایک عجیب بات بیان کی جاتی ہے اس کو کان لگا کر سنو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن کو تم لوگ خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو، وہ ایک مکھی کو تو پیدا کر ہی نہیں سکتے گو سب کے سب بھی جمع ہو جائیں اور اگر ان سے مکھی کچھ چھین لے جائے تو اس کو اس سے چھڑا نہیں سکتے۔ ایسا عابد بھی پچر اور ایسا معبود بھی پچر۔ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی تعظیم کرنا چاہیے تھی وہ نہ کی۔ اللہ تعالیٰ بڑی، قوت والا سب پر غالب ہے۔"

ان آیات سے یہ امر روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جو لوگ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے دعا مانگتے اور اس کی عبادت کرتے ہیں وہ صریح گمراہی اور ضلالت میں مبتلا ہیں، ان کا مذہب باطل ہے، کیونکہ

(۱) جن کی یہ عبادت کر رہے ہیں خواہ وہ اصنام ہوں یا ملائکہ عظام یا انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام وہ ایک مکھی تک کو پیدا نہیں کر سکتے، پھر ان سے کسی ایک چیز کا مانگنا اور اس کے لیے

[ل] تفسیر بیضاوی ص ۲۰۷، مطبوعہ دار الطباعۃ عامرہ قسطنطنیہ ۱۳۰۳ھ

Marfat.com

گڑگڑانا جس کو پیدا کرنے کی ضرورت ہو کیسی جہالت ہے! جب وہ سب کے سب جمع ہو کر حقیر سے حقیر چیز کو پیدا کرنے کے قابل نہیں تو پھر غور کرو کہ انفرادی حیثیت سے وہ کس قدر عاجز ٹھہرتے ہیں (۱) اب رہا ان سے ایسی چیز کا طلب کرنا جس کے پیدا کرنے کی ضرورت نہیں سو یہ بھی باطل ہے، کیونکہ حق تعالیٰ نے جو چیز جس کے لیے مقدر کر دی ہے اس میں نہ وہ ایک ذرہ کا اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ اس سے ایک ذرہ کی کمی، وہ کسی چیز کو ایک مکھی سے بھی چھین کر دوسرے کو دینے کی سکت نہیں رکھتے اور نہ آپ ہی لینے کی قوت، تو پھر ان سے عرضِ حاجات اور طلبِ مرادات کرنا کتنی حماقت ہے! اور آخر میں یہ بھی فرما دیا گیا کہ ان مشرکین نے حق تعالیٰ کی قدر جیسی چاہیے ویسی نہ سمجھی، اگر سمجھتے تو حق تعالیٰ کو چھوڑ کر ان بیچاروں سے کہ جن سے ایک مکھی تک نہیں بن سکتی کاہے کو حاجتیں مانگتے اور مرادیں طلب کرتے "خاک پڑے ایسی سمجھ پر جو بادشاہ کے روبرو فقیر سے بھیک مانگے" اھ

شرمت باد کہ من بسویت نگراں   باشم تو نہی چشم بسوئے دگراں   (جامی)

یہاں من دون اللہ سے محض اصنام اور بت مراد لینا کسی طرح درست نہیں۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے کہ یہ لفظ عام ہے۔ اللہ کے سوا جتنی مخلوق ہے سب اس میں شامل ہے۔ علاوہ ازیں حق تعالیٰ نے انہیں قابلِ عبادت اور لائقِ دعا اس سے نہیں قرار دیا کہ وہ کسی شے کی تخلیق پر قادر نہیں۔ لن یخلقوا میں کیؐ اصل میں نفیِ مستقبل کے لیے آیا ہے اور اس کی نفی موکد ہوتی ہے جس طرح تمام اہلِ لغت اور مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ علت عام ہے تمام مخلوق کو خواہ انبیاء ہوں یا اولیاء، اغنیاء ہوں یا اشقیاء ان میں سے کسی کو تخلیق کی قابلیت نہیں۔ اور یہ تو ہم بتا چکے ہیں کہ بت پرست اپنے بتوں کو بذاتہ معبود نہیں سمجھتے تھے بلکہ مقصود ان کی تعظیم سے اولیاء و انبیاء کی تعظیم تھی جن کی صورتوں پر وہ مورتیں بنائی گئی تھیں۔ چنانچہ امام رازیؒ نے اس کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"فالقوم کانوا یعتقدون فیھا انھا طلسمات موضوعۃ علی صورۃ الکواکب

اوانها تماثیل الملائکۃ والانبیاء المتقدمین وکانوا یعظمونها علیٰ ان تعظیمها یوجب تعظیم الملائکۃ واولئک الانبیاءؑ [1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو تعظیم و عبادت مخصوص بحضرت حق تعالیٰ جل شانہٗ ہو اس کو انبیاء و اولیاء کے ساتھ متعلق کرنا ایسا ہی شرک ہے جیسا کہ بتوں کے ساتھ کرنا ان وجوہ کی بنا پر ان آیات کی تخصیص بتوں کے ساتھ باطل ہے اور نتیجہ ظاہر ہے کہ جس طرح بتوں سے دعا کرنا شرکِ جلی ہے بالکل اسی طرح نبی و ولی سے دعا کرنا بھی شرکِ جلی ہے۔

(۵) لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ۭ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۗءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ۭ وَمَا دُعَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ (پ ۱۳ ع ۸) "سچا پکارنا اسی کے لیے خاص ہے اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا کہ پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوتا ہے کہ وہ اس کے منہ تک آ جائے اور وہ اس کے منہ تک آنے والا نہیں اور کافروں کی جتنی پکار یا درخواست ہے سب گمراہی ہے"

یعنی پکارنا اسی کو چاہیے، اور دکھ مصیبت میں دعا اسی سے کرنی چاہیے جو ہر قسم کے نفع ضرر کا مالک ہو، عاجز و فقیر کو پکارنے اور اس کے سامنے گڑگڑانے سے کیا حاصل؟ حق تعالیٰ کے سوا کون ہے جس کے قبضہ میں اپنا یا دوسروں کا نفع و ضرر ہو، غیر اللہ کو اپنی مدد کے لیے بلانا ایسا ہے جیسے کوئی پیاسا کنوئیں کے منہ پر کھڑا ہو کر پانی کی طرف ہاتھ پھیلائے اور خوشامد کرے کہ تیرے منہ میں پہنچ جا۔ ظاہر ہے کہ قیامت تک پانی اس کی فریاد کو پہنچنے والا نہیں، بلکہ اگر پانی اس کی مٹھی میں ہو تب بھی خود چل کر منہ تک نہیں جا سکتا۔

غور کرو کہ اس آیت میں "دعوت" یعنی دعا، کی تخصیص حق تعالیٰ ہی کے ساتھ کی گئی ہے اس لیے کہ جار مجرور جو معمول ہے "دعوت" کا وہ اپنے عامل پر مقدم ہے اور تقدیم معمول کی مفید حصر ہوتی ہے۔

---

[1] دیکھو تفسیر کبیر اور مقامات کے لیے ج اول ص ۳۲۲ و نیز ج ۴ ص ۱۷۰ - نیز ج ۶ ص ۳۳۲

Marfat.com

اس پر علمائے بیان کا اتفاق ہے اور مفسرین کا اجماع، چنانچہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ میں بھی یہی صورت ہے۔ یہاں بھی حصر ہے۔ دعا کا تعلق صرف حق تعالیٰ ہی کے ساتھ چاہیے اور عبادت کا بھی۔ اسی تخصیص کو مثال سے واضح کیا گیا کہ جو حق تعالیٰ کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں وہ ان ناتوانوں کے مانند ہیں جو پیاس لگنے پر کنوئیں کے منہ پر جا کر پانی کو پکارتے ہیں۔ ہر ایسی پکار کو کافروں کی پکار قرار دیا اور اس کا نتیجہ اور انجام "ضلال" یا گمراہی و بطلان و ناامیدی ٹھیرایا۔

(٦) اِذۡ قَالَ لِاَبِیۡهِ وَقَوۡمِهٖ مَا تَعۡبُدُوۡنَ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اَصۡنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیۡنَ قَالَ هَلۡ یَسۡمَعُوۡنَكُمۡ اِذۡ تَدۡعُوۡنَ اَوۡ یَنۡفَعُوۡنَكُمۡ اَوۡ یَضُرُّوۡنَ (پ ۱۹ ع ۹) یہ گفتگو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان ہوئی "حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم سے فرمایا کہ تم کس چیز کی عبادت کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم بتوں کی عبادت کیا کرتے ہیں اور ہم ان ہی پر جمے بیٹھے رہتے ہیں۔ ابراہیمؑ نے فرمایا کہ کیا یہ تمہاری سنتے ہیں جب تم ان کو پکارا کرتے ہو، یا یہ تم کو کچھ نفع پہنچاتے ہیں، یا یہ تم کو کچھ ضرر پہنچا سکتے ہیں؟

ان آیات سے واضح ہے کہ غیرِ خدا کو پکارنا، اُن سے اپنی حاجتیں طلب کرنا مشرکین کا شیوہ ہے اور سچ تو یہ ہے کہ جو شخص اللہ کو چھوڑ کر کسی اور سے دعا کرے یا اس سے اُمیدِ نفع و ضرر کی بلا استقلال رکھے وہ بت پرست ہے اور جس کے ساتھ اس نے فقر و ذلت کی یہ نسبت قائم کر رکھی ہے وہ اس کا بت ہے۔ حضرت سعدی نے کیا خوب کہا ہے ؎

دل اندر صمد باید اے دوست بست! که عاجز تر است از صنم ہر کہ ہست!

اسی لیے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا تھا۔ لیس الشرك عبادة الاصنام بل هو متابعتك هواك وان تختار مع ربك عزوجل شيئا سواه من الدنيا وما فيها والاٰخرة وما فيها فما سواه عزوجل غيره فاذا ركنت الى غيره فقد اشركت به عزوجل غيرهٗ ۔[۱]

---

[۱] شرک کچھ بت پرستی نہیں ہے بلکہ خواہشِ نفس کی پیروی ہے اور حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے کسی شے کو ان کے سوا دنیا آخرت و مافیہما سے اختیار کرنا ہے کیونکہ جو کچھ حق تعالیٰ کے سوا ہے وہ غیراللہ ہے، سو جب غیر کی طرف میل ہو تو گویا اس نے غیر کو اللہ کا شریک ٹھہرایا۔ (فتوح الغیب مقالہ ہفتم)

غیرِ حق ہرچہ دولت را بر بود — سترِ راہ تو ہماں خواہد بود

غیرِ حق یک ذرہ کاں مقصودِ تست — تیغ لا بر کش کہ آں معبودِ تست

مشرکین کے طریقے کے خلاف موحد کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ ہی سے مانوس ہوتا ہے، رنج و غم، درد و الم میں اسی کو پکارتا ہے، اسی سے اُمید و رجا رکھتا ہے، اسی سے سکون و بردِ قلبی حاصل کرتا ہے۔

مرا بیگانگی از خلق با حق آشنا کردہ — بطبعِ من بکس کم ساختن بسیاری سازد!

مومن موحد کی اسی شان کو حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں: وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (پ۲ع۳) یعنی "ایسے صابرین کو بشارت سُنا دیجیے کہ ان پر جب کوئی مصیبت پڑتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اللہ تعالیٰ ہی کی ملک ہیں اور ہم سب اللہ تعالیٰ ہی کے پاس جانے والے ہیں"۔ غور کرو یہاں "مصیبت" اسم نکرہ ہے اور اذا بھی عام ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر مصیبت و آفت میں، ہر درد و الم میں، ہر رنج و غم میں حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے ہیں، اسی کو پکارتے ہیں، اسی سے فریاد کرتے ہیں کہ "اللّٰھم لک الحمد والیک المشتکی وبک المستغاث وانت المستعان ولا حول ولا قوۃ الا باللہ"[1] "حق تعالیٰ آپ ہی کے لیے تمام تعریف سزاوار ہے، آپ ہی کی طرف ہماری شکایت ہے اور آپ ہی سے فریاد ہے اور آپ ہی مددگار ہیں، ہمیں کوئی دوسرا نہ بچا سکتا ہے اور نہ سوائے آپ کے کسی میں حرکت ہے نہ قوۃ"

یارب ز تو یافت صورت آب و گلِ من — الطافِ تو شد پناہ جان و دلِ من

(درد)

آسانی کار از تو بد حاصلِ من — ہم از کرمِ تو حل شود مشکلِ من!

اسی آیت میں آگے صابرین کو جو بشارت دی گئی ہے اس کی تفصیل فرماتے ہیں: أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ۔ یعنی "ان ہی لوگوں پر خاص رحمتیں ہیں ان کے پروردگار کی طرف سے اور عام رحمت بھی ہے اور یہی لوگ ہیں ہدایت یافتہ" اسی

---

[1] دعائے موسوی ہے۔ دیکھو مجمع الزوائد کتاب الادعیہ ص ۱۸۳ ج ۱۰ طبع مصر ۱۳۵۲ھ

سے تعریضاً لازم آتا ہے جو مصیبت و غم کے وقت غیر اللہ کو یاد کرتے ہیں، ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور ان ہی کو اپنا مددگار اور پناہ گاہ سمجھتے ہیں وہ نہ خاص رحمتوں کے لائق ہیں اور نہ عام رحمت کے مستحق اور نہ ہدایت کے قابل، یعنی درد و غم میں غیر اللہ کی طرف شکایت لے جانے والے، ان ہی کو اپنی جان و دل کی پناہ سمجھنے والے حق تعالیٰ کی نفریں کے لائق، غضب کے قابل اور ضلالت میں گرفتار ہیں!

ذرا الفاظ کی نزاکت پر بھی غور کرو: اولٰئِكَ کے بعد ضمیر منفصل لائی گئی ہے اور ھم المھتدون فرمایا گیا ہے، علمار بیان کا اتفاق ہے کہ یہ ضمیر جہاں مبتدا و خبر میں آتی ہے مبتدا کو خبر میں منحصر کر دیتی ہے۔ اب اس سے یہ لازم آتا ہے کہ ہدایت سے وہی لوگ مختص ہیں جو وقتِ غم و ہنگامِ مصیبت حق تعالیٰ ہی کو یاد کرتے ہیں اور ان ہی سے فریاد کرتے ہیں اور جب ہدایت کا انحصار ان ہی پر ہوا تو ضلالت یا گمراہی ان کے غیر میں منحصر ہوئی! ذٰلك ھو الخسران المبین۔

انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کی زندگی پر غور کرو۔ جب ان پر مصائب کا نزول ہوتا (اور بعجواے اشد الناس بلاءً الانبیاء مصائب ان ہی پر زیادہ نازل ہوئی ہیں) تو ان کا رُخ حق تعالیٰ ہی کی طرف پلٹتا، ان کے ہاتھ حق تعالیٰ ہی کے سامنے پھیلتے، ان کا سر حق تعالیٰ ہی کے قدموں پر جھکتا تھا۔ دیکھو حضرت آدم علیہ السلام اپنی لغزش سے واقف ہو کر انتہائی حزن و الم کی حالت میں حق تعالےٰ ہی کو پکارتے ہیں:۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ	اے ہمارے رب ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ
لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ	ہماری مغفرت نہ کرینگے اور ہم پر رحم نہ کرینگے تو واقعی
الْخٰسِرِیْنَ (پ ۶ع)	ہمارا بڑا نقصان ہو جائیگا۔

یارب اگر از جہل خطا شد کارم — جاں از کرمت شاد بود بسیارم

زامید تو بسکہ دل بود بیارم — گویند کہ نیست از گنہ آزارم (درد)

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی سرکش قوم کے جور و ستم سے عاجز اور تنگ آکر حق تعالیٰ ہی سے فریاد کی کہ

اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ (پ ۲۷ ع ۸)	میں درماندہ ہوں میرے پروردگار آپ انتقام لیجیے۔

Marfat.com

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی تھکن، عجز و درماندگی کی حالت میں حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کی اور پکارا:

رَبِّ اِنِّیْ لِمَآ اَنْزَلْتَ اِلَیَّ مِنْ خَیْرٍ فَقِیْرٌ (پ۲۰ ع ۶)
اے میرے پروردگار جو نعمت بھی آپ مجھ کو بھیج دیں میں اس کا حاجتمند ہوں۔

غم نالکم واز درِ تو باغم نہ روم
جز شاد و امیدوار و خرم نہ روم
از درگہ ہمچو تو کریمے ہرگز
نومید کسے نہ رفت و من ہم نہ روم (سرمد)

اور حضرت ایوب علیہ السلام نے ہجوم غم والم کے وقت حق تعالیٰ ہی کو اپنی پناہ گاہ سمجھا اور التجا کی۔

اِنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (پ۱۷ ع ۶)
مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔

یارب کرم تو گر نباشد مددم
خونِ جگر از دیدہ رود تا ابدم!

اور حضرت یونس علیہ السلام نے غم واندوہ کی تاریکیوں میں حق تعالیٰ ہی کو پکارا کہ

لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (پ۱۷ ع ۶)
(حق تعالیٰ) آپ کے سوا کوئی معبود نہیں، آپ پاک ہیں، میں بیشک قصوروار ہوں۔

یارب زکرم بخش تقصیر مرا
مقبول بکن نالۂ شبگیر مرا
پیری و گناہ ماجرائیست عجیب
لطفِ تو کند چارۂ تدبیر مرا (سرمد)

اور حضرت یونس ہی کے متعلق ارشاد ہے: فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖٓ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ (پ۲۳ ع ۹) یعنی اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتے تو قیامت تک اسی مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔ دیکھو لبث کو لام تاکید سے موکد فرمایا گیا ہے اور مدارِ نجات تسبیح الٰہی کو قرار دیا گیا ہے نہ کہ کسی نبی، ولی کے نام کا ختم پڑھنے، ان کو پکارنے اور اپنا دردِ غم ان کے سامنے رکھنے کو!

قرآن کریم میں ایک جگہ (پ۳ ع ۲)، حق تعالیٰ ہمیں جنتیوں کی حالت کی خبر دے رہے ہیں کہ جب وہ عالمِ شہادت، عالمِ برزخ اور عالمِ حشر کی ہزاروں مصیبتوں اور بلاؤں، آفتوں اور

مشکلوں کو اٹھا کر بالآخر جنت میں داخل ہونگے تو کہینگے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ ۔ یعنی حق تعالیٰ ہماری ہدایت نہ کرتے تو اس مقامِ راحتِ ابدی تک ہماری رسائی کبھی نہ ہوتی! زندگی کے ہر قدم پر اور موت کے بعد ہر مرحلہ پر حق تعالیٰ ہی کا دستِ کرم ہماری تائید کرتا ہے اسی لیے نصیحت فرمائی: وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ هُوَ مَوْلٰىكُمْ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ (پ ۱۷ ع ۱۰) یعنی حق تعالیٰ ہی کو مضبوط پکڑے رہو وہی تمہارے کارساز ہیں کیسے اچھے کارساز ہیں اور کیسے اچھے مددگار! اب انہیں چھوڑ کر کسی اور کی طرف رخ کرنا بے شرمی نہیں تو کیا ہے!

اے آنکہ بقبلۂ بتاں روست ترا — بر مغز چرا حجاب شد پوست ترا

دل در پے این و آن نہ نیکوست ترا — یک دل داری بس است یک دوست ترا (جامی)

قرآنِ کریم کی ان تمام تصریحات کے بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی طرف توجہ کرتے ہیں اور نہایت اختصار کے ساتھ چند دعاؤں کو پیش کر کے واضح کرتے ہیں کہ درد و رنج، غم و ہم، آفت و مصیبت کے وقت سوائے حق تعالیٰ کے کسی کو یاد نہ کرنا چاہیے، ان ہی کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور ان ہی کا نام زبان پر آنا چاہیے! اس کے بعد امتثالِ امر میں اسبابِ دنیویہ کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت تھی کہ جب بھی کسی قسم کی پریشانی لاحق ہوتی تو نماز پڑھتے، چنانچہ مروی ہے اذا حزبہ امر فزع الی الصلوٰۃ (رواہ احمد) اور ظاہر ہے کہ نماز میں سوائے تسبیح و تہلیل، تحمید و تقدیس کے اور کیا ہوتا ہے۔ ترمذی میں ہے کہ آپ کو جب کوئی سخت کام پیش آتا تو فرماتے: "یا حیّ یا قیوم برحمتک استغیث" اور دوسری حدیث میں ترمذی کی مذکور ہے کہ جب کسی امر کے متعلق فکر ہوتی تو آسمان کی طرف نظر کرتے اور کہتے: سبحان اللہ العظیم! جب دعا میں کوشش کرتے تو فرماتے: یا حیّ یا قیوم۔ آپ نے فرمایا کہ غمگین کی دعا یہ ہے: اللّٰھم رحمتک ارجو فلا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین واصلح لی شانی کلہ لا الٰہ الا انت[1]۔ عمیس کی صاحبزادی اسماء جو حضرت

[1] اے اللہ مجھے بس تیری رحمت ہی کا آسرا ہے، تو مجھے پل بھر کے لیے بھی میرے نفس کے حوالہ نہ کر اور میرے سب کام درست کر دے۔

عائشہ صدیقہؓ کی بہن تھیں، کو فرمایا، کیا تجھے چند ایسی باتیں بتلادوں جو غم کے وقت کہا کرے ؟ کہہ اللہ اللہ ربی لا اشرك به شيئا (سات بار) آپ نے ایک انصاری کو جن کا نام ابو امامہؓ تھا۔ غیر وقت نماز مسجد میں دیکھ کر پوچھا کہ اس وقت تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ قرض کے بار کے نیچے دبا جارہا ہوں متفکر اور پریشان ہوں۔ فرمایا صبح و شام اس دعا کو پڑھا کرو:۔ اللهم انی اعوذ بك من الهم والحزن واعوذ بك من العجز والكسل واعوذ بك من الجبن والبخل واعوذ بك من غلبة الدين وقهر الرجال۔ ایک مرتبہ فرمایا۔ من لزم الاستغفار جعل الله له من كل هم فرجا ومن كل ضيق مخرجا ورزقه من حيث لا يحتسب۔ یعنی جو ہمیشہ استغفار پڑھا کرے تو اللہ اس کی ہر مصیبت کو دفع کر دیتا ہے اور ہر تنگی سے اس کو نکال لیتا ہے اور ایسی جگہ سے رزق دیتا ہے جہاں سے گمان تک نہ ہو (رواہ احمد و ابو داؤد و ابن ماجہ عن ابن عباس) ایک اور موقع پر فرمایا کہ جب کسی پر غم و مشکل لوٹ پڑے تو کہا کرے لا حول ولا قوة الا بالله (کذا فی المشکوٰۃ)

دیکھو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ ما اوذی نبی ما اوذیت یعنی جتنی اذیت مجھے پہنچی اتنی کسی نبی کو نہیں پہنچی مگر کیا کسی اذیت یا تکلیف کے وقت آپ نے کسی نبی کو یاد کیا کہ یا آدم ابونا، یا نوح نبینا، یا ابراہیم خلیل اللہ ؟ یا ہر وقت اسی ذات پاک سے فریاد کی جو تمام مشکلات کو رفع کرتی ہے جو "فارج ہم ہے" "کاشف غم ہے" جو مجیب دعوۃ المضطرین[1] ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کو آپ نے تعلیم فرمائی تھی کہ "یا غلام احفظ الله يحفظك احفظ الله تجده تجاهك، واذا سألت فاسئل الله واذا استعنت فاستعن بالله واعلم ان الامة لو اجتمعت على ان ينفعوك بشيء لم ينفعوك الا بشيء قد كتبه الله لك ولو اجتمعوا على ان يضروك بشيء لم يضروك الا بشيء قد كتبه الله عليك رفعت الاقلام وجفت الصحف (اخرجه الترمذی عن ابن عباس) یعنی اے لڑکے اللہ کو یاد رکھو وہ تجھ کو یاد رکھیگا۔ اللہ کو یاد رکھ کر تو اس کو اپنے سامنے پائیگا اور جب تو کچھ

---

[1] یہ حدیث کے الفاظ ہیں۔ مصیبت زدہ یہ دعا پڑھے: اللهم فارج الهم، كاشف الغم، مجيب دعوة المضطرين، رحمن الدنيا ورحيمها، انت ترحمني، فارحمني برحمة تغنيني بها عن رحمة من سواك (رواه الحاكم وابن مردويه عن ابی بكر صدیقؓ)

مانگے تو اللہ ہی سے مانگ اور جب تو مدد چاہے تو اللہ ہی سے چاہ (ایاک نعبد و ایاک نستعین) اور یقین کر لے کہ اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے فائدہ پہنچائیں جو اللہ نے تیرے لیے مقدر نہیں کی تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائینگے مگر جتنا کہ اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا، اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں جو اللہ نے تیرے لیے مقدر نہیں کی تو اس پر قدرت نہ پائینگے، قلم اٹھا لیے گئے اور خشک ہو گئیں کتابیں" دیکھو اس حدیث میں کس وضاحت و صراحت کے ساتھ استعانت عن غیر اللہ سے منع کیا گیا ہے اور کس طرح سبھوں سے توڑ کر صرف حق تعالیٰ ہی سے جوڑا گیا ہے! کفی باللہ وکیلا!

از خدا خواہم و ز غیر نخواہم بخدا — کہ نیم بندۂ دیگر نہ خدائے دگر ست!

یہ کہہ کر کہ ساری دنیا تجھے فائدہ نہیں پہنچا سکتی (کیونکہ وہ ایک مکھی کی تخلیق پر بھی قادر نہیں) احتیاج کی ساری نسبتوں کو جو غیر اللہ کے ساتھ قائم کی جا سکتی ہیں ایک ہی ضرب میں کاٹ دیا گیا ہے اور پھر یہ سنا کر کہ ساری دنیا تجھے ضرر پہنچانے پر قادر نہیں (کیونکہ وہ مکھی سے بھی کوئی شے چھین نہیں سکتی) غیر اللہ کے خوف کو سینے سے بالکل دور کر دیا گیا ہے اور اس طرح ہمیں خوف و حزن کی ان زنجیروں سے بالکل آزاد کر دیا گیا ہے جو غیر اللہ ہمارے جہل و شرک کی وجہ سے ہماری گردن میں ڈال سکتا تھا: اب میں توحید ہی کی بدولت آزادی و جرأت کے ساتھ باواز بلند کہہ سکتا ہوں:

لو الثقلان الانس والجن اجمعوا — یریدون ایلاما لاصغر نملۃ[1]

یکون لھا رب السموات ناصرا — لما ظفروا منھا بادنی مضرۃ

کیا یہ آزادی بے خوفی یا استقلال ان شرک پسند بت پرستوں یا گور پرستوں کو حاصل ہو سکتا ہے جو ہر پیر اور شہید کو نافع و ضار سمجھ کر ان سے اپنے فقر و احتیاج کی نسبت کو جوڑتے ہیں، ان ہی کے آگے سر نیاز خم کرتے ہیں اور ان ہی کے سامنے دست سوال پھیلاتے ہیں اور اپنے رسول کی

---

[1] اگر جن و انس دونوں جمع ہو کر چھوٹی سی چھوٹی چیونٹی کو دکھ پہنچانا چاہیں اور حق تعالیٰ اس کے ناصر و مددگار ہوں تو وہ اس کو ادنیٰ مضرت بھی نہیں پہنچا سکتے۔

Marfat.com

اس نصیحت کو بھول جاتے ہیں کہ

یسأل احدکو ربہ حاجتہ کلھا حتی	ہر کسی کو چاہیے کہ اپنی ساری حاجتیں اپنے پروردگار
یسأل الملح وحتی یسألہ شسع	ہی سے مانگے یہاں تک کہ نمک بھی اسی سے مانگے
نعلہ اذا انقطع (اخرجہ الترمذی عن انس)	اور جوتی کا تسمہ بھی اگر ٹوٹ جائے!

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جنھیں افسوس ہے کہ قادریہ کی ایک بڑی تعداد نے اپنا معبود مقرر کر رکھا ہے۔ مصائب میں ان ہی کو پکارتی ہے، آفات کے دور کرنے کے لیے ان ہی کے نام کا جھنڈا اپنے گھروں میں کھڑا کرتی ہے) حدیث ابن عباسؓ کو جو اوپر مذکور ہوئی اپنی فتوح الغیب میں نقل فرماتے ہیں اور اس کے بعد نصیحت کرتے ہیں کہ: فینبغی لکل مؤمن ان یجعل ھذا الحدیث مرآۃ لقلبہ وشعارہ ودثارہ وحدیثہ فیعمل بہ فی جمیع حرکاتہ وسکناتہ حتی یسلم فی الدنیا والاٰخرۃ ویجد العزۃ فیھما برحمۃ اللہ تعالیٰ۔ یعنی ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیث نبوی کو اپنے قلب کے لیے آئینہ بنالے تاکہ اس کے مضمون میں اپنے دل کا حال دیکھے اور اس کی خوبی و زشتی، راستی و کجی کو معلوم کرے، بلکہ اس حدیث کو اپنے اندر اور باہر کا جامہ بنالے اور ہر وقت کے لیے اس کو ایک سخن و حکایت ٹھہرائے کہ اپنے دل سے اس کی تکرار کرتا رہے اور اپنے تمام حرکات و سکنات میں اس پر عمل کرے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفاتِ نفسی و آفاقی سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پائے[1]"

شیخ جیلانیؒ توحید کے آفتاب تھے، آپ کی کتابِ مستطاب "فتوح الغیب" کی ہر سطر سے توحید کی تعلیم مترشح ہوتی ہے اور سلسلۂ عالیہ قادریہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے الفاظ میں "اتباعِ کتاب و سنت واجتناب از ورع در ہوای بدعت" کے سوا کچھ نہیں! اسی لیے محدث دہلویؒ آگے چل کر فرماتے ہیں: "پیر ما فرمود کہ در سلاسلِ دیگر از چیزہائے دیگر پرسند امادریں سلسلہ از شریعتِ زنہار کہ تا شریعت مطہرہ شکایت نہ کند از تو!"

---

[1] فتوح الغیب مترجمہ شاہ عبدالحق دہلویؒ ص ۲۵۰۔

اشراک فی العلم مشرکین کی "عبادت" کے پہلے جزو سے ہم نے صفحاتِ بالا میں تفصیل سے بحث کی کہ یہ غیر اللہ کو مقرب و شفیع، نافع و ضار جان کر ان سے اپنی حاجت کے وقت فریاد رسی چاہتے تھے، یعنی ان کو پکارتے یا استغاثہ کرتے تھے، یہی ان کا شرک تھا "اشراک فی التصرف" تھا، اگر ان ہی افعال کا ارتکاب کسی کلمہ گو سے ہو تو اس پر بھی شرک کا اطلاق کیا جائیگا اور اس کی کلمہ گوئی اطلاقِ شرک سے مانع نہ ہوگی۔ دیکھو اس "اشراک فی التصرف" میں "اشراک فی العلم" بھی لازماً شامل ہوتا ہے۔ درد و مصیبت کے وقت غیر اللہ کو پکارنے والا نہ صرف یہ سمجھتا ہے کہ وہ اس درد و غم کو دور کرنے کی قدرت رکھتے ہیں بلکہ اس کا قطعی یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ وہ اس کے اس استغاثہ اور پکار کو ہر وقت اور ہر جگہ سے سن بھی سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ بغیر سنے اور بغیر مطلع ہوئے وہ اس کی مدد کر کیسے سکتے ہیں؟ اس طرح وہ غیر اللہ کے لیے علم غیب بھی ثابت کرتا ہے، حالانکہ علم غیب خصائصِ الٰہیہ سے ہے اور غیر اللہ سے قطعاً مسلوب! یہی اس کا "اشراک فی العلم" ہے! اور اس سے زیادہ ضلالت اور گمراہی اور کیا ہو سکتی ہے! وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَہٗٓ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَھُمْ عَنْ دُعَآئِھِمْ غٰفِلُوْنَ (پ۲۶ ع۱) "اس شخص سے زیادہ کون گمراہ ہوگا جو خدا کو چھوڑ کر ایسے معبود کو پکارے جو قیامت تک بھی اس کا کہنا نہ کرے اور ان کو ان کے پکارنے کی بھی خبر نہ ہو"

یہ امر کہ علم غیب[1] خاصۂ حق سبحانہ تعالیٰ ہے، اس کے سوا کسی کو نہیں، قرآنِ مبین میں نہایت صراحت و وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس میں کسی قسم کا اشتباہ نہیں پہلے چند اجمالی آیات پر غور کرو۔

(۱) وَلِلّٰہِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَیْہِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ کُلُّہٗ (پ۱۲ ع۱)	اور آسمانوں اور زمینوں میں جتنی غیب کی باتیں ہیں ان کا علم خدا ہی کو ہے اور سب امور اسی کی طرف رجوع ہونگے۔

[1] مختصر لفظوں میں غیب کی حقیقت سمجھ لو۔ قاضی بیضاوی کہتے ہیں کہ غیب وہ امر ہے جس پر نہ عقلی دلیل قائم ہو سکتی ہے نہ وہ بدیہی ہو نہ حواس کی رسائی اس تک ہو۔ (تفسیر انوار التنزیل)

Marfat.com

اسی مفہوم کو نفیاً اس طرح بیان کیا گیا ہے :۔

قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (پ ۲۰ ع ۱)

آپ کہہ دیجیے کہ جتنی مخلوقات آسمانوں اور زمین میں موجود ہر کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا بجز اللہ تعالیٰ کے اور ان کو یہ خبر نہیں کہ کب دوبارہ زندہ کیے جائینگے۔

(۲) لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ (پ ۱۵ ع ۱۷)

تمام آسمانوں اور زمین کا علم غیب اسی کو ہے وہ کیسا کچھ دیکھنے والا اور کیسا کچھ سننے والا ہے۔

(۳) فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ (پ ۱۱ ع ۶)

آپ فرما دیجیے کہ غیب کی خبر صرف خدا کو ہے۔

مندرجہ ذیل آیات میں غیر اللہ سے علم غیب کی مطلق نفی کی جا رہی ہے۔

(۴) وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (پ ۷ ع ۱۳)

اور اللہ ہی کے پاس کنجیاں ہیں تمام مخفی اشیاء کی، نہیں جانتا ہے انہیں لیکن وہی۔

خود آنحضرت صلعم نے غیب کی کنجیوں کی تفسیر ان پانچ چیزوں سے فرمائی جن کا ذکر صراحت سے سورہ لقمان میں آیا ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا ؕ وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ (پ ۲۱ ع ۱۳)

بیشک اللہ ہی کو قیامت کی خبر ہے اور وہی مینہ برساتا ہے اور وہی جانتا ہے جو کچھ رحم میں ہے، اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا عمل کریگا، اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مریگا۔ بیشک اللہ سب باتوں کا جاننے والا باخبر ہے۔

جتنے حوادثِ کونیہ اور وقائعِ غیبیہ ہیں سب ان پانچ میں داخل ہیں (۱) حوادثِ سماویہ کو "انزالِ غیث" میں شامل کیا جا سکتا ہے جس کا تعلق آسمان سے ہے (۲) حوادثِ ارضی "علم ما فی الارحام" میں داخل ہیں اور (۳) حوادثِ حیات کا تعلق لازماً "ماذا تکسب غداً" سے ہوگا اور (۴) حوادثِ موت و ما بعدِ موت ظاہر ہے کہ "ماتدری نفس بای ارض تموت" میں شامل ہیں۔ جب ان تمام حوادث

وامورِ غیبیہ کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے اور کسی فردِ بشر کو عطا نہیں کیا گیا تو ظاہر ہے کہ کسی حادثۂ غیب کا علم انسان کو نہیں ہو سکتا اور جب (۵) علمِ قیامت (یعنی اس کے خاص وقتِ وقوع کا علم) کسی نبی کو نہیں حالانکہ سب اس کی خبر دینے میں متفق ہیں۔ تو اور حوادثِ آتیہ کا علم بدرجہ اولیٰ ان کو نہ ہوگا۔ غرض جب ان پانچ کا علم کسی کو نہ ہوا تو اور چیزوں کا علم بدرجہ اولیٰ نہ ہوا، اسی لیے ان کو "مفاتح غیب" کہا گیا ہے، گویا جملہ امورِ غیبیہ ان کے اندر ہیں اور یہ تمام خزائنِ غیب کی کنجیاں ہیں اور جب خزانہ کی کنجی ہی کسی کو نہ ملے تو اس میں سے ایک حبہ بھی نہیں مل سکتا۔

(۵) وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ (پ۷ ع ۳)	اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے تمام خزانے ہیں اور نہ میں تمام غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔
(۶) قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ. (پ۹ ع ۲۳)	آپ کہہ دیجیے کہ میں خود اپنی ذات خاص کے لیے کسی نفع کا اختیار نہیں رکھتا اور نہ کسی ضرر کا مگر اتنا ہی جتنا کہ خدا تعالیٰ نے چاہا ہو اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا ہوتا تو میں بہت سے منافع حاصل کر لیا کرتا اور کوئی مضرت ہی مجھ پر واقع نہ ہوتی، میں تو محض بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہوں ان لوگوں کو جو ایمان رکھتے ہیں۔

یعنی میں ایک بندۂ ناتواں ہوں اپنے لیے جلبِ نفع و دفعِ ضرر کی قوت نہیں رکھتا مگر جو میرا مالک چاہے نفع و دفع سے، پھر اس بیان کو اس طرح موکد کیا جا رہا ہے کہ اگر میں غیب کو جانتا تو جو بات بھلائی اور نفع کی ہوتی اس کو اپنے لیے حاصل کرتا۔ اور جو بات بُری اور نقصان کی ہوتی اس سے دور رہتا تاکہ وہ بُرائی مجھے نہ لگے، لیکن میں تو ایک بندۂ عاجز ہوں، مبہم کیا جانوں کہ میرے رب میرے مالک کے علم میں میرے لیے اچھا کیا ہے اور بُرا کیا، میرے حق میں اس کا حکم کیا ہے اور کونسی

Marfat.com

چیز میرے لیے مقدر کر رکھی ہے، جب مجھے اتنا بھی معلوم نہیں تو پھر کسی اور بات کا معلوم ہونا کیسا! یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بطور تواضع و ادب نہیں فرما رہے ہیں بلکہ بطریقِ اعتقادِ قلبی پیش فرما رہے ہیں کیونکہ علمِ غیب حق تعالیٰ ہی کی خصوصیتِ خاصہ ہے عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا (پ ۲۹ ع ۱۲) سے صاف طور پر اس کی وضاحت ہو رہی ہے اور اوپر جو آیات پیش کی گئیں وہ اس کی تائید کر رہی ہیں، ہر قسم کے اشتباہ و مغالطہ کو رفع کر رہی ہیں۔

اب رہے معجزات تو جیسے ملا علی قاریؒ نے شرح فقہ اکبر میں تصریح کر دی ہے وہ مخصص ہیں اس قضیۂ عمومی سے اِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ (پ ۲۹ ع ۱۲) یعنی جب حق تعالیٰ چاہتے ہیں کسی نبی یا رسول کو بذریعہ وحی کسی غیب پر مطلع کر دیتے ہیں۔ انبیاء سے علمِ غیب کی نفی عقائدِ اسلام میں داخل ہے اور کافۂ اہلِ اسلام کا اس پر اتفاق ہے۔ یہ عقائد خود انبیاء علیہم السلام کے تعلیم کردہ ہیں۔ لہذا انبیاء سے علمِ غیب کی نفی کرنے میں ان کی کسی طرح تحقیر نہیں ہوتی، ایسا سمجھنے والا مجنوں ہے، کتاب و سنت سے جاہل! دیکھو سورہ نمل میں حق تعالیٰ ہدہد کا قول نقل فرما رہے ہیں "أَحَطتُ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهِ" یعنی ہدہد حضرت سلیمان علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ "میں ایسی بات معلوم کر کے آیا ہوں جو آپ کو معلوم نہیں ہوئی" اس آیت کو سن کر کوئی ہدہد کا بچہ بھی ایسی بیوقوفی نہ کریگا کہ انبیاء و اولیاء کو علمِ غیب سے متصف سمجھ کر دور دور سے استعانت کے لیے پکارے اور سمجھے کہ وہ اس کے پکارنے کو سن لیتے ہیں، آدمی کے بچے کا تو کیا ذکر ہے!

اب ذرا چند ان حدیثوں کو بھی سن لو جن سے غیر اللہ سے علمِ غیب کی کلی نفی ہوتی ہے اور حق تعالیٰ ہی سے یہ مختص کیا جاتا ہے۔

(۱) واللہ لا ادری واللہ لا ادری وانا رسول اللہ ما یفعل بی ولا بکم[۱] — یعنی باوجودیکہ میں خدا کا نبی ہوں پھر نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے اور تمہارے ساتھ کیا معاملہ پیش آئے۔

(۲) عن عائشۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت من اخبرک ان محمدا صلی اللہ علیہ وسلم یعلم — حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ جو تجھ سے یہ کہے کہ آنحضرتؐ وہ پانچ باتیں جانتے تھے جن کا اللہ نے

[۱] اخرجہ البخاری عن ام العلاء۔

الخمس التی قال الله تعالیٰ ان الله عنده علم الساعة فقد اعظم الفریة[1]

ذکر کیا ہے (آخر سورۂ لقمان میں)، تو اس نے بڑا طوفان باندھا۔

(۳) عن الربیع بنت معوذ بن عفراء قالت جاء النبی صلی الله علیه وسلم فدخل حین بنی علی فجلس علی فراشی کمجلسك منی فجعلت جویریات لنا یضربن بالدف ویندبن من قتل من آبائی یوم بدر اذ قالت احدٰهن وفینا نبی یعلم ما فی غد فقال دعی هذه وقولی بالذی کنت تقولین[2]

ربیع بنت معوذ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم میرے مکان میں تشریف لائے جب میری شادی ہو رہی تھی پھر میرے پاس مسند پر بیٹھ گئے۔ ہماری کچھ لڑکیاں گانے لگیں دف بجا کر اور ہمارے ان بزرگوں کا ذکر کرنے لگیں جو بدر میں مارے گئے تھے۔ ان میں سے ایک کہنے لگی کہ ہم میں ایک ایسا نبی ہے جو جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا۔ آپ نے فرمایا کہ ایسا مت کہہ بلکہ جو پہلے کہہ رہی تھی وہی کہے جا۔

ان تینوں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی بزرگ ترین اور کامل ترین ہستی اپنی ذاتِ مقدس سے علمِ غیب کی نفی فرما رہی ہے، پھر آپ کی امت سے کسی کی یہ مجال کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ علمِ غیب کو اپنی جانب نسبت کرے۔ امورِ غیبیہ کا علم بذاتہ کسی انسان کو حاصل نہیں وہ مخصوص ہے حق تعالیٰ ہی کی ذات کے لیے انما الغیب للہ۔ کوئی شخص خواہ وہ نبی ہو یا ولی یہ بھی نہیں جان سکتا کہ خود وہ کل کیا کرے گا: وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ مَّاذَا تَکْسِبُ غَدًا۔

حدیث اول کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مناقض ہے آیۂ کریمہ لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ کے اور نیز منافی اس آیت کے وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی۔ اس لیے یہ حدیث منسوخ ہے اور اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو آپ کا ایسا فرمانا محض خوف و خشیتِ الٰہی کے لحاظ سے تھا نہ کہ واقعہ کے لحاظ سے۔

طیبی نے اس حدیث کی تشریح میں تبلایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد اس قول سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ اپنی ذات سے علمِ غیب کی نفی فرمانا چاہتے ہیں اور صاف طور پر ظاہر فرمانا چاہتے ہیں کہ آپ ہرگز غیب پر مطلع نہیں، نہ اپنی تقدیر سے واقف ہیں نہ کسی

[1] بخاری [2] بخاری۔

Marfat.com

اور کی تقدیر سے، نہ اپنے پوشیدہ کاموں سے واقف ہیں نہ غیب کے۔ آپ کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اپنی نجات کا بھی یقین نہیں رکھتے اس لیے کہ یہ امر تو بہت ساری دوسری حدیثوں سے ثابت ہو چکا ہے اور آیات قرآنیہ بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ لہٰذا اس حدیث کو کسی آیت کا معارض قرار دینا کسی طرح درست نہیں۔ رہا احتمالِ نسخ وہ بھی دو وجوہ سے درست نہیں: (۱) نسخ کا حکم اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا جب تک کہ تاخرِ ناسخ کا معلوم نہ ہو اور ظاہر ہے کہ یہاں تقدم حدیث کا اور تاخر آیت کا معلوم نہیں (۲) نسخ "احکام" میں جاری ہوتا ہے "اخبار" میں جاری نہیں ہوتا، اخبار میں نسخ کا حکم لگانا گویا شارع پر کذب کی تہمت لگانی ہے[۱]

دوسری حدیث تو آیتِ قرآنی ہی کی ترجمان ہے اس کا انکار قرآن مبین کا انکار ہے۔ یہاں حجت یہ تراشی جاتی ہے کہ علم غیب کے اقسام میں امتیاز کیا جانا چاہیے۔ ایک علم غیب مطلق ہے دوسرے علمِ غیب اضافی۔ غیب مطلق یا غیب حقیقی کا تو علم حق تعالیٰ ہی کو ہوتا ہے لیکن غیب اضافی کے علم کی نسبت انبیاء و اولیاء کی طرف کی جاسکتی ہے۔

دیکھو غیبِ اضافی کے معنی تو یہی ہوئے کہ یہ بعض پر ظاہر ہوتا ہے اور بعض پر پوشیدہ رہتا ہے۔ مثال کے طور پر لذتِ جماع کو لو یہ رجولیت والے پر غیب نہیں، نامرد یا عنین کے لیے غیب ہے۔ یا رنگوں پر غور کرو، یہ مادرزاد اندھے کے لیے غیب ہیں لیکن آنکھوں والے کے لیے غیب نہیں یہی حال آوازوں کا ہے، سننے والے کے لیے یہ غیب نہیں مادرزاد بہرے کے لیے ضرور غیب ہے۔ اسی طرح حیدرآباد کا حال حیدرآباد والوں پر غیب نہیں، دہلی والوں کے لیے غیب ہے۔ تو ظاہر ہے کہ غیبِ اضافی کے جاننے میں کچھ اولیاء و انبیاء کی تخصیص نہیں۔ لذتِ جماع جو عنین کے لیے غیب ہے اس کو ہر مرد خواہ وہ کافر ہو یا مومن جانتا ہے، اسی طرح آوازوں کو ہر کان والا خواہ وہ نیک ہو یا بد جانتا ہے اور یہ مادرزاد بہرے کے لیے غیب ہیں۔ انبیاء و اولیاء کو جو وقائع یا حوادث حق تعالیٰ بذریعہ وحی و الہام بتلا دیتے ہیں وہ ضرور ان کو معلوم ہو جاتے ہیں لیکن حق تعالیٰ کے بغیر خبر

---

[۱] دیکھو تحریر ابن ہمام ج ۳ ص ۵۵ مطبوعہ مصر ۱۳۱۶ھ

Marfat.com

دینے کے یہ ہرگز معلوم نہیں ہو سکتے اور حق تعالی نے اس بات کی خبر نہیں دی کہ زمین و آسمان میں جتنے حوادث و واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، ان کی اطلاع کسی نبی یا ولی کو اس نے دے رکھی ہے۔ لہذا ان کے علم کا دعویٰ کسی نبی یا ولی کے لیے کرنا محض بے دلیل ہے اور آیاتِ قرآنیہ کا صریح انکار۔ اور اس امر کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اخبار بالوحی میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا، شیطان کے تصرف سے یہ قطعاً محفوظ ہے، لیکن الہام میں عصمت شرط نہیں، الہام کبھی شیطانی ہوتا ہے اور کبھی رحمانی۔ اس لیے اولیاء کرام الہام پر اس وقت تک اعتماد نہیں کرتے جب تک کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق نہ ہو۔

تیسری حدیث کی تاویل میں مرضیاتی ذہنیت کا استعمال کیا جاتا ہے۔ پہلے تو یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن مجید میں جمیع علوم موجود ہیں اور ان سب کا علم رسول کو ہونا ضروری ہے ورنہ جہل لازم آئیگا اور جہل منافی شانِ رسول ہے! یہاں ایک کھلا مغالطہ ہے۔ قرآن میں جمیع علوم کے موجود ہونے سے مراد جمیع علوم دینیہ کے سوا کچھ نہیں، ان علوم کا تعلق سعادتِ انسانی سے ہوتا ہے جس کے حصول کا انسان مکلف ہے۔ قرآنِ کریم میں نہ ملائکہ کی جملہ تعداد موجود ہے نہ ذراتِ زمین کے اعداد اور نہ نجوم کی گنتی۔ نہ انجنیرنگ کی تفصیلات اور نہ حیوانات، مصریات کی کلی توضیحات! نہ ان چیزوں کا کتابِ الٰہی میں ہونا ضروری ہے اور نہ ہم ان کی تحصیل پر مامور ہیں اور نہ رسول پر ان کی تبلیغ ضروری اور نہ ان سے جہل منافی شانِ رسول! خود حق تعالیٰ نے اس امر کی توضیح کردی ہے کہ بہت سی باتوں کا ہم نے قرآن میں ذکر نہیں کیا، مثلاً، وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ[1] (پ ۲۴ ع ۱۳) یعنی بہت سے رسولوں کا ذکر ہم نے کیا ہے اور بہتوں کا ذکر نہیں کیا!

بعض دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کا یہ کہنا کہ دعی ھذہ وقولی بالذی کنت

---

[1] ہم نے آپ سے پہلے بہت سے پیغمبر بھیجے تھے جن میں بعض تو وہ ہیں کہ ان کا قصہ ہم نے آپ سے بیان کیا ہے اور بعض وہ ہیں جن کا ہم نے آپ سے بیان نہیں کیا۔

Marfat.com

تقولین۔ محض اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آپ کو ان لڑکیوں کی باتوں کے سُننے کا اشتیاق تھا جو وہ شہداء بدر کے متعلق کہہ رہی تھیں، علمِ غیب کا انکار کرنا مقصود نہ تھا۔

اس توجیہ میں بالکل اسی قسم کی ہوشمندی و ذہانت سے کام لیا گیا ہے جو ہمیں اس احمق میں ملتی ہے جس کی ٹانگ میں تیر لگا تھا اور خون بہہ رہا تھا وہ اور اس کی عورت دونوں خون پونچھ رہے تھے اور احمق عقل کا دشمن برابر کہے جا رہا تھا کہ خدا کرے تیر نہ لگا ہو! حضور انور صلعم تو ان لڑکیوں کی اتنی بات سن کر کہ ہم میں ایک نبی ایسا ہے جو کل کی بات جانتا ہے فرماتے ہیں کہ یہ بات چھوڑ دو اور اپنا پہلا قصہ جاری رکھو۔ اور اس کی تاویل یوں کی جا رہی ہے کہ علم غیب کا انکار مقصود نہیں! "کل کی بات جاننے کی" نفی تو قضیہ کلیہ کے طور پر خود قرآن مبین میں حق تعالیٰ فرما رہے ہیں: وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا۔ یعنی کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کریگا! اب اس صریح تردید کے بعد تاویل کا کونسا دروازہ کھلا رہتا ہے۔ ع ہشدار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی!

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اقوال کی تصدیق ان احوال و واقعات سے بھی کر لو جو آپ کی زندگی میں رونما ہوئے۔ ان میں سے صرف تین کا ذکر یہاں کافی ہوگا۔

(۱) واقعۂ افک: آپ کی محبوبہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر لوگوں نے تہمت لگائی تو آپ کو سخت صدمہ ہوا۔ آپ نے اس کی تحقیق و تفتیش فرمائی، اکابر صحابہ سے مشورے کیے، لیکن حقیقت کا انکشاف نہیں ہوا، آپ کے غم و حزن میں اضافہ ہوا اور تیس دن اسی حال میں گذر گئے۔ بالآخر حق تعالیٰ ہی نے بذریعہ وحی آپ کو بتلایا کہ عائشہ صدیقہؓ اس تہمت سے پاک ہیں۔

(۲) واقعۂ بیر معونہ: اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے حضور انور صلعم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ چند لوگ میرے ساتھ کر دیں جو میری قوم کو دین کی تبلیغ کریں اگر وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں تو میں بھی مسلمان ہو جاؤنگا۔ آپ نے اس کی بات کو صحیح جان کر ستر صحابہ جلیل القدر اس کے ہمراہ کر دیے۔ راستہ ہی میں اس غدار کی بیوفا قوم نے ان بزرگوں کو شہید کر دیا! جب حضور اکرمؐ کو اس کی اطلاع ہوئی تو آپ کو نہایت رنج

Marfat.com

ہوا، اور ایک مہینے تک قاتلین کے حق میں صبح کی نماز میں آپ نے بد دعا فرمائی!

(۳) سورۂ تحریم کی شان نزول۔ حضور انور کو شہد نہایت مرغوب تھا، آپ حضرت زینبؓ کے ہاں تشریف لیجا کر شہد نوش فرماتے تھے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے آپس میں مشورہ کیا کہ کوئی ایسی ترکیب نکالنی چاہیے کہ آپ کا حضرت زینبؓ کے ہاں زیادہ ٹھہرنا کم ہو جائے، سوچ بچار کے بعد بات یہ ٹھہری کہ ہم میں سے جس کے پاس پہلے آپ کی تشریف آوری ہو وہ آپ سے کہے کہ آپ کے منہ سے تو مغافیر کی بو آتی ہے۔ آپ کے قلبِ مبارک میں یہ شبہ پیدا کیا جائے کہ جو شہد آپ نوش فرماتے ہیں، شاید ان مکھیوں کا ہو جو مغافیر پر بیٹھی ہوں، چونکہ بدبو سے آپ کو نفرت ہے اس لیے شہد پینا ترک فرما دینگے اور اس طرح حضرت زینبؓ کے پاس کی نشست کم ہو جائیگی۔ ان بیویوں کی یہ بات چل گئی اور حضور انورؐ نے قسم کھالی کہ اب شہد کبھی نہ پیونگا![1]

جس بات کی قرآنِ مبین نے صاف صریح الفاظ میں وضاحت کی، جس بات کو رسول اکرم صلعم نے خوب کھول کر بیان کیا، جس بات کی تائید آپ کی زندگی کے مختلف و متعدد واقعات سے ہوتی ہے وہ صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ ہی عالمِ غیب ہیں ان کے سوا مخلوقات میں کوئی ہستی عالمِ غیب نہیں، ان ہی کے علم عطا فرمانے پر انبیاء و اولیاء کو غیب کے بعض واقعات کا علم ہوتا ہے، یہ ان کی اختیاری چیز نہیں کہ جب چاہا معلوم کر لیا، یہ حق تعالیٰ ہی کا اختیاری فعل ہے کہ جب چاہا اور جتنا چاہا کسی نبی و رسول کو بذریعہ وحی غیب پر مطلع کر دیا! اسی بات کو حضرت سعدیؒ نے اپنے مشہور اشعار میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے الفاظ میں اس طرح ادا کر دیا ہے ؎

یکے پرسید زاں گم کردہ فرزند	کہ اے روشن گہر پیرِ خرد مند!
ز مصرش بوئے پیراہن شمیدی	چرا در چاہِ کنعانش ندیدی!
بگفتا حالِ من برقِ جہاں است	دمے پیدا و دیگر دم نہان ست!
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم	گہے بر پشت پائے خود نہ بینم!
اگر درویش بر حالے بماندے	دو دست از ہر دو عالم بر فشاندے

[1] یہ تینوں واقعات صحاح ستہ کی ہر کتاب میں موجود ہیں۔

Marfat.com

اشراک فی التصرف اور اشراک فی العلم کو اچھی طرح سمجھ جانے کے بعد اب یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ ندا و صدا کی مندرجہ ذیل تمام صورتیں قطعاً ناجائز اور حرام قرار پاتی ہیں کیونکہ یہ کفر و شرک تک پہنچا دیتی ہیں۔

(۱) درد و مصیبت کے وقت اولیاء اللہ کو اس عقیدہ سے پکارنا کہ یہ ہر جگہ سے ہماری ندائے درد کو سن لیتے ہیں اور ہماری اعانت کر سکتے ہیں، یہ قطعاً اشراک فی العلم و اشراک فی التصرف ہے۔ تمام فقہاء نے اس کی تکفیر کی ہے۔ قرآن کریم اور احادیثِ نبوی سے اس کا تفصیلی ثبوت اوپر دیا جا چکا ہے۔

(۲) اولیاء اللہ کی قبروں پر جا کر ان کو پکارنا۔ اس کی دو صورتیں ہیں: (ا) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ "آپ میری فریاد کو سنیے، میری بلا کو ٹال دیجیے، میری حاجت کو روا کیجیے" یہ استغاثہ و استعانت، دعاء اور طلبِ حاجت ہے خواہ قریب سے کی جائے یا دور سے اور یہ سراسر شرک اور کفر ہے۔ دعاء کی تفصیل میں اوپر اس کا ثبوت دیا جا چکا ہے۔ (ب) قبر کے نزدیک جا کر ان سے یہ کہنا کہ "آپ میرے لیے دعاء کیجیے کہ اللہ میری بلا کو ٹال دے اور میری حاجت کو روا کرے" یہ قطعاً بدعت ہے، قرون مشہود لہا بالخیر میں کسی نے ایسا نہیں کیا۔

امام ابو حنیفہؒ نے ایک شخص کو دیکھا کہ صالحین کی قبروں پر آ کر کہہ رہا ہے کہ "هل لكم من خبر و هل عندكم من اثر اني اتيتكم و ناديتكم من شهور و ليس سوالي منكم الا الدعاء فهل دريتم ام غفلتم" (اے اہلِ قبور! کچھ تم کو خبر بھی ہے اور کیا تم پر کچھ اثر بھی ہوتا ہے کہ کئی ماہ سے میں تمہارے پاس آتا ہوں اور تم کو پکارتا ہوں؟ میرا سوال تم سے صرف اتنا ہے کہ تم میرے لیے دعا کرو، کیا تم کو میرے حال کی خبر بھی ہے یا تم غافل ہو میرے حال سے) یہ سن کر امام اعظمؒ نے اس شخص سے پوچھا "هل اجابوا لك؟" کیا انہوں نے تجھ کو کوئی جواب دیا۔ اس نے کہا "نہیں" آپ نے عتاب آمیز لہجہ میں فرمایا "سحقا لك و تربت يداك! كيف تكلم اجسادا لا يستطيعون جوابا و لا يملكون شيئا و لا يسمعون صوتا" یعنی "پھٹکار ہو تجھ پر! خاک آلود ہوں تیرے دونوں ہاتھ! ایسے جسم کیسے بات کر سکتے ہیں جو

Marfat.com

جواب کی طاقت ہی نہیں رکھتے، جو کسی شئے کے مالک نہیں، جو کوئی آواز بھی نہیں سُن سکتے!"
پھر آپ نے یہ آیت پڑھی: "وَمَا اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِی الْقُبُوْرِ" یعنی حق تعالیٰ حضور انور صلعم کو مخاطب
کرکے فرماتے ہیں "آپ ان لوگوں کو جو قبر میں ہیں کچھ نہیں سُنا سکتے"[1]

امام اعظم کے اس عتاب سے مندرجہ ذیل امور کی وضاحت ہو رہی ہے:-

(۱) اولیاء و صالحین کی قبروں پر آکر ان سے خطاب کسی طرح جائز نہیں۔ آپ نے ایسے لوگوں کو بددعا دی ہے جو اہلِ قبور سے دعا کے طالب ہوتے ہیں! اگر آپ کو ان جہّال کا حال معلوم ہوتا جو اہلِ قبور سے رزق، صحت و اولاد مانگتے ہیں اور ان کو مستقل یا غیر مستقل طور پر قادر جانتے ہیں تو یقیناً ان کو کافر و مشرک و ملعون قرار دیتے اور گردن مارنے کا حکم دیتے!

(۲) مردے نہ سُن سکتے ہیں اور نہ جواب دے سکتے ہیں۔ پھر بلاؤں کا ٹالنا مصیبتوں کا دور کرنا ان سے کیا ہو سکتا ہے! اور جب یہ نزدیک سے سُن نہیں سکتے تو دور کی کب سنیں گے؟ محققین حنفیہ سماعِ موتیٰ کے قائل نہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کشتگانِ بدر سے جو خطاب فرمایا تھا اس کی توجیہ مختلف طریقوں سے کی گئی۔ بہترین توجیہ یہ ہے کہ:-

یہ آپ کا معجزہ تھا حق تعالیٰ نے آپ کی بات کفارِ موتیٰ کو سُنا دی تھی، چنانچہ کفایہ میں ہے ومن اجوبتھم انہ لو صح فذالک معجزۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ کافی شرح وافی میں صراحت کی گئی ہے کہ وللمقصود من الکلام الافہام وذا بالاسماع وذالا یتحقق بعد الموت یعنی مقصود کلام سے افہام ہے اور یہ سماع کے ذریعہ ہوتا ہے اور سماع موت کے بعد محقق نہیں" اسی طرح عینی شرح ہدایہ میں: قولہ لان المقصود من الکلام الافہام ای افہامہ فلانا والموت ینافیہ ای ینافی الکلام الاسماع والمیت لیس باھل السماع الا تری الی قولہ تعالیٰ انک لا تسمع الموتیٰ والی قولہ تعالیٰ وما انت بمسمع من فی القبور۔

شرح[2] مواقف میں تشریح کی گئی ہے کہ علم و قدرت و ارادہ، سمع بصر میت کے لیے ثابت

---

[1] غرائب فی تحقیق المذاہب [2] شرح مواقف تذئیل فی ذکر فرق بعد موقف سادس ص ۵۰۰، مطبوعہ نول کشور۔

Marfat.com

کرنا فرقہ صالحیہ کا عقیدہ ہے جو معتزلہ کا ایک گروہ ہے "الصالحیۃ اصحاب الصالحی ومذھبھم انھم جوزوا قیام العلم والقدرۃ والارادۃ والسمع والبصر بالمیت ویلزمھم جواز ان یکون الناس مع اتصافھم بھذہ الصفات امواتا وان لا یکون الباری تعالیٰ حیاً" یعنی صالحیہ گروہ ہے صالحی کا اور مذہب ان کا یہ ہے کہ انہوں نے میت کے لیے علم و قدرت و ارادہ و سمع و بصر کو جائز قرار دیا ہے، ان کے مذہب کی رو سے تو یہ لازم آتا ہے کہ جو لوگ ان صفات سے متصف ہیں وہ سب مردہ ہیں اور حق تعالیٰ بھی زندہ نہیں!" اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر گور پرست مشائخ اسی فرقۂ ضالہ کے عقیدہ پر قائم ہیں نعوذ باللہ من ذلک۔

غرض جب مردے سن نہیں سکتے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے کافروں کی تشبیہ عدم سمع میں مردوں سے دی اور اثبات سمع عقیدہ ہے صالحیہ مفسدین کا جو معتزلہ کا گروہ ہے تو پھر قبروں کے پاس جا کر مردوں کو پکارنا اور ان سے دعا کی درخواست کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی بے عقل پتھر کو پکارے اور اس سے دعا کی خواہش کرے! یہ فعل کسی پاگل سے تو صادر ہو سکتا ہے عاقل و ہوشمند سے کیسے ممکن ہے؟ عموماً ایسے ہی پاگل مُردوں کو قبروں میں نہ صرف زندہ اور توانا سمجھتے ہیں بلکہ ان کو حق تعالیٰ کے ہاں اپنا شفیع اور مقرب بھی جانتے ہیں، اسی لیے وہ ان کی عبادت کرتے ہیں یعنی ان کے سامنے ذلیل و خوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، ان کی قبروں کو بوسہ دیتے ہیں اور ان کا طواف بھی کرتے ہیں اور کفر و شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں! ذٰلک ھو الخسران المبین!

یہاں غلط فہمی رفع کرنے کے لیے اس امر کا تذکرہ ضروری ہے کہ جو شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر دور سے درود بھیجتا ہے اس کو آپ تک فرشتے پہنچاتے ہیں، آپ اس کو نہیں سنتے البتہ بزرگانِ دین اور محققین شرع متین نے اس امر کی تصریح کی ہے اور روایاتِ مرفوعہ میں بھی یہ امر مذکور ہے کہ جو شخص آپ کے مزار مبارک کے قریب درود بھیجتا ہے اس کو آپ بخوبی سنتے ہیں چنانچہ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی نے شعب الایمان میں ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من صلی علی عند قبری سمعتہ ومن صلی علی نائیا ابلغتہ[1]" یعنی جو درود

[1] مشکوٰۃ باب الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فصل ثالث۔

Marfat.com

بھیجتا ہے میری قبر کے نزدیک اس کو میں خود سنتا ہوں اور جو درود بھیجتا ہے مجھ پر دور سے وہ مجھ تک پہنچایا جاتا ہے۔ یعنی بذریعہ ملائکہ اور میں خود براہِ راست نہیں سنتا، ورنہ پہنچانے کی ضرورت نہ ہوتی جیسا کہ قبر کے پاس کے درود کے متعلق پہنچانے کا ذکر نہیں کیا!

اسی طرح ابنِ حجر مکی نے شرح ہمزیہ میں ذکر فرمایا ہے "اذا صلی وسلم علیہ عند قبرہ سمعہ سماعًا حقیقیًا ویرد علیہ من غیر واسطۃ وان صلی وسلم علیہ من بعید لا یسمعہ الا بواسطۃ یدل علیہ احادیث کثیرۃ" یعنی جب کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر کے پاس سے آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے تو آپ اس کو حقیقت میں سنتے ہیں اور جواب دیتے ہیں اس کا بلا واسطہ، اور اگر کوئی دور سے آپ پر درود و سلام بھیجتا ہے تو آپ اُس کو نہیں سنتے مگر بواسطہ (یعنی فرشتے آپ تک پہنچاتے ہیں[1]) بہت سی حدیثیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔

اس چیز کی شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے شرح مشکوٰۃ میں یوں تصریح کی ہے: "سخن دراں ماند کہ ایں فضیلت رد سلام از آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم مخصوص بزائراں قبر شریف اوست صلی اللہ علیہ وسلم مثل داخل در مجلس کہ سلام گوید یا عام است بر ہر کسے را کہ سلام فرستد چنانکہ در تشہد وغیر آں، وظاہر ہمین است الا آنکہ سلام زائراں بنفس شریف خود بے واسطہ سماع فرماید در د سلام نماید و دیگراں بواسطہ ملائکہ سیاحین بود[2]"

خوب سمجھ لو کہ یہ امر یعنی رد و بلوغ سلام وغیرہ روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے آیا ہے، باقی رہے اور انبیاء اگرچہ حیات وصلوٰۃ ان کی قبر میں مسلم ہے مگر تبلیغ سلام ورد جواب کی کوئی تصریح نہیں کی گئی۔ المومن وقاف

بیان بالا سے صاف ظاہر ہے کہ ندائے بعید کو نبی ہو یا ولی کوئی نہیں سنتا اور ندائے قریب کا سننا مخصوص ہے انبیاء کے لیے، کسی ولی یا غوث و قطب کو یہ امر نصیب نہیں!

---

[1] ان للہ ملائکۃ سیاحین فی الارض یبلغون عن امتی السلام (سفیان ثوری کی حدیث عبداللہ بن مسعود سے، رواہ النسائی وابو حاتم فی صحیحہ)

[2] شرح مشکوٰۃ ج ا ص ۳۱۹ باب فضل الصلوٰۃ علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم طبع کلکتہ ۱۲۵۳ھ۔

Marfat.com

ہماری اس تصریح کے خلاف بعض کم عقل ضعیف احادیث کو پیش کرتے ہیں، اپنی ضعفِ عقلی اور کتاب و سنت سے عدم مزاولت کی وجہ[1] سے ان احادیث کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے اور دعویٰ کرتے ہیں کہ انبیاء و اولیاء ندائے بعید کو بھی سن سکتے ہیں، نہ صرف سُن سکتے ہیں بلکہ ہماری مدد بھی کر سکتے ہیں، لہٰذا اُنہیں پکارنا چاہیے یا محمداہ، یا غوث، یا خواجہ، یا نقشبند، یا بدوی یا شاذلی ہماری مدد کرو۔ اس میں انہیں نہ اشراک فی العلم کا کوئی شائبہ نظر آتا ہے اور نہ اشراک فی التصرف کا! انا للہ و انا الیہ راجعون!

ذرا ان کی پیش کردہ احادیث پر غور کرو "ابن سنی کتاب عمل الیوم واللیلہ میں دو روایتیں بیان کرتے ہیں۔ عبداللہ بن عمرؓ کے پیر میں چونٹیاں بھر گئی تھیں ان سے کسی نے کہا کہ آپ اپنے محبوب ترین شخص کو پکار دیجئے۔ انہوں نے یا محمداہ پکارا اور کھڑے ہو کر چلنے لگے۔ یہی حال عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا ہوا۔ انہوں نے یا محمد کا نعرہ مارا اور ایسے ہو گئے جیسے پیر سے بندھی رسی کھل گئی ہو"

یہ حدیث حصن حصین میں ان الفاظ میں ہے، اذا خدرت رجلہ فلیذکر احب الناس الیہ اس کو موقوفاً ابن سنی نے نقل کیا ہے اور ظفر جلیل میں تحت الفائدہ یہ لکھا ہے کہ "یاد کرے محبوب کو تاکہ حاصل ہو خوشی۔ پس کہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کہ سب سے زیادہ محبوب ہیں"۔

علماء حق نے اس حدیث کے متعلق جو تحقیق کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے :-

(۱) یہ حدیث مرفوع نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول یا فعل ہو بلکہ موقوف ہے اور حدیث موقوف حجت نہیں خصوصاً جس وقت کہ صدہا آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ کے خلاف اور معارض ہو! چنانچہ علمائے اصول نے تصریح کر دی ہے کہ قول الصحابی لیس بحجۃ یعنی صحابی کا قول حجت نہیں۔

(۲) اس حدیث کو اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ پیر کے سُن ہو جانے کے وقت کسی محبوب کو یاد کرنا چاہیے، یاد کرنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے اور خون جوش میں آتا ہے اور نتیجہ کے طور "خدر" دور ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک علاج طبی اور عملِ نفسیاتی ہے اور ادویہ طبیہ د

---

[1] اور اس وجہ سے کہ ان کا علم فروعِ مذاہب پر منحصر ہے۔

Marfat.com

اعمالِ نفسیاتی کو دین میں کیا دخل! اطبا نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ خدر کا سبب اخلاط بلغمیہ و ریاحاتِ غلیظہ ہیں، خوشی و فرحت سے خون میں جوش ہوتا ہے اور ریاح تحلیل ہو جاتی ہیں۔ دوست کا یاد کرنا خوشی پیدا کرتا ہے خوشی خون میں تغیر پیدا کرتی ہے اور نتیجہ کے طور پر مرض رفع ہوتا ہے۔ اس سلسلہ علت و معلول کا تعلق نہ نداءِ بعید کے سننے سے نظر آتا ہے نہ اولیاء و انبیاء کی اعانت و مدد سے!

مزید تحقیق سے مندرجہ ذیل امور قابلِ لحاظ نظر آتے ہیں:-

(۳) اس حدیث کی بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم کسی نبی سے تو کیا صحابی سے بھی نہیں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی صحابی کے پیر سُن ہو گئے تو کسی نے کہا کہ تم اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو، اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا معلم کوئی مجہول شخص ہے اور تعلیم مجہول حجت نہیں۔ چنانچہ نووی نے اذکار میں جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں عن الهيثم بن حنش قال كنا عند عبد الله بن عمر فخدرت رجله فقال له رجل اذكر احب الناس اليك فقال يا محمد صلى الله عليك وسلم فكانما نشط من عقال۔ یعنی ہم عبداللہ بن عمر کے ہاں تھے، ان کا پیر سُن ہو گیا۔ ایک شخص نے کہا کہ یاد کرو احب الناس کو تو انہوں نے کہا اے محمد رحمت کرے خدا آپ پر اور سلام نازل کرے۔ سو اسی وقت اُن کا پیر کھل گیا جیسے اونٹ رسی سے کھل جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس روایت سے بھی پتہ نہیں چلتا کہ اس نسخہ کا بتلانے والا کون تھا۔

(۴) اس سلسلہ میں یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہم یاد کرنے کے صحیح معنی کا تعین کریں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یاد کرنا دو طرح پر ہو سکتا ہے:-

ا۔ ایک وہ جس کا ثبوت شریعت میں ملتا ہے وہ یہ کہ آپ کے فضائلِ صحیحہ جو احادیث اور قرآن کریم میں وارد ہوئی ہیں ہم ان کا تذکرہ کریں جو مصائب اور آفات آپ نے ہماری ہدایت اور رہبری کی خاطر اُٹھائی ہیں ان کو یاد کریں، آپ کے خصائلِ محمودہ، اخلاقِ حمیدہ، عاداتِ پسندیدہ کا چرچا کریں۔

ب۔ دوسرا طریقہ جو قطعاً خلافِ شرع ہے یہ ہے کہ آپ کو دور سے پکاریں، ندا دیں، مدد مانگیں، استغاثہ کریں۔ یہ موہمِ شرک ہے اور قطعاً ناجائز، اس روایت سے تذکیر یا یاد کرنے کے معنی خلافِ شرع

Marfat.com

مراد لینا مشرکانہ ذہنیت کا پتہ دیتا ہے۔ موحد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد آپ پر درود بھیج کر کرتا ہے جو حق تعالیٰ کا تعلیم کردہ طریقہ ہے، آپ کی احادیث کا چرچا کرتا ہے جو نزول رحمت کا باعث ہے۔

(۵) دیکھو بعض روایتوں میں لفظ "یا" مذکور ہی نہیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ندا ضروری نہیں اور تذکیر بغیر ندا کے ہی ہو سکتی ہے چنانچہ مجاہد کی روایت اسی پر دلالت کرتی ہے۔ عن مجاهد فقال خدرت رجل رجل عند ابن عباسؓ، فقال ابن عباس اذكر احب الناس اليك فقال محمد صلی اللہ علیہ وسلم فذهب خدره - یعنی مجاہد سے روایت ہے کہ ابن عباس کے پاس ایک شخص کا پیر سن ہو گیا تو آپ نے فرمایا کہ اپنے محبوب ترین دوست کو یاد کرو انہوں نے کہا محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ ان کا خدر جاتا رہا۔ اور خطاب جو مقرون بصلوٰۃ ہو وہ شرعاً جائز بھی ہے کیونکہ حدیث میں وارد ہے کہ درود کے پہنچانے کے لیے ملائکہ مقرر ہوتے ہیں۔ ان کے ذریعہ درود کی اطلاع حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہو جاتی ہے۔ یا پھر شوق و محبت میں پکارا جا سکتا ہے اس میں آپ کے حاضر و ناظر ہونے کا عقیدہ منضم نہیں ہوتا جو صریحاً شرک ہے۔

(۶) اخیر میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ آثار نہ قولی ہیں نہ فعلی کہ ان کی تعمیم کی جائے اور ان سے یہ ثابت کیا جائے کہ ہر تکلیف یا مصیبت کے وقت احب الناس کو یاد کیا جائے، نیز یہ امر سلف سے ثابت بھی نہیں کہ مصیبت کے وقت ایسا کیا کرتے تھے! اور نہ یہ کسی مجتہد مسلّم الاجتہاد کا مذہب ہے کہ مصیبت کے وقت 'احب الناس' کو یاد کیا جائے تاکہ مشکل حل ہو جائے آفت ٹل جائے اور مصیبت دور ہو جائے۔ اس کے برخلاف ہم نے اوپر قرآن کریم سے اس بات کا ثبوت دیا ہے کہ مصیبت کے وقت ہر نبی نے حق تعالیٰ ہی کو پکارا، ان ہی سے اعانت چاہی اور غیر اللہ کا اس سلسلہ میں خیال بھی نہ آنے دیا، بآواز بلند کہا ؎

ایں بسکہ دلم جز تو ندارد کسے ‌ ‌ ‌ ‌ تو خواہ بدہ کام دلم خواہ مدہ[1]!

جن لوگوں کے قلوب میں غیر اللہ سے مدد سما گئی ہے اور یہ ان کی طبیعتوں میں رچ گئی ہے وہ

---

[1] جامی کا پہلا شعر یہ ہے ؎ یا من ملکوت کل شئ بیدہ ، طوبیٰ لمن ارتضاک ذخرا لغدہ۔

Marfat.com

ایک دوسری حدیث اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں: "حصن حصین میں حضرت[1] سے مروی ہے کہ آپ نے اس شخص کے متعلق جو راہ گم گشتہ ہو فرمایا کہ پکارے اعینونی یا عباد اللہ۔" "اے بندگانِ خدا تم میری مدد کرو" اس حدیث سے استناد کرکے کہا جاتا ہے کہ "ہم راہ گم گشتہ ہیں، ہم پکارتے ہیں: اعینونی یا عباد اللہ! یا غوث! یا خواجہ، یا نقشبند، یا بدوی، یا شاذلی ہماری مدد کرو!

حصن حصین کے الفاظ یہ ہیں: ان ارادعونا فلیقل یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی یا عباد اللہ اعینونی (رواہ طبرانی) اس حدیث سے جو استدلال کیا گیا ہے اس پر علماء حق نے جو تنقید کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:-

(۱) اس حدیث کی سند میں ایک راوی ابن حسان ہے جو محدثین کے نزدیک منکر الحدیث ہے اور ہیثمی نے اس کو ضعیف قرار دیا ہے!

(۲) اس کی سند منقطع بھی ہے، بیچ میں ایک راوی چھوٹ گیا ہے اور منقطع کا حکم مثل مرسل ہے اور محدثین اور اہلِ اثر کی جماعت کے نزدیک یہ حجت نہیں!

(۳) اس حدیث کے راویوں میں ایک راوی عتبہ بن غزوان ہے وہ مجہول الحال ہے یعنی اس کا تقویٰ اور عدل معلوم نہیں۔ چنانچہ تقریب ابن حجر میں اسی بنا پر استدلال کیا گیا ہے کہ جب اس حدیث کا ایک راوی ضعیف اور مجہول الحال ہو تو یہ نہ قابلِ اعتماد ہے اور نہ لائقِ استدلال!

(۴) جرح سے قطع نظر کرکے اگر ہم اس حدیث کو تسلیم بھی کرلیں تو ہم عقلِ سلیم کا واسطہ دے کر پوچھتے ہیں کہ کیا یہ اموات سے استعانت پر دلیل ہوسکتی ہے؟ عباد اللہ سے مراد تو فرشتے ہیں جو حفاظت کے لیے معین و مقرر ہیں۔ چنانچہ فیض القدیر شرح جامع الصغیر[2] میں اس کی یوں توضیح کی گئی ہے۔ ان للہ ملائکۃ فی الارض یسمون الحفظۃ یکتبون ما یقع فی الارض من ورق الشجرۃ فاذا اصاب احدکم عرجۃ واحتاج الی عون بفلاۃ من الارض فلیقل

[1] ابن بریدہؓ اور ابن مسعودؓ کے درمیان۔ [2] فیض القدیر ج ۱ ص ۳۰۷ مطبوعہ مصر ۱۳۵۶ء

اعینونی عباد اللہ رحمکم اللہ فانہ ان شاء اللہ یعان رواہ ابن السنی والطبرانی من حدیث الحسن بن عمر عن معروف ابن حسان[1] عن سعید ابن ابی عروبہ عن ابی بریدہ عن ابن مسعود قال ابن حجر حدیث غریب ومعروف قالوا منکر الحدیث وقد تفرد بہ وفیہ انقطاع بین ابی بریدہ وابن مسعودؓ یعنی اللہ کے کچھ فرشتے زمین میں مقرر ہیں جن کو حفظہ اور نگہبان کہتے ہیں، جو درخت کا پتہ زمین پر گرتا ہے اس کو لکھا کرتے ہیں تو جب ہم میں سے کسی کو تکلیف پہنچے اور مدد کا محتاج ہو زمین کے کسی صاف میدان میں تو اس کو چاہیے کہ یوں کہے کہ اے خدا کے بندو میری مدد کرو، اللہ تم پر رحم فرمائے، ایسے کہنے سے بیشک مدد حاصل ہوگی۔

دیکھو عباد اللہ سے مراد فرشتوں کا ہونا خود حدیث ہی سے ثابت ہے جو زندہ ہیں، اب اہلِ استمداد کا اموات کو اپنی مدد کے لیے پکارنا ان کی مشرکانہ طبیعت کی ایجاد ہے، حدیث سے اس کی اجازت کہاں نکلتی ہے ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ قرآنِ کریم نے مخلوق سے استعانت ان امور میں جائز رکھی ہے جو ان کی قوت و قدرت کے احاطہ میں ہوں، یہ استعانت بالمربوبیت یا عون مابین العباد ہے جب کسی کا گھوڑا بھاگ جائے یا کوئی چیز کھو جائے تو اس معاملہ میں ادنی لوگوں سے بھی مدد لی جاسکتی ہے جس امر میں مخلوق سے استعانت کرسکتے ہیں اس میں ملائکہ، ابدال اور جنوں سبھی سے مدد لی جاسکتی ہے۔ یہ زندہ مخلوق سے ان امور میں استعانت کرنا ہے جو ان کے دائرۂ قدرت میں شامل ہے۔ اب رہی وہ استعانت جو حق سے مخصوص ہے استعانت بالربوبیت وہ کسی طرح اس حدیث سے ثابت نہیں ہوسکتی اور نہ کسی ذی علم و ذی ہوش نے اس کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ استعانت عن الاموات کا یہاں تو شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔

(۵) بفرضِ محال ہم مان لیتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے اور اس سے بات بھی وہی ثابت ہوتی ہے جو اہلِ استمداد سمجھتے ہیں! دعا و استعانت کے متعلق اوپر جو تصریحات پیش کی گئیں

---

[1] منکر الحدیث (میزان ذہبی)

Marfat.com

ان کو پیشِ نظر رکھ کر یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ حدیث جو خبر واحد ہے قرآن مبین کے معارض و مخالف ہے اور اسی وجہ سے رد کر دی جانی چاہیے کیونکہ قرآن مقدم ہے، اس کا تقدم اس کی قطعیت، اس کے متواتر النظم ہونے اور اس کا سند کے محتاج نہ ہونے پر مبنی ہے۔

(۶) اس حدیث کے مخالف و معارض دوسری حدیث بھی اسی کتاب حصن حصین میں ملتی ہے جس کو طبرانی اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے: اذا اضاع له شیئاً او ابق فلیقل: اللهم راد الضالة وهادی الضلالة انت تهدی من الضلالة اردد علی ضالتی بقدرتك وسلطانك فانها من عطائك وفضلك۔ یعنی "جب آدمی کی کوئی چیز گم ہو جائے یا اس کا غلام بھاگ جائے تو یوں دعا کرے: "اے خدا جو پھیر لاتا ہے گم ہوئی چیز کو، اے بھولے بھٹکے کی راہ بتلانے والے تو ہی راہ بتلاتا ہے بھول اور گمراہی سے، واپس دلا دے مجھ کو میری گم ہوئی چیز اپنی قدرت اور غلبہ سے کہ وہ چیز تیری بخشش اور احسان سے تھی"۔

علاوہ بریں ابن عباسؓ سے جو حدیث مروی ہے اور جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے اس میں صاف طور پر حکم دیا ہے فاذا استعنت فاستعن باللہ یہ معارض و مخالف ہے حدیث اعینونی کے اور ظاہر ہے کہ حدیث ابن عباس موافق ہے فحوائے کلام مجید کے لہذا اس کو دوسری حدیث پر ترجیح ہونی چاہیے۔

کیا غضب ہے یہ اموات کے پرستار زندہ خدا کو چھوڑ کر مردوں سے استعانت کرتے نہیں شرماتے اور اپنی بے شرمی کو رفع کرنے کے لیے کتاب و سنت سے دلائل تلاش کرنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں! لیکن کتاب و سنت سے تو بس یہی ثابت ہوتا ہے کہ مَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ (بقرہ-۱۰۷) دیکھو حضرت جامیؒ نے اسی بات کو کس خوبی سے ادا کر دیا ہے:-

حق فاعل و ہر چہ جز حق آلات بود   تاثیر ز آلت از محالات بود
ہستی کہ موثر حقیقی ست یکیست   باقی ہمہ اوہام و خیالات بود

ندا اور استعانت کی تائید میں اہلِ استمداد ایک اور حدیث پیش کرتے ہیں، سوال خود پیش

Marfat.com

کر کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے "یا رسول اللہ! یا غوث! پکارنا بھی کیا ناجائز نہیں؟ شرک نہیں؟ ترمذی، نسائی، طبرانی، ابن خزیمہ، حاکم، بیہقی نے یہ دعا روایت کی ہے: اللھم انی اسألك واتوجه الیك بحبیبك المصطفیٰ عندك یا حبیبنا یا محمد انا نتوسل بك الی ربك فاشفع لنا عند المولیٰ العظیم یا نعم الرسول الطاھر۔ اللھم شفعه فینا بجاھه عندك۔ اس دعا میں یا محمد کی ندا ہے اور حضرت عثمان کے زمانہ میں بھی اس دعا کو صحابہؓ نے خود پڑھا اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی" تو سوال کا جواب یہ ہوا کہ یا رسول، یا غوث پکارنا شرک نہیں جائز ہے اور ادھر بھی دو حدیثوں سے استدلال کر کے اہل استمداد نے اپنی دانست میں ثابت کر دیا ہے کہ یا خواجہ یا بدوی، یا شاذلی، یا نقشبند پکارنا جائز ہے۔

اس حدیث کی تحقیق یہ ہے:-

(۱) مروی ہے ایک اندھے نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ میرے لیے حق تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ مجھے اس مرض سے شفا دیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تو چاہے تو میں دعا کروں اور چاہے تو نابینائی پر صبر کر کہ تیرے حق میں یہی بہتر ہے۔ اس نے عرض کیا کہ میرے لیے دعا ہی کیجیے۔ آپ نے خود دعا نہیں فرمائی بلکہ حکم دیا کہ وضو کرے اور پھر ارشاد فرمایا کہ یہ دعا پڑھے:- اللھم انی اسئلك واتوجه الیك بنبیك نبی الرحمة یا محمد انی اتوجه بك الی ربی فی حاجتی ھذہ لتقضی لی فشفعه فیّ[1] (ترمذی) نسائی، ابن ماجہ، حاکم نے روایت کی) اس نے یہ دعا پڑھی اور بینا ہو گیا۔ (کذا فی المشکوٰۃ)

(۲) یہ حدیث اعتقاد کے بارے میں قابلِ استدلال نہیں کیونکہ اس کا ایک راوی عثمان بن خالد متروک الحدیث ہے۔ فقہا و محدثین کے نزدیک ایسے راوی کی نقل قابلِ حجت نہیں۔ چنانچہ نووی کی تقریب اور اس کی شرح تدریب الراوی میں یہ مسئلہ مصرح ہے۔

---

[1] یا اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں اپنی حاجت اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں بذریعہ تیرے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ نبی رحمت ہیں۔ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں متوجہ ہوتا ہوں اپنے پروردگار کی طرف آپ کے ذریعے سے اپنی اس حاجت میں تاکہ میرے حق میں حاجت روائی کی جائے۔ الٰہی تو ان کی شفاعت میرے حق میں قبول فرما۔

Marfat.com

(۳) اگر ہم اس حدیث کو بفرضِ محال قابلِ استدلال بھی مان لیں تو اس سے محض توسل ثابت ہوتا ہے نہ یہ کہ جب کوئی اس ندا اور خطاب سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ بارگاہِ خداوندی میں پیش کرتا ہے تو آپ اس کی آواز سنتے ہیں جیسا کہ اہل استمداد ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ توسل میں کیا ہوتا ہے؟ متوسل کرتا کیا ہے؟ وہ طلبِ حاجت کرتا ہے اسی ذات سے جو عطا و منع میں مستقل و منفرد ہے جو صاحبِ امر و نہی ہے، جس کے ہاتھ میں ہر شے کا "ملکوت" ہے اور طلب سے پہلے ایک سبب اجابت کو آگے کر دیتا ہے۔ جیسا کہ صحیحین میں قصہ ان تین آدمیوں کا آیا ہے جو ایک غار میں بند ہو گئے تھے۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنے سب سے اچھے عمل کے ساتھ توسل کیا اور وہ پتھر غار کے منہ سے ہٹ گیا۔ اگر یہ توسل بہ اعمالِ فاضلہ جائز نہ ہوتا یا شرک ہوتا تو حق تعالیٰ ان کی دعا کو قبول نہ فرماتے نہ حضور انور اس حکایت کے بعد سکوت فرماتے۔

لیکن اگر متوسل یہ سمجھے کہ انبیاء یا ملائکہ ایسا واسطہ اور وسیلہ ہیں کہ جن کو پکارنا اور ان پر بھروسہ کرنا ضروری ہے اور جلبِ نفع اور دفع ضرر کے لیے ان کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور ان کی تعظیم بجا لانا چاہیے تو یہ سب سے بڑا شرک ہے۔ حق تعالیٰ نے اس کے رد میں بہت ساری آیتیں نازل فرمائیں۔ کفار و مشرکینِ مکہ نے اللہ کے سوا اوروں کو اپنا شفیع اور حمایتی قرار دے رکھا تھا، نفع حاصل کرنے اور ضرر دفع کرنے کے لیے ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، مشرکین یہود و نصاریٰ، مسیح اور عزیر اور ملائکہ کو پکارتے تھے، استغاثہ کرتے تھے۔ حق تعالیٰ نے ان کے متعلق صاف طور پر صراحت فرما دی کہ فَلَا يَمْلِكُونَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيلًا۔

دیکھو بادشاہ اور رعایا کے درمیان عرض معروض کے لیے چوبدار عرض بیگی ہوتے ہیں جو بادشاہ کے کانوں تک رعایا کا درد دکھ پہنچاتے ہیں، اگر کوئی انبیاء و اولیاء کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ یہ بھی حق تعالیٰ کی جناب میں خلق کی حاجتوں کو پہنچاتے ہیں، ان کے درد دکھ کو سناتے ہیں اور حق تعالیٰ خلق کی جو حاجت روائی کرتے ہیں، ان کو رزق دیتے ہیں، ہدایت کرتے ہیں تو ان ہی کے واسطے سے لہٰذا خلق کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان ہی سے حاجت طلب

کریں اور وہ حق تعالیٰ سے عرض کریں جیسے کہ عرض بیگی بادشاہوں سے کرتے ہیں۔ تو ایسا عقیدہ رکھنے والا باتفاق اہل اسلام کافر و مشرک ہے۔ بعینہٖ یہی دین مشرکین کا ہے جو بت پرست ہیں، وہ اپنے بتوں کو انبیاء و صالحین ہی کی صورتوں پر بناتے تھے اور ان کو اپنے اور حق تعالیٰ کے درمیان واسطہ اور وسیلہ قرار دیتے تھے جو ان کو حق تعالیٰ سے قریب کر سکتے تھے۔ (کما صرح ص ۸ و ۱۵)[1] اور یہی وہ شرک ہے جس کی وجہ سے نصاریٰ معتوب ہوئے۔ ان کے متعلق قرآن مبین نے صراحت کی ہے۔ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَرُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَالْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰھًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ سُبْحٰنَہٗ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ[2] (پ ۱۰ ع ۱۱) غرض حق تعالیٰ نے اس توحید کو قرآنِ کریم میں جا بجا بیان فرمایا ہے اور شرک کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ پھینکا ہے اور اس کی اصل صرف اتنی ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا کسی سے خوف نہ کرے اور نہ کسی سے اُمید رکھے اور نہ کسی کو ان کے سوا اپنے کاموں میں کافی جانے ؎

موحد کہ در پائے ریزی زرش   وگر آرہ می نہی بر سرش

اُمید و ہراسش نہ باشد زکس   ہمیں است بنیاد توحید وبس

ذرا اس واسطہ یا وسیلہ کے مسئلہ پر عقلی پہلو سے بھی غور کر لو، عالمِ خارجی کی بادشاہت پر نظر ڈالو، یہاں بادشاہ اور رعایا کے درمیان وسائط تین ہی قسم کے ہوتے ہیں (۱) چونکہ خود بادشاہ اپنی تمام رعایا کے احوال کی خبر نہیں رکھ سکتا اس کو ایسے وسائل کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو رعایا کے حال کی خبر دیتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا کوئی واسطہ خدا اور بندوں کے درمیان فرض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ حق تعالیٰ پر کوئی چیز مخفی نہیں ہے۔ زمین و آسمان کا کوئی ذرہ ان کے علمِ محیط سے باہر نہیں، وہ سمیعٌ و بصیرٌ و علیمٌ ہیں اور بنفسہٖ ھو بکل شیء علیم ہر شئے سے

---

[1] من جعل بینہ وبین اللہ وسائط یتوکل علیھم ویدعوھم کفر اجماعًا لان ذلک کفعل عابدی الاصنام قائلین ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفٰی۔ (اقناع امداس کی شرح دیکھو)

[2] انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو رب بنا رکھا ہے اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ ان کو صرف یہ حکم کیا گیا ہے کہ فقط ایک معبود کی عبادت کیا کریں جس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں۔ وہ ان کے شرک سے پاک ہے۔

واقف!

(۲) چونکہ بادشاہ اکیلا سارے ملک کا انتظام نہیں کر سکتا اور نہ ہی تنہا اپنے دشمنوں سے جنگ کر سکتا ہے، لہٰذا اس کو اعوان و انصار کی ضرورت ہوتی ہے لیکن حق تعالیٰ کو نہ کسی ناصر و مددگار کی ضرورت ہے اور نہ کسی معین، ظہیر کی، وہ کائنات کے تمام اسباب و آلات کے خالق، رب، مالک ہیں، ان کی ذات تمام اشیاء سے غنی و بے نیاز ہے، سارا عالم ان کا فقیر و محتاج ہے، مملوک و مربوب ہے۔

(۳) چونکہ بادشاہ اپنی رعایا کی نفع رسانی اور خبر گیری میں سستی اور غفلت کر سکتا ہے، لہٰذا اس کو کسی ایسے محرک کی ضرورت ہے جو اس کو اپنے فرائض کی ادائی پر آمادہ کرے لیکن اس قسم کے کسی محرک کی حق تعالیٰ کو ضرورت نہیں کیونکہ وہ خود خلق پر ماں باپ سے زیادہ رحیم ہیں۔

عقائد کے ان بدیہیات کو ماننے کے بعد اگر کوئی یہ خیال کرے کہ حق تعالیٰ اور ان کے بندوں کے درمیان ان وسائط کی ضرورت ہے جو سلاطین اور رعایا کے درمیان ضروری ہیں اور وہ وسائط انبیاء، اولیاء، ملائک یا اور موجودات ہیں تو وہ کھلا بُت پرست ہے جو اپنے اصنام اور اولیاء کو حق تعالیٰ کے دربار میں شفیع، وکیل، حمایتی، مقرب سمجھتا ہے اور اسی خاطر ان کی عبادت کرتا ہے! وہ خالقِ اکبر کو مخلوقِ ابتر کے مشابہ سمجھتا ہے جو بغیر اپنے اعوان و انصار کے، بغیر اپنے معین و ظہیر کے کائنات کا انتظام ہی نہیں کر سکتا۔ فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ، تعالی اللہ عن ذٰلک علواً کبیرا۔[1]

شفاعت اسی سلسلہ میں شفاعت کا صحیح طور پر علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ شفاعت کے معنی ہیں سفارش، دنیا میں سفارش یا شفاعت کئی قسم کی ہوتی ہے۔

(۱) شفاعتِ وجاہت: بادشاہ کے دربار کا ایک امیر، بادشاہ کے پاس ایک چور کی سفارش کرتا ہے جس کی چوری ثابت ہے، بادشاہ سزا دینا چاہتا ہے لیکن اس امیر کی سفارش سے دب کر اس چور کی تقصیر کو معاف کر دیتا ہے تاکہ امیر کی ناخوشی کی وجہ سے امورِ سلطنت میں خلل نہ پڑے۔

---

[1] ان امور کی مزید توضیح کے لیے دیکھو ابن تیمیہ کا رسالہ قاعدہ واسطیہ جو توسل پر ایک بے نظیر رسالہ ہے۔ جس سے ہم نے یہاں استفادہ کیا ہے۔

Marfat.com

ظاہر ہے کہ جو شخص کسی فرشتے یا نبی یا ولی کو حق تعالیٰ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھتا ہے وہ سخت جاہل اور کھلا مشرک ہے۔

(۲) شفاعتِ محبت :۔ اس چور کی سفارش بادشاہ کا کوئی معشوق یا منظورِ نظر کرتا ہے اور بادشاہ اس کی محبت سے ناچار ہو کر چور کو معاف کر دیتا ہے اور اپنا غصہ پی جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی بھی شفاعت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تصور نہیں کی جا سکتی۔ بندہ اپنی عبودیت کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا!

(۳) شفاعت بالاذن: اس چور کی سفارش بادشاہ کی مرضی پا کر، اس کی اجازت سے کی جاتی ہے نہ اس وجہ سے کہ سفارش کرنے والا اس کا قرابتی ہے یا آشنا یا حمایتی۔ بس یہی ایک شفاعت حق تعالیٰ کی بارگاہ میں ممکن ہے۔ اسی کا ذکر قرآن کریم و احادیثِ نبوی میں آیا ہے۔ شفاعت بالاذن کے متعلق مندرجہ ذیل چند امور کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

(۱) شفاعت نہ ہوگی مگر حق تعالیٰ کے اذن سے! ان آیات سے اس کی توضیح ہوتی ہے:۔

ا۔ یَوْمَئِذٍ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَهٗ قَوْلًا (پ ۱۶ ع ۱۵) اس روز سفارش نفع نہ دیگی مگر اس شخص کے لیے جس کے واسطے اللہ تعالیٰ نے اجازت دیدی ہو اور اس شخص کے واسطے بولنا پسند کر لیا ہو!

ب۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (پ ۳ ع ۲) ایسا کون شخص ہے جو اس کے پاس سفارش کر سکے بدوں اس کی اجازت کے۔

ج۔ لَا تُغْنِیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ یَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَرْضٰی (پ ۲۷ ع ۷) یعنی ان کی سفارش ذرا بھی کام نہیں آ سکتی مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہیں اجازت دیدیں اور راضی ہوں۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ شفاعت حق تعالیٰ کے حکم و اجازت سے ہوگی نہ شفیع کی مختاری و خود رائی سے کہ اپنے جس دوست کے حق میں چاہا بغیر مرضیِ حق کے معلوم کرنے اور بدون اجازت سفارش کر دی۔

Marfat.com

کفار و مشرکین یہی سمجھتے تھے کہ ان کے معبود ان کی سفارش کرینگے اور عذاب سے بچا لینگے اس سفارش کو حق تعالیٰ باطل کر رہے ہیں اور جس سفارش کو ثابت کر رہے ہیں وہ اس بندۂ محکوم کی شفاعت ہے، جو اپنے مالک و مولیٰ کے سامنے بدون اس کی اجازت و امر کے پیشقدمی نہیں کرتا۔ پہلی قسم کی شفاعت "شریک" کی شفاعت ہے اور حق تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں، دوسری قسم کی شفاعت بندۂ محکوم کی ہے و شتان بین ذٰلک۔ جب یہ بات سمجھ میں آگئی ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے اسی کے واسطے سفارش کا حکم دینگے تو یہ بات بھی کھل جاتی ہے کہ واقع میں سفارش حق تعالیٰ ہی کی ہوئی اور جو شخص ان کے سامنے سفارش کریگا وہ ان کے امر و اجازت سے کریگا۔ ابن قیم کے الفاظ میں " وہ ذات پاک خود اپنے نفس سے سفارش کریگی یعنی اپنے آپ ہی بندہ پر رحم کرنا منظور ہوگا۔ یہی معنی ہیں قُلْ لِلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا کے اور نیز اس آیت کے مَا لَھُمْ مِّنْ دُوْنِہٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ اللہ کے سوا نہ کوئی ولی ہے اور نہ شفیع" اور جس نے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا ولی و شفیع ٹھہرایا، اس کی مثال ایک مکڑی کی سی ہے جس نے ایک گھر بنایا جو سب سے زیادہ بودا اور کمزور ہے!! تھوڑی دیر کے لیے اس آیت پر غور کرو، شرک فی التصرف اور شفاعت کو کس خوبی سے رد کیا جا رہا ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِیْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ وَمَا لَھُمْ فِیْھِمَا مِنْ شِرْکٍ وَّمَا لَہٗ مِنْھُمْ مِّنْ ظَھِیْرٍ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَہٗ۔ یعنی آپ فرمائیے کہ جن کو تم خدا کے سوا سمجھ رہے ہو ان کو پکارو، وہ ذرہ برابر اختیار نہیں رکھتے، نہ آسمانوں میں اور نہ زمینوں میں اور نہ ان کی ان دونوں میں کوئی شرکت ہے اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے اور خدا کے سامنے سفارش کسی کی کام نہیں آتی مگر اس کے لیے جس کی نسبت وہ اجازت دیدے (پ ۲۲ ع ۹) مشرک نے جس کو اپنا معبود قرار دے رکھا ہے اس سے وہ نفع کی امید کرتا ہے اور نفع اسی سے پہنچ سکتا ہے جس میں ان چار صفات میں سے کم از کم ایک صفت ہوتی ہے

۱- یا تو وہ اس شے کا مالک ہو جس کی امید یہ عابد کر رہا ہے اور جس کے لیے وہ دعا کر رہا ہے۔

۲- اگر مالک نہ ہو تو مالک کا "شریک" ہو۔

۳۔ اگر شریک بھی نہ ہو تو کم از کم اس کا معین وظہیر یعنی مددگار ہو۔

۴۔ اگر معین وظہیر بھی نہ ہو مالک کے نزدیک شفیع ہو۔ (ابن قیم)

ان ہی چار صورتوں میں عابد کو اپنے معبود سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اب حق تعالیٰ ان چاروں کی ترتیب وار نفی فرمارہے ہیں، اعلیٰ صفت سے شروع کرکے ادنیٰ صفت کی طرف رجوع فرماتے ہیں، ملک وشرکت ومظاہرت (مددگاری) وشفاعت کی کلی نفی فرماتے ہیں اور اس شفاعت کا اثبات کیا جارہا ہے جس سے مشرک کو کوئی فائدہ نہیں اور یہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے اذن سے ہوگی۔ یہ آیت ایک نور ہے، برہان ہے۔ اس سے توحید کا قطعی اثبات ہوتا ہے اور شرک کی ساری جڑیں کٹ جاتی ہیں۔

(۲) اذن نہ ہوگا مگر اس شخص کے لیے جس کے قول وفعل کو حق تعالیٰ پسند فرمائینگے۔

حق تعالیٰ شفاعت کا حکم اسی شخص کی نسبت عطا فرمائینگے جو قول وفعل کے لحاظ سے ان کا پسندیدہ ہوگا۔ لَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی (پ ۲۶) یعنی جن کو شفاعت کا اذن دیا گیا ہے وہ بجز اس کے جس کے لیے خدائے تعالیٰ کی مرضی ہو اور کسی کی سفارش نہیں کرسکتے۔

(۳) کسی کا قول وعمل پسند نہ ہوگا مگر توحید واتباعِ رسول۔

ابوالعالیہ فرماتے ہیں کلمتان یسئل عنهما الاولون والاخرون، ماذا کنتم تعبدون وماذا اجبتم المرسلین۔ یعنی دو باتوں کا تمام اولین وآخرین سے سوال کیا جائیگا، تم کس کی عبادت کرتے تھے اور تم نے رسولوں کی کن کن باتوں پر عمل کیا؟ حدیث ابوہریرہ میں آیا ہے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ من اسعد الناس بشفاعتك یارسول اللہ۔ آپ نے فرمایا من قال لا الٰہ الا اللہ خالصا من قلبہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شفاعت اہلِ اخلاص کے لیے ہوگی جنھوں نے کوئی شرک نہیں کیا۔ بخاری نے ابوہریرہؓ سے جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ شفاعتی لمن قال لا الٰہ الا اللہ مخلصا یصدق قلبہ لسانہ ولسانہ قلبہ۔ اس کو امام احمد نے صحیح کہا ہے۔ مسلم نے جو روایت ابوہریرہ سے کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

Marfat.com

انی اختبات دعوتی شفاعۃ لامتی یوم القیامۃ فھی نائلۃ ان شاء اللہ، من مات لایشرک باللہ شیئا۔

شفاعت کے متعلق ان تین اصول کو سمجھ جانے کے بعد شرک کا استیصال ہو جاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر جس نے یہ سمجھ لیا کہ شفاعت حق تعالیٰ ہی کے حکم و اجازت سے ہوگی اور اسی کے لیے ہوگی جس کے قول و فعل کو وہ پسند کرتے ہوں گے اور وہی قول و فعل ان کو پسند ہوگا جو شرک و بدعت سے منزّہ اور توحید و سنت کے مطابق ہو تو اب وہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا شفیع کیسے ٹھہرا سکتا ہے اور مشرکین کی طرح ھٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللہِ کا کب قائل ہو سکتا ہے، حق تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف کس طرح اپنے قلب کو رجوع کر سکتا ہے، وہ جانتا ہے کہ افضل ترین مخلوقات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہِ خداوندی میں سجدہ ریز ہونگے، اپنے رب، اپنے مولیٰ و مالک کی حمد و ثنا میں رطب اللسان ہونگے لیکن سجدہ سے سر نہ اٹھائینگے اور شفاعت کے لیے اس وقت تک زبان نہ کھولینگے جب تک کہ حق تعالیٰ کی اجازت نہ ہوگی کہ "قل تسمع واشفع تشفع وسل تعطہ[1]۔ پھر آپ نے تصریح فرمادی کہ فیحد لی حدًا، کہ میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی یعنی آپ شفاعت ان ہی کی فرمائینگے جن کا قول و فعل حق تعالیٰ کو پسند ہوگا، یعنی جو مشرک نہ ہوگا جس نے صدق دل سے توحیدِ الوہیت کا اقرار کیا ہوگا! اسی کی شفاعت کا اذن ہوگا اور اس کی شفاعت کی جائیگی اور اسی پر حق تعالیٰ رحم کرنا منظور فرمائینگے!! اسی کی بالآخر نجات ہوگی! جب اذنِ شفاعت دینے والے حق تعالیٰ ہی ہیں، اور قبول کرنے والے بھی وہی ہیں، مشفوع لہ کو ایسے کاموں کی توفیق دینے والے بھی وہی ہیں جس کی وجہ سے وہ مستحقِ شفاعت ٹھہرتا ہے تو پھر صاف ظاہر ہے کہ شفاعت درحقیقت حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتی ہے! قُلْ لِلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا کے یہی معنی ہیں! یہی وجہ ہے کہ جس شخص نے اپنے اللہ ہی کو معبود ٹھہرایا، اسی کے لیے اذنِ شفاعت ہوگا، اور جس نے غیر اللہ کو معبود ٹھہرایا اس کی نہ کوئی شفاعت کریگا اور نہ کوئی شفاعت اس کے ....

[1] متفق علیہ کہہ سنا جائیگا۔ شفاعت کر قبول کی جائیگی۔ مانگ دیا جائیگا۔

لیے مفید ہوگی۔ ان ہی "متخذین شفعاء" کو مخاطب کرکے فرمایا گیا ہے: قُلْ اَتُنَبِّئُوْنَ اللّٰہَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ سُبْحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ۔ یعنی کیا تم خدا کو ایسی چیز کی خبر دیتے ہو جو خدا کو معلوم نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں، وہ پاک اور برتر ہے ان لوگوں کے شرک سے (پ۱۱ ع)، اس طرح ان کے افترا و شرک کو ظاہر فرمادیا!

نذر لغیر اللہ مشرکین کی عبادت کا ایک اور عمل جس پر ہمارے مقالہ کے آخر میں بحث کرنی باقی ہے وہ "نذر لغیر اللہ" ہے۔ مشرکین اپنے مال کا ایک حصہ غیر اللہ کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے، ان کے لیے جانور ذبح کرتے تھے، اس طرح ان کی تعظیم و تکریم کرتے تھے: وَجَعَلُوْا لِلّٰہِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا ھٰذَا لِلّٰہِ بِزَعْمِھِمْ وَھٰذَا لِشُرَکَآئِنَا (پ ع ۳) اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مواشی پیدا کیے ہیں، ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کا ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا "ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَیَجْعَلُوْنَ لِمَا لَا یَعْلَمُوْنَ نَصِیْبًا مِّمَّا رَزَقْنٰھُمْ تَاللّٰہِ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا کُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ (پ ع ۱۳)

یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں ان کا حصہ لگاتے ہیں جن کے متعلق ان کو کچھ علم نہیں، قسم ہو خدا کی تم سے تمہاری ان افترا پردازیوں کی ضرور باز پرس ہوگی۔

حضرت شاہ عبدالقادرؒ ان آیات کی تفسیر میں صراحت فرماتے ہیں کہ "کافر اپنی کھیتی اور مواشی کے بچوں میں اور تجارت میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے تھے جنہیں وہ اپنی جہالت اور بے خبری سے معبود، یا مالکِ نفع و ضرر سمجھتے تھے حق تعالیٰ ان کے اس ظلم اور بے انصافی اور افترا پردازی کی مذمت فرمارہے ہیں۔

نذر و نیاز کا رواج اسلام کی "غربت" کے اس زمانہ میں اس کثرت سے ہوگیا ہے کہ ہمیں یہاں اس کی تحقیق ضروری نظر آتی ہے۔ ہر زمانہ کے مشرکین کے قلوب میں ایک نمایاں تشابہ ہوتا ہے، وہ وہی بات کہتے ہیں اور وہی عمل کرتے ہیں جو ان سے پہلے گزرنے والے مشرکین نے کہی تھی اور اس پر عمل کیا تھا "کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ مِّثْلَ قَوْلِھِمْ تَشَابَھَتْ قُلُوْبُھُمْ (پ ع ۱۴)

Marfat.com

نذر (نیاز) لغت میں وعدہ کرنا ہے نیکی کا ہو یا بدی کا اور شرع میں کسی عبادت کا لازم کر لینا ہے جو لازم نہیں تھی۔ نذرت نذرًا اذا اوجبت علی نفسک شیئًا تبرعًا من عبادۃ او صدقۃ او غیر ذالک (نہایہ) تمام فقہاء نے اس امر کی تصریح کی ہے کہ نذر اللہ کی قربت اور عبادت ہے۔ چنانچہ قاضی حسین اور متولی اور رافعی، اور سوا ان کے دوسرے علماء شافعیہ اور زین الدین بن نجیم اور علامہ قاسم وغیرہ علمائے حنفیہ نے اپنی تصانیف میں اسی کی صراحت کی ہے اور

وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ (پ۳ ع۵) — اور تم لوگ جو کسی قسم کا خرچ کرتے ہو یا کسی طرح کی نذر مانتے ہو تو حق تعالیٰ کو سب کی یقیناً اطلاع ہے۔

سے بھی یہی بات مترشح ہوتی ہے۔ چنانچہ تفسیر ابو المسعود میں وضاحت کی گئی ہے کہ او نذرتم، النذر عقد الضمیر علی شیء والتزامہ" یعنی نذر دل میں کسی چیز کا ارادہ کرنا اور اس کو لازم کر لینا ہے۔

جب نذر عبادت ہوئی تو غیر اللہ کے لیے اس عبادت کا بجا لانا شرعاً صریح شرک ہے۔ عوام الناس بزرگوں کی جو نذر و نیاز کرتے ہیں وہ حاجت برآری کے خیال ہی سے کرتے ہیں یا تو کسی مقصد کا حصول پیشِ نظر ہوتا ہے یا پھر کسی بلا کا ٹالنا، گویا اس طرح وہ ان بزرگوں کو رشوت دینا چاہتے ہیں، اس خیال سے تو حق تعالیٰ کی نذر بھی روا نہیں کہ وہ ذاتِ مقدس بھی اخذِ رشوت سے پاک ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابنِ عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لا تنذروا فان النذر لا یغنی من القدر شیئًا وانما یستخرج بہ من البخیل (متفق علیہ) یعنی نذر نہ مانو اس لیے کہ نذر تقدیر کے نوشتے کو نہیں مٹا سکتی، اس کے ذریعہ تو فقط بخیل کا مال نکالا جاتا ہے۔ طیبی نے اس حدیث کی شرح میں وضاحت کر دی ہے کہ "جس نذر سے روکا گیا ہے وہ نذر مقید ہے جس کا ماننے والا یہ خیال کرتا ہے کہ وہ تقدیر کے لکھے سے بچا لیتی ہے، جیسا کہ بہت لوگوں نے سمجھ رکھا ہے اور ہم اپنے زمانہ کی کتنی جماعتوں کو اسی اعتقاد پر پاتے ہیں"۔

غرض عوام جو بزرگوں کی نذر کرتے ہیں ان سے پوچھنا چاہیے کہ تمہاری اس نذر کا مقصد کیا ہے؟

ف مقابلہ کرو شامی ج ۲ ص ۱۳۹، والنذر للمخلوق لا یجوز لانہ عبادۃ والعبادۃ لا تکون للمخلوق۔

۱۔ تقرب اور عبادت؟ یہ تو صریحاً شرک ہے۔

۲۔ مقصود یابی اور حاجت براری؟ یہ بھی شرک و حرمت دونوں پر مشتمل ہے۔

۳۔ ایصال ثواب؟ ہاں یہ جائز ہے، لیکن یہاں نیت کی تصحیح سخت ضروری ہے، غور کرو، تمہیں خود اپنی نجات کی فکر کرنی چاہیے، خود ثواب کمانے پر مائل ہونا چاہیے اس کو چھوڑ کر تمہیں دوسروں کو ثواب پہنچانے کی فکر زیادہ دامن گیر معلوم ہوتی ہے اور پھر تمہارے آباؤ اجداد اس امر کے زیادہ مستحق ہیں کہ تم اُنہیں ثواب پہنچاؤ، اس کا تم کو زیادہ خیال نہیں ہوتا، پیروں اور شہیدوں کی نیاز اور فاتحہ التزام کے ساتھ کرتے ہو، ذرا اپنے قلب کی طرف ایمان کی روشنی میں دیکھو، کیا تمہاری غرض یہ تو نہیں کہ ایسا کرنے سے تمہارے مال میں برکت ہوگی، بال بچے تندرست اور عافیت سے رہیں گے، تجارت میں خسارہ نہ ہوگا، زمانہ کے لکد کوب سے نجات ملیگی۔ اگر تم اس غرض سے نذر و نیاز بزرگوں کی کیا کرتے ہو (مثلاً حضرت پیرؒ کی گیارہویں یا کنڈوری دسترخوان یا سرمنی) تو مشرکین کی طرح تم ان بزرگوں کو اپنا معبود بنا رہے ہو، ان کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ رہے ہو، اور یہ کھلا شرک ہے! اس کی تصریح قرآن و حدیث سے اوپر تفصیل کے ساتھ کی گئی ہے۔ علامہ قاسم شارح درر کے اس بیان پر غور کرو۔

النذر الذی ینذرہ اکثر العوام کان یقول یا سیدی فلان یعنی بدر و لیا او نبیا ان ردغائبی او عوفی مریضی او قضیت حاجتی فلک من الذھب او الفضۃ او الطعام والشراب او الزیت کذا فھذا باطل بالاجماع لانہ نذر مخلوق وھو لایجوز، لان النذر عبادۃ والعبادۃ لایکون لمخلوق والمنذور لہ میت والمیت لایملک وانہ ان ظن ان المیت یتصرف فی الامور کفر الا ان قال: یا اللہ انی نذرت لک ان فعلت معی کذا ان اطعم الفقراء الذین بباب السیدۃ النفیسۃ او الامام الشافعی ونحوہ فیجوز حیث یکون فیہ نفعا للفقراء والنذر للہ۔

یعنی وہ نذر جو عوام الناس کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں کہ اے میرے بزرگ (کسی ولی یا نبی کو مخاطب کرکے) اگر میرا غائب واپس آجائے یا بیمار اچھا ہو جائے، یا میری حاجت بر آئے تو آپ کے لیے اتنا سونا

Marfat.com

یا چاندی یا طعام و شربت یا تیل بطور نذر پیش کرونگا۔ سو یہ باطل ہے بالاجماع، اس لیے کہ یہ مخلوق کی نذر ہے اور یہ جائز نہیں کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کی روا نہیں، جس کے لیے نذر مانی ہے وہ میت ہے اور میت کسی چیز کا مالک نہیں، اور اگر اس کے ساتھ ساتھ وہ نذر ماننے والا یہ بھی خیال کرے کہ میت کو کاموں میں اختیار حاصل ہے تو وہ کافر ہو جائے۔ ہاں اگر وہ یہ کہے کہ "یا اللہ میں نے تیری نذر کی کہ اگر تو میرے ساتھ یہ معاملہ کرے تو میں سدہ نفیسہ والے فقیروں کو کھانا کھلاؤنگا، یا امام شافعیؒ کے دروازے والوں کو کھانا دونگا" تو یہ جائز ہے کیونکہ اس میں نفع ہے فقیروں کا اور نذر ہے اللہ عزوجل کی"۔

دیکھو اس بیان کا تجزیہ کرنے سے مندرجہ ذیل امور واضح طور پر پیش ہو جاتے ہیں۔

۱۔ عوام کالانعام جو نذر اپنے پیروں، بزرگوں کی حاجت براری کی خاطر کرتے ہیں وہ بالاجماع باطل ہے اور قطعاً شرک ہے، کیونکہ

۲۔ مخلوق کی نذر کسی معنی میں جائز نہیں اس لیے کہ وہ عبادت ہے اور سوائے خالق کے کسی کے لیے روا نہیں۔

۳۔ عوام کی غرض بزرگوں کی نذر و نیاز سے یہی ہوتی ہے کہ آفات و بلیات سے وہ محفوظ رہیں، مال و دولت میں اضافہ ہو، صحت و عافیت حاصل ہو، اگر وہ زبان سے اس امر کا اقرار بھی کریں کہ ہمیں صرف ایصال ثواب ہی منظور ہے تو بھی وہ اپنے نفس کو دھوکہ دے رہے ہیں، انہیں ایمانداری کے ساتھ اپنے نفس کا محاسبہ کرنا چاہیے۔

۴۔ یہ بھی کہنا درست نہیں کہ یہ فلاں ولی یا نبی کی نذر ہے بلکہ انہیں یہ کہنا چاہیے کہ یہ اللہ کی ہے اور ثواب اس کا فلاں کو پہنچے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ کسی نبی یا ولی کی نذر مانی بھی جائے تو وہ منعقد نہیں ہوتی کیونکہ لا وفاء لنذر فی معصیۃ[1]۔ یعنی نذر معصیت کی وفا ضروری نہیں۔ اور ظاہر ہے

---

[1] یہ حدیث مسلم بن عمران بن حصین سے مرفوعاً مروی ہے۔

کہ عبادت غیر اللہ معصیت ہے اور نذر منجملہ عبادات ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ "من نذر ان یطیع اللہ فلیطعہ ومن نذر ان یعصیہ فلا یعصہ" جس نے اللہ کی اطاعت کی نذر کی اس کو چاہیے کہ اطاعت کر کے اپنی نذر پوری کرے اور جو اللہ کی نافرمانی کی نذر کرے وہ نافرمانی نہ کرے۔

توحیدِ الوہیت کی جو تفصیل اوپر پیش کی گئی اس کا خلاصہ صرف اتنا ہے کہ دعویٰ کلمہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی رو سے اللہ تعالیٰ ہی ہمارے الٰہ قرار پاتے ہیں، الٰہ کے معنی ہیں معبود و رب، یعنی اللہ تعالیٰ ہی ہمارے معبود ہیں اور ہمارے رب، اللہ تعالیٰ کے سوا ہمارا نہ کوئی معبود اور نہ کوئی رب یا مستعان۔ توحیدِ الوہیت میں یہی "توحیدِ معبودیت" و "توحید ربوبیت" شامل و داخل ہیں۔ شرک واقع ہوتا ہے عبادت و استعانت ہی کی راہ سے، یعنی اگر غیر اللہ کی عبادت کی جائے، یا اس سے استعانت کی جائے تو شرک پیدا ہوتا ہے۔ دیکھو قُلْ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّ اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ (پ ۶ ع ۸) سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شرک الوہیت ہی کی راہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئًا سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی عبادت شرک ہے اور قل انما ادعوا ربی ولا اشرک بہ احدا سے واضح ہوتا ہے غیر اللہ کو پکارنا (دعاء و ندا) شرک ہے ایاک نعبد و ایاک نستعین کی تعلیم دے کر عبادت و استعانت کو بطریق حصر حق تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص کر دیا گیا اور اس طرح توحیدِ الوہیت کی کامل حفاظت کر دی گئی۔

توحیدِ الوہیت کے اس معنی کو پیش نظر رکھ کر مشرکین عرب کی عبادت پر غور کیا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ اپنے اصنام و اوثان (غیر اللہ) کو مقرب و شفیع جان کر ان سے وقت حاجت فریاد رسی چاہتے تھے اور اپنے مال کا ایک حصہ ان کی نذر و نیاز کے لیے صرف کرتے تھے۔ قرآنِ کریم اور احادیث صحیحہ کی روشنی میں بتلایا گیا کہ استغاثہ، استعانت، دعاء و ندا، نذر و نیاز سب افعال عبادت ہیں۔ لہٰذا ان افعال کا تعلق صرف حق تعالیٰ ہی سے ہونا چاہیے مشرکین نے ان کا تعلق غیر اللہ سے روا رکھا تھا اسی لیے انہیں تہدید کی گئی کہ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ پس ان کا شرک بھی

Marfat.com

غیراللہ کی عبادت اور اس سے استعانت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ حق تعالیٰ کے وجود کے منکر نہ تھے اور نہ ان کی ذات ہی میں کسی غیر کو شریک کرتے تھے۔

غیراللہ کی عبادت ہی شرکِ محض اور کفرِ بحت ہے، یہ شرکِ اکبر انسان کے خون و مال کو حلال کردیتا ہے اور اس کو "مخلد فی النار" بنا دیتا ہے، جب کسی کے کانوں تک توحید کی دعوت پہنچ چکی اور اس پر حجت کا قیام ہوگیا اور اس کے باوجود وہ شرک پر جما رہا اور کفر کا اعلان کرتا رہا تو وہ کافر مشرک ہوگیا، اب اس کی نجات کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ وہ کفر و شرک سے توبہ کرے اور توحید پر ایمان لائے اور اگر نام کا مسلمان ہے تو تجدیدِ اسلام کرے۔

احادیثِ نبویہ میں کلمۂ توحید کے چند قیود و شرائط بیان کیے گئے ہیں، مثلاً کسی قسم کا شبہ الوہیتِ الٰہی میں نہ کرے، متکبر نہ بنے، جائز نہ ہو، یہ کلمہ اس کو گناہوں سے روکے وغیرہ۔ انسان جب ان پر غور کرتا ہے تو اس کو اپنی ہلاکت کا خوف پیدا ہوتا ہے۔ پھر ان لوگوں کا کیا ذکر جو غیراللہ کی عبادت بجا لاکر کھلے شرک و کفر میں مبتلا ہیں۔ ائمہ اربعہ نے تارکِ صلوٰۃ، مانعِ زکوٰۃ، یا تارکِ اذان یا نمازِ عید سے قتال کرنا واجب قرار دیا ہے کیونکہ یہ شعائرِ اسلام ہیں، پھر اہلِ شرک و کفر سے قتال کا کیا ذکر، بعض نے تو اس پر اجماع بھی نقل کیا ہے۔ جب نماز، روزہ، حج یا زکوٰۃ کے ترک کرنے سے کفر لازم آتا ہے تو ترکِ توحید و اخلاص سے کس طرح شرک لازم نہیں آئیگا۔ امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یشھدوا ان لا الٰہ الا اللہ وان محمد رسول اللہ ویقیموا الصلوٰۃ ویؤتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذٰلک عصموا منی دماء ھم واموالھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ!

مقالہ کے دوران میں جو آیتیں شرک و کفر کے رد میں پیش کی گئیں ان کو عرب ہی کے مشرکین و کفار اور عابدینِ اصنام و اوثان کے حق میں سمجھنا غلطی ہے۔ ان کا اطلاق ہر زمانہ کے مشرکین پر ہوتا ہے، ہر زمانہ کے مشرکوں کے درمیان ایک ہی امر جامع مشترک ہے اور وہ شرک باللہ ہے لہذا حکم ایک ہی ہوگا کیونکہ جامع موجود ہے اور فارق معدوم، چنانچہ اصولِ فقہ کا قاعدہ بھی یہی ہے کہ العبرۃ

---

[1] اسی کو پیش نظر رکھ کر شاید اقبال نے کہا ہے ۔ چو می گویم مسلمانم بلرزم ؛ کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را ۔ (ارمغان حجاز)

Marfat.com

بعموم الالفاظ لا بخصوص المواد" یعنی اعتبار عموم لفظ کا ہوتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا، سارے احکام شرعیہ کا مدار اسی اصول پر ہے اور حدیث میں صراحت کی گئی ہے کہ حکمی علی الواحد کحکمی علی الجماعۃ" اس کے انکار سے یہ بات لازم آئیگی کہ جو حکم کسی خاص سبب کی بنا پر کسی گزشتہ واقعہ کے سلسلہ میں نازل ہوا ہے وہ اسی کی حد تک محدود ہے اور متعدی نہیں، یہ قطعاً باطل ہے۔ اس سے احکام شرعیہ کا تعطل لازم آتا ہے۔ کیونکہ جتنی آیاتِ حدود و جنایات و مواریث ہیں وہ سب خاص خاص واقعات ہی کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہیں لیکن ان کا حکم عام ہے اور قیامت تک باقی ہے۔ چنانچہ ابنِ عباسؓ نے ان آیات کی بابت جو بنی اسرائیل کے حق میں اتری ہیں فرمایا تھا: ھذا نزل علی بنی اسرائیل وانہ علینا مثلھم وما اشبہ اللیلۃ بالبارحۃ۔ اسی چیز کی طرف توجہ مبذول کرتے ہوئے کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ نعم الاخوۃ بنی اسرائیل اذ کان کل حلوۃ لکم وکل مرۃ لھم! اور ائمہ ثلاثہ نے تو اس امر کی صراحت کردی ہے کہ شرائع ماقبل ہمارے لیے بھی شرع ہیں اور امام شافعیؒ بھی اسی اصول کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن اسی صورت میں جب کہ اس کی توضیح ہماری شرع میں بھی آچکی ہو۔ اب ہماری شریعت نے بھی ان مسائل کی توضیح کردی ہے۔ اور کتاب و سنت ان پر ناطق ہیں۔ ان کا تعلق امم سابقہ اور مشرکینِ عرب ہی کے ساتھ سمجھنا کس قدر فاحش غلطی ہے۔

پھر ذرا غور تو کرو کہ جس چیز سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکینِ عرب کو منع فرمایا، خلاف ورزی پر ان سے مقاتلہ فرمایا، جس پر قرآنِ مبین نازل ہوا وہ شرک ہی تو تھا اور کفر۔ ان کے متعلق ساری آیتیں محکم ہیں اور غیر منسوخ، اول و آخر ہر ایک کے لیے یکساں ہیں، علاوہ ازیں قرآنِ کریم میں ایسی آیتیں بھی ہیں جو خاص انبیاء بلکہ افضل انبیاء اور مومنین کے حق میں اتری ہیں ان میں شرک کو حبطِ اعمال قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ انعام میں اٹھارہ پیغمبروں کے نام لے کر ارشاد ہوتا ہے کہ وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ، کسی جگہ خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوتا ہے لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ ایک جگہ اہل ایمان کے متعلق خبر دی گئی ہے کہ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ!

Marfat.com

ہمارے اس زمانہ کے موسن مشرک بغوائے حدیث لتتبعن سنن من قبلکم اپنے پیشرو مشرکین عرب اور یہود و نصاریٰ کے نقشِ قدم پر "توحید الوہیت" ہی کا انکار کر رہے ہیں یعنی وہ اس امر کے قائل نہیں رہے کہ حق تعالیٰ کے سوا اور کوئی لائقِ دعاء و عبادت، خوف و رجا، استعانت و استغاثہ نہیں، جس کے لیے جانور ذبح کیا جائے یا نذر مانی جائے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہوگیا ہے کہ حق تعالیٰ کے سوا ان کے انبیاء و اولیاء بھی شدائد و مصائب و آفات و بلیات میں ان کی فریاد سن کر، ان کی حالت سے مطلع اور واقف ہو کر ان کی مدد کر سکتے ہیں "کشفِ ضرر" کر سکتے ہیں۔

اسی لیے ان کے اہلِ علم و فضل بھی اس کی علی الاعلان تعلیم کرنے لگے ہیں کہ حالتِ درد و مصیبت میں پکارنا چاہیے، حضرت معروف کرخیؒ کو، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو، حضرت سالار مسعود غازیؒ کو، حضرت شاہ بدیع الدینؒ مدار کو، حضرت شیخ معین الدین چشتیؒ کو، حضرت قطب الدین کاکیؒ کو، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کے جاہل اور عالم دونوں غیر اللہ سے اس طرح استعانت ہر مصیبت کے وقت کرتے ہیں، ان کے لیے مرغ، بکری، گائے ذبح کرتے ہیں، نذر و نیاز لاتے ہیں، منت مانگتے ہیں، چراغ روشن کرتے ہیں، ان کی قبروں کا طواف کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں۔ وہ ان بزرگوں کو اپنے پیش رووں کی طرح اللہ کی ذات میں شریک نہیں کرتے بلکہ ان کو اللہ کا مملوک و محکوم ہی مانتے ہیں، اللہ ہی کو حاکم و مالک و رب سمجھتے ہیں مستقل معبود اللہ ہی کو جانتے ہیں اور اپنے ان بزرگوں کو اللہ ہی کی ملک سمجھتے ہیں لیکن پھر اپنے پیشرووں کی طرح ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کے یہ بزرگ، یہ صلحاء، مقربِ الٰہی ہیں وہ ان کی نذر و نیاز، ان سے دعاء و التجاء استغاثہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی وجاہت و شفاعت و قرب سے اللہ کے غصے اور خفگی و ناراضی سے نجات پا کر قرب حاصل کر لیں۔

اس مختصر مقالہ میں یہ بتلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بعینہ یہی عقیدہ "شرک فی الالوہیت" ہے۔ یہی مذہب ابوجہل اور ابولہب کا ہے سواء بسواء! حضرت عیسیٰؑ و حضرت عزیرؑ و ملائکہ و انبیاءؑ کے پکارنے والے بعینہ اسی مسلک پر قدم زن تھے۔ کما قال اللہ تعالیٰ: وَالَّذِينَ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ أَوْلِيَاءَ

Marfat.com

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللهِ زُلْفٰى ۔ وقولہ تعالیٰ: وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللهِ!

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) نے دینِ حق کا پیغام لا الٰہ الا اللہ پیش فرماکر اَفرادِ عبادت للہ کی طرف دعوت دی، ساری عبادت کو اللہ ہی کے لیے مختص کردیا خواہ استعانت ہو یا استغاثہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا عکوف، طواف ہو یا کوئی عبادت قلبی ہو یا قالبی! مشرکین نے جن وسائط کو تقرب الی اللہ کا وسیلہ قرار دیا تھا ان کی نفی فرمائی، وضاحت فرمادی کہ توسط ان اولیاء وانبیاء وشہداء وملائکہ کا اس اعتقادِ فاسد وزعم کاسد کے ساتھ کہ وہ ان کی شفاعت کرینگے، بغیر اذن ومرضیِ حق کے کارآمد نہیں ہوگا، جو چیز کہ نفع دیگی وہ یہی عبادتِ خالص وتوحیدِ مفرد ہوگی جو کلمۂ اشهد ان لا الٰہ الا اللہ واشهد ان محمدا عبدہ ورسولہ سے ثابت ہے، جو شخص اس کلمہ کے معنی پر چلا، اس کے مقتضی پر عمل کیا، وہی مومنِ موحد اور محسنِ مخلص کہلایا اور جس کا قول وفعل حال وخیال اس کے معنی ومقتضی کے خلاف ہوا وہ مشرک کافر ہوا یا مبتدع ضال!

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ دِيْنِيْ فَلَاۤ اَعْبُدُ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ اَعْبُدُ اللّٰهَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ ۚ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۚ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝

صالحیت

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ" (پ ۲۰ ع ۱)

راہِ خدا کے مسافر، طریقِ طلب اور راہِ سفر کے لحاظ سے دو قسم کے ہوتے ہیں (۱) اصحابِ بحث و افکار جنہیں حکماء و عقلاء کہا جاتا ہے، اور (۲) اصحابِ کشف و ابصار جو عرفا و اولیاء کہلاتے ہیں۔ اہلِ بحث و نظر مقدمات کی ترکیب، دلائل و براہان کی تقریر، اور نظر و استدلال سے حقائق کا علم حاصل کرتے ہیں۔ وہ ممکن کے وجود سے واجب کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، مصنوعات سے صانع کا، مخلوقات سے خالق کا پتہ لگاتے ہیں۔ یہ حکماء و متکلمین کی جماعت ہے۔ ان کا طریقہ گو محمود ہے لیکن نظر و استدلال کا انجام حیرتِ مذموم کے سوا کیا ہو سکتا ہے! ان کی حیرت کو "حیرتِ نظّار" سے تعبیر کیا گیا ہے، جو تصادمِ شکوک و تعارضِ دلائل کا نتیجہ ہوتی ہے جو یقیناً مذموم ہے۔ اس کے برخلاف اصحابِ کشف و ابصار بھی ایک قسم کی حیرت میں مبتلا ہوتے ہیں، جس کو حیرتِ اولی الابصار" کہا جاتا ہے، لیکن یہ نتیجہ ہوتا ہے مشاہدۂ وحدانیت و الوہیت کا، آثار و عجائبِ ربوبیت کا، توالیِ تجلیات کا، اور یہ حیرتِ محمود ہے۔ "رَبِّ زِدْنِیْ فِیْکَ تَحَیُّرًا" کی دعا، اسی حیرتِ محمودہ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

جب اسلام کے نام لیوا حکماء و متکلمین، فلاسفۂ یونان کے اتباع میں انبیاء علیہم السلام کے عقائد سے اختلاف کرنے لگتے ہیں تو وہ بقول شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کتوں سے بھی بدتر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ کتے بھی پرانی ہڈیوں کو نہیں سونگھتے، اور یہ احمق دو ہزار سال کی پرانی ہڈیوں کو اب تک جھنجھوڑنے میں لگے ہیں! ان کی ضلالت و گمراہی کا سبب ان کی "عقلِ ناقص" کے سوا کچھ نہیں

Marfat.com

وَفَرِحُوا بِمَا عِنْدَهُمْ مِنَ الْعِلْمِ ؎

مصطفیٰ اندر جہاں انگہ کسے گوید ز عقل　　　آفتاب اندر فلک انگہ کسے جوید سہا

اہلِ کشف و بصیرت وہ ہیں جو تصفیۂ باطن، تخلیہ تخیل، کمالِ تبتل، اور دوامِ توجہ سے منتہائے مقصود کو پہنچتے ہیں "وھوالوصول الی معرفتہ اللہ ولقائہ" انہیں صراطِ مستقیم کے جادہ پیما کہا جاتا ہے، اور یہی طریقہ تمام انبیاء علیہم السلام کا ہے، اور ان میں سب سے زیادہ کامل ملتِ حنیفی و دینِ مصطفوی ہے (صلوات اللہ علیہ وعلیہم اجمعین) یہ گروہِ مقدس اُن ہستیوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کی خود حق تعالیٰ نے ثنا کی ہے (يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ) اور حضرت الوہیت سے ان کی تائید کی جاتی ہے (أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُمْ بِرُوحٍ مِنْهُ) یہ خدائے لم یزل ولا یزال کے پسندیدہ بندوں کا طبقہ ہے (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ) یہ اپنے خالق کے وجود کا ادراک مقدماتِ عقلیہ قائم کیے بغیر کر لیتے ہیں، اور حق کو نورِ حق ہی سے پہچانتے ہیں (أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِنْ رَبِّهِ) انہیں نظر و استدلال کی حاجت نہیں ہوتی! بینا کو رنگوں کے ادراک میں نظری دلیلوں سے کام لینے کی کب ضرورت ہوتی ہے (أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ) چنانچہ کسی نے حضرت جنید سے پوچھا کہ وجود صانع پر تمہاری کیا دلیل ہے، تو آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا "لقد اغنی الصباح عن للمصباح" مجھے دن کی روشنی نے چراغ کی روشنی کا محتاج نہیں رکھا ؎

حق را ز حق شناس نہ از حجت و قیاس　　　خورشید را چہ حاجتِ شمع است و مشعلہ (جامی)

یہ مقدس ہستیاں درجہ کمال پر فائض ہوتی ہیں، انہیں مکتب خانۂ وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا سے سبق ملتا ہے، یہ شکوک و اوہام سے آزاد ہوتی ہیں اور انبیاء علیہم السلام کے علوم کی وارث ان کی تعریف میں کسی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

آنہا کہ ربودۂ الست اند　　　از عہدِ الست باز مستند

در منزلِ درد بستہ پا بند　　　در دادنِ جاں کشادہ دستند

چالاک روند پس بیک گام　　　از جوئی حدوث باز جستند

Marfat.com

فانی زخود و بدوست باقی — ایں طرفہ کہ نیستند و ہستند

این طائفہ اند اہلِ توحید — باقی ہمہ خویشتن پرستند

یہ بزرگ ہستیاں طہارتِ فطرت پر ہوتی ہیں، دریائے توحید میں غرق ہوتی ہیں، خلق نے جو کچھ حکایۃً سُنا ہے وہ اپنی بصیرت کے نور سے دیکھتی ہیں، خلق کے لیے جو "غیب" ہے ان کے لیے "شہادت" ہے۔ چنانچہ عارف رومی نے ان کے اس کمال کی طرف یوں اشارہ کیا ہے: ؎

دفترِ صوفی سوادِ حرف نیست — جز دلِ اسپید ہمچو برف نیست

زادِ دانشمند آثارِ قلم — زادِ صوفی چیست اسرارِ قدم

آنچہ تو در آئینہ بینی عیاں — پیر اندر خشت بیند بیش ازاں

در دلِ انگور مے را دیدہ اند — در فنا محض شئے را دیدہ اند

لیکن ایسی ہستیاں کم ہوتی ہیں، اور ان کی شناخت بھی آسان نہیں ہوتی، وہ گم نام ہوتی ہیں، اور زاویۂ گمنامی میں اپنی زندگی بسر کرتی ہیں۔ ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ایک ایسی صاحبِ کمال ہستی سے اخذِ فیض کا ہمیں کچھ موقع مل گیا، یہ محض فضلِ یزدانی و موہبتِ ربانی ہے کہ ہم ان کے کچھ ارشاداتِ عالیہ کو یہاں پیش کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ ان ارشادات کا تعلق مرتبۂ صالحیت سے ہے۔

حق تعالیٰ نے صالحین کے دو وصف بیان فرمائے ہیں۔ ایمان و عملِ صالح۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ (۲۹-۶-۱)

ایمان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی دل سے تصدیق اور زبان سے اقرار کا نام ہے۔ ذات اللہ ہی کو الٰہ قرار دینا، یعنی معبود و مستعان قرار دینا، زبان سے اقرار اور دل سے اس کی تصدیق کرنا توحید ہے، توحید ایمانی ہے۔ اس اقرار و تصدیق سے قلب سے شرک کا خروج ہوتا ہے، اور توحید داخل ہوتی ہے، جس ذاتِ پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اس کی رسالت کے اقرار و تصدیق سے دل سے کفر نکلتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے۔

ایمان میں دو چیزیں ہیں، اور توحید میں بھی دو چیزیں ہیں۔ ایمان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

رسالت اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی الوہیت کی تصدیق ہے۔ توحید میں حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت اور ان کے ماتحت بندہ کی عبادت و استعانت کی تصدیق داخل ہے۔

اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار یا شک "نفاق" ہے جس کا نتیجہ ابدی جہنم ہے۔

"وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا" (پ ع ۹)

اس کی تصدیق کے بعد انکار ارتداد ہے جس کا نتیجہ خلودِ نار و حبطِ اعمال ہے۔

وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (پ ۲ ع ۲۷)

ارتداد، شرک کی طرح دین و مذہب کی نفی ہے، بغاوت ہے اور اس لیے ناقابلِ معافی!

کفر و شرک، نفاق و ارتداد بڑے جرائم ہیں، سخت گندگی و نجاست ہیں۔ ان سے قلب کی تطہیر ضروری ہے۔ یہ تطہیر ان سے توبہ اور لا الٰہ الا اللہ کے اقرار و تصدیق ہی سے ہو سکتی ہے یہی وہ علم ہے جس کو تمام انبیاء علیہم السلام نے حضرت آدم (علیہ السلام) سے لے کر نبی آخر الزماں (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تک پیش کیا ہے اور دعا کی ہے کہ:۔

"اللّٰھم توفنا مسلمین والحقنا بالصالحین غیر خزایا ولا مفتونین"

ایمان محض تصدیقِ قلب کا نام ہے، اور اعمالِ جوارح اس میں داخل نہیں ہیں۔ امورِ ذیل پر غور کرنے سے یہ امر روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔

(۱) ایمان لغت میں تصدیق یا سچ ماننے کو کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ برادران یوسف علیہ السلام کی زبان سے فرماتے ہیں:۔

وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ	گو ہم سچ ہی کیوں نہ کہتے ہوں آپ کو تو ہماری بات کا یقین آنے کا نہیں

(۲) خود حق تعالیٰ ایمان کو فعلِ قلب قرار دیتے ہیں:۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا	(جو شخص کفر پر مجبور کیا جائے) مگر اس کا دل ایمان کی طرف

مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ | سے مطمئن ہو (اس سے کچھ مواخذہ نہیں) لیکن جو شخص
وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا | ایمان لائے پیچھے کفر کرے، اور کفر کرے بھی تو جی کھول
فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ | کر، تو ایسے لوگوں پر خدا کا غضب ہوگا، اور ان پر
عَذَابٌ عَظِيْمٌ (پ ۱۴ ع ۲۰) | سخت عذاب ہوگا۔

یہاں قلب کو ظرفِ ایمان قرار دیا جارہا ہے اور ایسے شخص کو کفار کے زمرہ میں سے نکال لیا جارہا ہے جو جبر و اکراہ کے سبب اعمالِ ظاہری کی پابندی کو چھوڑ دیتا ہے، مگر دل سے مسلمان ہے، اور موردِ غضب خداوندی وہی شخص قرار دیا جارہا ہے جس کے دل نے خوشی سے کفر کو قبول کرلیا ہے۔

(۳) قرآن کریم میں اکثر جگہ اعمالِ نیک کی جزا اور ثواب کے لیے ایمان کو شرط ٹھہرایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ شرط مشروط سے خارج ہوتی ہے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ | جو شخص کوئی نیک کام کریگا خواہ وہ مرد ہو یا عورت
اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ | بشرطیکہ وہ مومن ہو، سو ایسے لوگ جنت میں داخل
الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا (پ ۵ ع ۱۶) | ہونگے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ | جو شخص کوئی نیک کام کریگا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت
هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً وَ | بشرطیکہ صاحب ایمان ہو، تو ہم اس شخص کو بالطف
لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا | زندگی دینگے، اور ان کے اچھے کاموں کے عوض میں
يَعْمَلُوْنَ (پ ۱۴ ع ۱۶) | ان کا اجر دینگے۔

وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا | جو شخص آخرت کی نیت رکھیگا اور اس کے لیے جیسی
وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ | سعی کرنا چاہیے ویسی سعی کریگا بشرطیکہ وہ شخص مومن
مَّشْكُوْرًا (پ ۱۵ ع ۲) | بھی ہو تو ایسے لوگوں کی یہ سعی مقبول ہوگی۔

(۴) حق تعالیٰ گنہگاروں کے لیے مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں:

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ	آپ کہہ دیجیے کہ اے میرے بندو جنہوں نے اپنے اوپر
لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ	زیادتیاں کی ہیں، تم خدا کی ذات سے ناامید مت ہو
الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ	بالیقین خدا تمام گناہوں کو معاف فرما دیگا، واقعی وہ
(پ ۲۴-۳۶)	بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت کرنیوالا ہو۔

بہت سی آیتوں میں مغفرت ذنوب کی نوید ہے۔ اس کے برخلاف کفر کے لیے عذابِ مخلد کی وعید ہے:-

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ	بیشک جو لوگ کافر ہوئے اور انہوں نے اللہ کے
اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ	راستہ سے روکا، پھر وہ کافر ہی رہ کر مر گئے، سو خدائے
اللّٰهُ لَهُمْ ۝ (پ ۲۶-۸)	تعالیٰ ان کو کبھی نہ بخشیگا۔

اگر اعمال داخلِ ایمان ہوتے اور ان کا نہ کرنا داخلِ کفر، تو ان کی نسبت بھی بصورتِ عدم تعمیل، کفر کی طرح عدمِ مغفرت اور دوامِ عذاب کی وعید ہوتی نہ کہ مغفرت و رحمت کی نوید!

(۵) حق تعالیٰ نے دو صاحبِ تصدیق قتال کرنے والے گروہوں کو مومن کہہ کر یاد فرمایا ہے:-

وَاِنْ طَاۗىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا	اگر مسلمانوں میں دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان
فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا	اصلاح کرادو، پھر اگر ان میں کا ایک گروہ دوسرے پر زیادتی
عَلَي الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى	کرے تو اس گروہ سے لڑو جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ
تَفِيْۗءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ فَاۗءَتْ فَاَصْلِحُوْا	خدا کے حکم کی طرف رجوع ہو جائے، پھر اگر رجوع ہو جائے
بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ	تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ اصلاح کردو،
الْمُقْسِطِيْنَ ۝ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ	اور انصاف کا خیال رکھو۔ بیشک اللہ انصاف والوں کو
فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ	پسند کرتا ہے۔ مسلمان تو سب بھائی ہیں سو اپنے دو بھائیوں
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ (پ ۲۶-۱۳)	کے درمیان اصلاح کرادیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ

اگر اعمال جزوِ ایمان ہوتے تو اس باہمی قتال سے دونوں کافر ہوتے ان کو مومن نہ کہا جاتا، نہ

Marfat.com

ان میں صلح کرا دینے کی یہ وجہ بیان کی جاتی کہ مسلمان باہم بھائی ہیں۔

ان آیاتِ بینات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہے کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں۔ حق تعالیٰ نے صالح اسی شخص کو کہا ہے جو ایمان بھی رکھتا ہو اور عمل صالح بھی کرتا ہے۔ اب عملِ صالح کے معنی کا تعین ضروری ہے۔

عملِ صالح کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ صواب: یعنی عمل کا موافق سنّت صحیحہ کے ہونا۔ اخلاص: یعنی شرکت غیر اللہ سے پاک وصاف ہونا۔ نیت صحیحہ

وہی عمل صالح ہوگا جو موافق سنّتِ صحیحہ ہو اور نیت صحیحہ کے ساتھ حق تعالیٰ کے امتثال امر میں انہی کی رضا و خوشنودی کے لیے کیا جائے۔ ان تین خصوصیات کو اجمالی طور پر خوب سمجھ لو۔

ا۔ نیت کے متعلق جو اصول حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے:

"انما الاعمال بالنیات وانما لکل امریٔ ما نوی" آگے مثال کے ذریعہ اس کی وضاحت فرمائی ہے: فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا اوامراۃ ینکحھا فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ (رواہ الشیخان) یعنی اعمال کا اعتبار نیت سے ہے، ہر شخص کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی، پھر جس نے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کی، اس کی ہجرت اللہ اور رسول کی طرف ہوئی اور جس نے دنیا کی طرف ہجرت کی جو اس کو ملیگی یا کسی عورت کی طرف جس سے وہ نکاح کریگا تو یہ ہجرت اسی کی طرف ہوئی"

یہ حدیث اصولِ دین میں سے ایک عظیم الشان اصل ہے، ارکان اسلام میں سے ایک مہتم بالشان رکن ہے۔ سارے اعمال کا نیت ہی پر دارومدار ہے۔ بے نیت کے کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، نہ اس کا کچھ اعتبار ہے یہ حدیث متفق علیہ ہے یعنی دوسری کتب حدیث کے علاوہ صحیحین (بخاری ومسلم) میں بھی ہے۔

ب۔ اخلاص کے متعلق حضور انورؐ کا یہ ارشاد بہت واضح ہے:۔

یاایھا الناس اخلصوا اعمالکم فان اللہ   یعنی اے لوگو تم اپنے اعمال کو خالص حق تعالیٰ

تبارك وتعالیٰ لا يقبل من الاعمال الا ما اخلص (رواه البزار عن الضحاک بن قیس)	کے لیے کرو کیونکہ حق تعالیٰ عمل خالص کے سوا کوئی عمل قبول نہیں کرتے۔

جب حضرت معاذ بن جبل کو یمن کی جانب روانہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ ؐ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے، تو ارشاد ہوا :-

اخلص دينك يكفيك العمل القليل (رواه الحاكم)	تو اپنے دین کو خالص کر، تجھے تھوڑا سا عمل کفایت کریگا۔

عمل جب حق تعالیٰ ہی کے امر کے امتثال میں اور ان ہی کی رضا کے لیے کیا جاتا ہے اور اس سے انہی کی ذات مقصود ہوتی ہے تو وہ "خالص" ہوتا ہے اور ایسا ہی عمل "صالح" کہلایا جاتا ہے۔

ج۔ صالح ہونے کے لیے عمل کا مطابق کتاب وسنت ہونا ضروری ہے۔ من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو ردٌ (اخرجہ الشیخان) اس پر نص ہے یعنی جو شخص دین کے کام میں وہ چیز نکالتا ہے جو اس میں نہیں وہ مردود ہے۔ اسی مفہوم کو اس طرح بھی ادا کیا گیا ہے "من صنع امراً علی غیر امرنا فهو ردٌ (رواہ ابو داؤد) ایک اور طرح بھی اس مطلب کو بیان کیا گیا ہے۔ من عمل عملا ليس عليه امرنا فهو ردٌ (رواہ مسلم)

ان نصوص سے ظاہر ہے کہ جس کام کے کرنے کا دین میں حکم اور اذن نہ ہو وہ کام دین میں بدعت ہے، گو یہ کام بظاہر کیسا ہی اچھا کیوں نہ نظر آئے! جب اسلام میں اعمالِ صالحہ و افعالِ حسنہ بے حد و بے شمار ہیں تو ان اعمالِ ثابتہ کو چھوڑ کر افعالِ مستحدثہ کو اپنا دین ٹھہرانا عقل کا ہیضہ نہیں تو کیا ہے!" بہتر بات تو خدا کی بات ہے، بہتر ہدایت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ہدایت ہے! سب سے بدتر کام وہ ہیں جو نئے نکالے گئے ہیں۔ ہر بدعت گمراہی ہے" (عن جابرؓ)

بدعت بھی عجیب بلا ہے۔ دیکھو گنہگار یا فاسق خواہ وہ کتنا ہی بدکردار کیوں نہ ہو گناہ کو گناہ سمجھتا ہے، جی میں اس کام کو بُرا جانتا ہے گو منہ سے نہ کہے، اُمید ہو سکتی ہے کہ وہ جس چیز کو بُرا جانتا ہے اس سے کسی روز توبہ کرلیگا! لیکن صاحبِ بدعت کو توبہ کم نصیب ہوتی ہے کیونکہ وہ تو اس کو مستحسن سمجھ کر کر رہا ہے! حضرت ابن عاصمؒ نے حضرت ابو بکرؓ سے مرفوعاً جو حدیث روایت کی ہے وہ اس روز آخ

Marfat.com

کے تجربہ کو عجیب و غریب طریقہ سے ظاہر کرتی ہے:۔

"ابلیس نے کہا کہ میں نے لوگوں کو گناہ کا مرتکب کرکے ہلاک کر دیا اور انہوں نے مجھے گناہ سے توبہ کرکے برباد کیا۔ جب میں نے یہ حال دیکھا تو پھر میں نے ان کو ہوئی و بدعت میں مبتلا کرکے ہلاک کیا۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم راہِ حق پر ہیں اس لیے استغفار نہیں کرتے، اس طرح ہلاک ہو جاتے ہیں"۔

اسی لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا تھا، کہ:۔

"کل بدعۃ ضلالۃ وکل ضلالۃ فی النار!!"

"ایمان" اور "عمل صالح" کی ماہیت کو سمجھ لینے کے بعد اب مومن لا معبود الا اللہ کے شغل میں مصروف ہو جاتا ہے، اور جملہ معبودانِ باطل کی قلب سے نفی کرتا ہے اور یہ معبودانِ باطل اس کے حق میں تین ہیں:۔ دنیا، خلق اور ہوائے نفسانی۔

لا معبود الا اللہ کے ایک معنی یہ ہیں کہ حق سبحانہ تعالیٰ کے سوا میں امورِ دنیا میں سے کسی کا مطیع و منقاد نہیں جب بھی امورِ دنیا سے، کوئی خطرہ میرے قلب میں آتا ہے تو میں حق ہی کی حول و قوت سے اس کی نفی کرتا ہوں اور لا الہ الا اللہ کی تلوار سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں! میرا ہر عمل، میری ہر حرکت حق تعالیٰ کے امر کے امتثال میں ہوتی ہے اور میرے تمام جذبات احکامِ الٰہیہ کے پابند ہوتے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے سوا میرا معبود کوئی دوسرا نہیں! میرا کوئی عمل اسی وقت صالح یا قابلِ قبول ہوگا جب میں حق تعالیٰ ہی کی رضا و خوشنودی کے لیے اُن ہی کے بتلائے ہوئے طریقے سے اس کو انجام دوں!۔

اسی طرح میں خلق کو اپنے کسی عمل میں شریک نہیں کرتا، ریا و سمعہ کا کوئی خطرہ جب میرے قلب میں خطور کرتا ہے، عمل کے وقت جب کسی مخلوق کا خیال میرے ذہن میں آتا ہے تو یہ جان کر کہ ایسی حالت میں حق تعالیٰ کی بجائے یہی میرا معبود بن جاتا ہے میں لا الہ الا اللہ کی تیغ سے اس کو کاٹ کر رکھ دیتا ہوں۔

اسی طرح جب عمل کے وقت نفسانی خواہشات میں سے کسی خواہش، جاہ و عزت، خود نمائی، عجب و کبر، یا کسی لذتِ نفسانی کا گزر میرے قلب میں ہوتا ہے تو صاف طور پر یہ جان کر کہ ہر چہ در بند

آتی بندہٗ آتی، اور حق تعالیٰ کی اس تہدید کا خیال کر کے کہ: "اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ" میں لا الٰہ الا اللہ کی تلوار سے ان تمام خطرات کی نفی کرتا ہوں تاکہ ماسوی اللہ کی عبادت کی ذلت سے پوری طرح نجات پاؤں! مجھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ بد دعا یاد آتی ہے جو انہوں نے اس شخص کے حق میں کی تھی جو مال و دولت کو، عمدہ لباس و شہرت کو اپنا معبود بنا لیتا ہے اور جس کا سارا عمل ان ہی کے حصول کے لیے ہوتا ہے۔

تعس عبد الدینار و تعس عبد الدرھم و تعس عبد الخمیصۃ و انتکس و اذا شیک فلا انتقش!

"تباہ ہوا اشرفی کا بندہ اور روپیہ کا بندہ اور کپڑوں کا بندہ (یعنی جو رات دن بس انہی کی طلب اور فکر میں رہے) منھ کے بل گرے پھر سر کے بل الٹ جائے، اور جب اس کے کانٹا چبھے تو کوئی اس کا کانٹا نہ نکالے (اتنی بھی مدد نہ کرے کیونکہ وہ بندۂ زر ہے)"

جب میرے قلب پر سے ان معبودانِ باطل کی حکومت کامل طور پر اٹھ جاتی ہے اور سریرِ دل پر صرف حق تعالیٰ کی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور میرے تمام جذبات اوامرِ الٰہیہ کے پابند ہو جاتے ہیں تو میں آزادی و حریت کا وہ ذوق محسوس کرنے لگتا ہوں جو ہفت کشور کے بادشاہ کو بھی میسر نہیں ہو سکتا!

عارف رومی نے اسی حلاوت کو محسوس کر کے فرمایا ہے: ؎

گر تو خواہی حرّی و دل زندگی	بندگی کن بندگی کن بندگی
زندگی مقصود بہرِ بندگی است	زندگی بے بندگی شرمندگی است
ہر کہ اندر عشق یابد زندگی	کفر باشد پیش او جز بندگی
ذوق باید تا دہد طاعات بر	مغز باید تا دہد دانہ شجر!

عبدیت ہی حریت کا اصلی سبب ہے، حریت کیا ہے؟ "ھو انقطاع الخاطر عن تعلق ماسوی اللہ تعالیٰ بالکلیہ!" سچی آزادی اس انسان کو نصیب ہوتی ہے جس نے اغراضِ دنیاوی خواہشاتِ نفسانی سے اپنے قلب کو آزاد کر کے حق تعالیٰ سے بندگی و افتقار کی نسبت جوڑ لی ہے! حریت نہایت عبودیت کا نام ہے "آزادگی بے بندگی" نہیں ؏ کہ بستگانِ کمندِ تو رستگارانند۔ (حافظ) ولنعم ما قیل۔

Marfat.com

خواجگی را خواجگی از بندگی ست　　بندگی کردن کمالِ خواجگی ست!

من ازاں روز کہ دربندِ توام آزادم　　بادشاہم کہ بدستِ تو اسیر افتادم!

لا الٰہ الا اللہ کے معنیٔ اوّل لا معبود الا اللہ کے ہیں۔ عبادت کے معنی غایتِ تذلل و افتقار کے ہیں۔ زندگی کو جی کی خواہش کے مطابق نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی مرضی کے مطابق بسر کرنے کے ہیں۔ زندگی کی ہر حرکت امتثالِ امرِ الٰہی میں ہو، ہر فعل کا مقصود حق تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کا حصول ہو یعنی مقصود و محبوب اللہ ہی ہو! لا مقصود الا اللہ، لا محبوب الا اللہ یہ ہیں دوسرے معنی لا الٰہ الا اللہ کے۔

لا الٰہ الا اللہ بمعنی لا معبود الا اللہ کے شغل سے سالک کے قلب سے دنیا، خلق اور ہوائے نفسانی یا جذبات کا تسلط اُٹھ جاتا ہے لیکن باطن میں حق تعالیٰ کے سوا اور مقصود موجود رہ سکتے ہیں جن کا لا مقصود الا اللہ کے شغل سے دور کرنا ضروری ہے، یہ مقاصد بھی تین ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں۔ ۱: بہشت و ما فیہا من الحور و القصور۔ ۲: مقامات کشفی مثلاً کشفِ قبور، کشفِ قلوب، یا کشفِ بلا وغیرہ۔ ۳: تجلیاتِ قرب۔

مقصودِ حقیقی حق تعالیٰ ہوں تو جنت بھی بالذات مطلوب نہیں قرار پاتی[1] اگر جنت کا سوال کیا جاتا ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ محلِ دیدارِ محبوب ہے ؎

عاشقاں جنت برائے دوست می دارند دوست!

"و رضوان من اللہ اکبر" سے صاف یہ معلوم ہوتا ہے کہ رضائے حق کو جنت سے اکبر قرار دیا گیا ہے۔ نہ ہی مقصود وہ مقامات کشفی ہیں جو اولیاء اللہ کو تبعاً حاصل ہوتے ہیں جیسے کشفِ قبور یا کشفِ قلوب یا کشفِ بلا۔

[1] اس سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ جنت کی طلب ایمان یا کمالِ ایمان کے منافی ہے۔ انبیاء علیہم السلام خصوصاً سید الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ کامل کون ہوگا۔ بایں ہمہ قرآن و حدیث میں ان حضرات کی جو دعائیں نقل کی گئی ہیں ان میں جنت کا سوال بار بار کیا گیا ہے اور دوزخ سے پناہ مانگی گئی ہے۔ البتہ بندۂ مومن کا اصلی اور اوّلی محبوب و مطلوب بس حق تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضا ہی ہونا چاہیے۔ "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" ۱۲ م

دریں منزل بود کشف و کرامات — ولے باید گزشتن زاں مقامات

نہی وہ تجلیاتِ قربی مقصود ہیں جو اولیاء اللہ کو حاصل ہوتی ہیں مثلاً ولایت و غوثیت و قطبیت وغیرہ، مقصود صرف ذات حق ہے، ان کا حضور، ان کا ذکر، ان کی فکر، ان کی یاد ؎

یارب ز تو آنچہ من گدا می طلبم — افزوں ز ہزار پادشاہی طلبم

ہر کس ز درِ تو حاجتے می خواہد — من آمدہ ام ز تو ترا می طلبم

اس شغل کے تسلسل سے حق تعالیٰ کی محبت دل پر ایسی غالب ہو جاتی ہے کہ ایک لحظہ کے لیے بھی ان سے غفلت نہیں ہوتی، اور اس کا یہ حال ہو جاتا ہے: ؎

از بس کہ خیالت بہ نظر می دارم

در ہر چہ نظر کنم توئی پندارم

یہ مقامِ تلوین ہے، یہاں عاشقوں کے قلب و زبان سے فریاد نکلتی ہے، حال طاری ہوتا ہے لیکن وہ اس حال سے ترقی کرتے ہیں اور محض رضائے حق ان کا مطلوب ہو جاتا ہے، جس حال میں رکھیں اس سے راضی رہتے ہیں، ہجر و وصال دونوں سے راضی ہو جاتے ہیں ؎

معشوقہ کہ شد بجا ہما عاشقِ من — گفتا کہ نہ بہ عاشقی لائق من!

وصل است ز من کام تو آرے ہستی — تو عاشق کامِ خویش نے عاشقِ من

اب ہر فعل و حرکت میں حق تعالیٰ کی رضا طلب کرتے ہیں، حق تعالیٰ کے جملہ افعال و احکام میں سے کسی فعل یا حکم پر جو خود ان کی جان پر یا جہان پر جاری ہو جاتا ہے کوئی اعتراض نہیں کرتے، اور

"ہر چہ از دوست می رسد نیکو است"

کہہ کر سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں! توافق بالقضاء، اعراض عن الاعتراض ان کا شعار ہو جاتا ہے، مرض ہو یا خلافِ نفس کوئی چیز ہو اپنے محبوب کے حکم اور اس کی مشیت کا اس کو نتیجہ سمجھ کر اس سے محظوظ و خوش وقت ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے ایسے وقت بس یہی نکلتا ہے، کہ ؎

عاشقم بر رنج خویش و درد خویش! — بہرِ خوشنودیٔ شاہِ فرد خویش!

Marfat.com

اور عارفِ رومی کے الفاظ میں اپنے یقین کا اس طرح اظہار کرتے ہیں : ؎

آں کسے را کہ چنیں شاہے کشد — سوئے بخت و بہتریں جاہے کشد

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد — انچہ در ہمت نیاید آں دہد

اور ہر حال میں رضا ان کا مقام ہوتا ہے : ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو

جاں شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

اب "لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ" کا یہ نفوسِ قدسیہ صحیح مصداق بن جاتے ہیں (رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ) یہ نتیجہ ہے جذبات اور عقلی پرواز کو اوامرِ الٰہیہ کے تابع کرنے اور ان کو محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حضور میں قربان کر دینے کا ؎

ایں راہِ طریقت نہ بپائے عقل است — خاکِ قدمِ عشق ورائے عقل است

سرّے کہ فرشتہ چوں از آں بیخبر است — اے غافل بے عقل چہ جائے عقل است (دلا اعلم)

نیکی علم ہے

علمے کہ دروعمل نباشد عار است ۔۔۔ ہر سجدہ کہ بے ذکر بود زنار است

ہر کس کہ بہ علم بے عمل می نازد ۔۔۔ عالم نبود اعمیٰ مشعل دار است

(سید علی ہمدانی)

یونان کے شہرۂ آفاق مفکر سقراط کی تعلیمات کا خلاصہ پوچھا جائے تو بس یہی مشہور قول ہے، کہ "نیکی علم ہے اور بدی جہل" اس سے سقراط کا بظاہر یہی مطلب تھا کہ عملِ صالح (نیکی) علمِ صحیح کا نتیجہ ہے، اور علمِ صحیح یقین کے درجہ میں عملِ نیک سے جدا و منفک نہیں، ان میں ایک سرمدی لزومی ربط پایا جاتا ہے، یہ لازم و ملزوم ہیں۔ سچ پوچھو تو اربابِ علم کی تعریف ہی اس طرح کی جاسکتی ہے اَلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ بِمَا یَعْلَمُوْنَ۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے علم پر عمل کرتے ہیں۔[1] ہر کتاب خواں و کتاب داں عالم نہیں قرار دیا جاسکتا، وہ عالم نہیں، متلذذ بالمسائل ہے۔ مسائلِ علمیہ کا حافظ اور ان سے لذت اندوز ہونے والا ہے۔ عوام کا یہ ذہن مختل ہے کہ ہر کرم کتابی کو وہ عالم سمجھتے ہیں، "اعمیٰ مشعل دار" کو بینا جانتے ہیں، اور اپنے اس وہم کی تائید میں تخیل مختل سے کام لیتے ہیں۔ اس مختصر مقالہ کا مقصود اس بنیادی غلطی کا ارتفاع اور اس کی تائید میں جو دلائل پیش کیے جاتے ہیں، ان کا ابطال ہے۔ "یک تنقیۂ دماغ می باید کرد۔"

ذرا سقراط کے اس قول کو کہ 'نیکی علم ہے' اور وضاحت کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کرو، کیا علمِ صحیح عملِ صالح کے لیے ضروری نہیں؟ کیا جہاز رانی کے لیے جہاز کی ساخت اور اس کے کام سے واقف ہونا ضروری نہیں؟ اسی طرح حکمرانی کے لیے مملکت کی ماہیت و مقصد و غایت کا جاننا لازمی نہیں! بالکل اسی طرح جب تک ہم یہ نہ جانیں کہ نیکی کیا ہے، جب تک کہ یہ نہ معلوم ہو کہ خصائلِ حسنہ کیا ہیں، تقویٰ کیا ہے، عفت و شجاعت کیا ہے، حکمت و

[1] رواہ الدارمی۔

عدالت کیا ہیں، اور ان کی ضد خصائلِ سیئہ کیا ہیں، کیا ہم نیک بن سکتے ہیں، تقویٰ اپنے اندر پیدا کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں، لیکن جب یہ معلوم ہو جائے کہ نیکی کیا ہے، ہم نیک بن سکتے ہیں!

یہاں تک تو عوام کو بھی سقراط کی رائے سے اتفاق ہوگا کہ جب تک آدمی کو نیکی کا علم نہ ہو وہ نیک نہیں بن سکتا، اس معنی میں قطعاً نیکی علم ہے، لیکن سقراط فطرتِ انسانی کا رازدار تھا، اس کی رائے میں فطرتِ انسانی کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ شر کو خیر پر ترجیح دے، وہ قطعاً خیر ہی کا ساتھ دیگی۔ کیونکہ خیر ہی میں اس کا ذاتی فائدہ ہے، نفع ہے، بھلا ہے، خیر کے ہم سب عاشق ہیں، خیر ہی ہمارا محبوب ہے، ہم سب اسی کے پروانے ہیں، یہ ممکن ہے کہ جہل کی وجہ سے ہمیں شر خیر نظر آئے، شر کو ہم خیر سمجھنے لگیں اور اس علمِ باطل کی وجہ سے شر کا ساتھ دیں اور اس کو اختیار کریں، لیکن یہ ہماری فطرت کا قصور نہیں، یہ ہمارے ارادہ کا نقص نہیں، یہ ہمارے علم کا قصور ہے، جہل کی تاریکی میں ہمیں خیر کے صحیح خد و خال نظر نہیں آتے اور ہم سراب کو آب سمجھنے لگتے ہیں اور اس پر گرتے ہیں، اسی لیے "بدی جہل ہے" اور صرف جہل ہی بدی ہے، اور جہل نام ہے علمِ صحیح کے فقدان کا! جہل میں بھی جو علم نظر آتا ہے وہ علمِ صحیح نہیں، دھوکہ ہے اور اس کا عالم 'عارف' نہیں 'جاہل' ہے!

اگر فطرتِ انسانی کے متعلق سقراط کی یہ بات صحیح ہے تو ہمیں اس کا یہ قول ماننا ہی پڑتا ہے کہ "کوئی شخص ارادۃً بد نہیں" "کوئی شخص ارادۃً شر کو اختیار نہیں کرتا، اور جب وہ دو برائیوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے پر مجبور ہوتا ہے، تو بڑی برائی پر ہاتھ نہیں ڈالتا جب وہ چھوٹی برائی کو چن سکتا ہے، اور ہمیں یہ بھی ماننا پڑتا ہے جہل ہی کی وجہ سے ہم شر کو اختیار کرتے ہیں، گناہ میں پھنستے ہیں، لہٰذا جہل ہی گناہ ہے، بدی ہے۔ جہل سے مراد یہاں عدمِ علم نہیں بلکہ سفاہت یا حماقت ہے اس لیے جاہل ایک معنی میں عالم کہلایا جا سکتا ہے، لیکن ہر معنی میں وہ احمق ضرور ہے۔ عوام جنہیں اپنی رائے میں عالم قرار دیتے ہیں وہ حقیقی معنی میں سفیہ یا احمق قطعاً ہوتے ہیں، وہ خیر کی ماہیت سے جاہل ہوتے ہیں، اپنے نفع و ضرر سے بیخبر ہوتے ہیں، وہ اشیاء کے بطون سے واقف نہیں ہوتے، وہ

Marfat.com

مظاہر کے حسی علم میں گرفتار ہوتے ہیں، وہ اصل میں مستِ خواب ہوتے ہیں، لیکن خواب میں اپنے کو بیدار سمجھتے ہیں۔ ؎ خفتہ دائم خویش را بیدار می بیند بخواب۔ (صائب)

جذبات سے زیادہ جہل کی مورث کوئی اور شے نہیں ارسطو نے سقراط کے اس قول پر جو تنقید کی ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے۔ ارسطو کی رائے میں انسان کے اکثر اعمال پر جذبات کی حکمرانی ہوتی ہے، ان کی محرک شہوتیں ہوتی ہیں عقل یا علم صحیح نہیں، عمل جذبات کے تابع ہوتا ہے، اور جذبات ارسطو کے الفاظ میں "روح کا غیر عقلی حصہ ہوتے ہیں" سقراط کا عمل اس کی عقل کا تابع تھا، اس نے خیال کیا کہ ہر شخص کا عمل اسی طرح عقل کا تابع ہوتا ہے، اسی لیے اس نے نیکی کو علم قرار دیا، لیکن روحِ انسانی کے غیر عقلی حصے، جذبات اپنی قوت و شدت کے لحاظ سے مردافگن ہوتے ہیں، اور انہی کا تسلط انسان کے دل و دماغ پر ہوتا ہے، یہ عقل و حکمت سے بے بہرہ ہوتے ہیں، ان کا پیدا کردہ عمل بھی علم اور نیکی سے عاری ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انسان راہِ مستقیم کو جاننے کے باوجود بھی جذبات کے زیرِ اثر گمراہی اختیار کرتا ہے، ہاتھ میں شمع رکھنے کے باوجود چاہ میں گر جاتا ہے وہ اعمیٰ مشعل دار ہے "چارپائے بر و کتابے چند" کا مصداق ہے، زبانِ سنت میں "علیم باللسان" اور "جاہل بالقلب" ہوتا ہے۔ اس کے وجود ہی سے حافظ کی یہ مشکل پیدا ہوئی تھی۔

مشکلے دارم ز دانشمندِ مجلس باز پرس　　　توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند

ارسطو کی اس تنقید سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ نیکی محض علم ہی نہیں، ہر عالم مردِ صالح نہیں، علم کے باوجود انسان کا نیک کردار بن جانا ضروری نہیں، جذبات اس راہ کے مزاحم ہیں۔

میانِ بلبل و پروانہ فرق بسیار است　　　کجا بہ رتبۂ کردار می رسد گفتار!

سقراط کا یہ کہنا صحیح ہے کہ علم یا بصیرت نیکی کے لیے قطعی ضروری ہے، اس کے بغیر نیکی کی راہ نہیں ملتی۔ لیکن ارسطو کہتا ہے کہ محض علم ہی کافی نہیں ارادہ بھی ضروری ہے، علم کا استعمال ہونا چاہیے، اس کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے، مجاہدہ سے عمل آسان ہوتا ہے، عمل کی تکرار سے عادت

Marfat.com

قائم ہوتی ہے عمدہ عادتوں کے قیام ہی سے انسان نیک بنتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ؎

چند روز جہد کن باقی بخند!

ارسطو کی تنقید لاجواب نظر آتی ہے، لیکن سقراط کی بات پر غور کرو، شاید بالآخر تم اسی کی بات سے اتفاق کروگے، تم کہتے ہو کہ عالِمِ بے عمل کا وجود اس بات کی دلیل ہے کہ محض علم نیکی نہیں جس کا دعویٰ سقراط کرتا ہے، انسان کو علم و یقین ایک بات کا ہوتا ہے اور وہ عمل اس کے خلاف کرتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا یہ علم و یقین کس پایہ کا ہے، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جو لوگ دوسروں کو ترکِ دنیا کا سبق دیتے ہیں، اور خود سیم و غلہ جمع کرتے ہیں^ل، ترکِ دنیا کے قائل ہیں، اس پر یقین رکھتے ہیں، ان کا قلب اس کی صداقت پر گواہی دیتا ہے؟ وہ خود بھی شاید یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں اس پر یقین ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہیں یقین صرف اسی چیز کا ہے جس پر وہ عمل کررہے ہیں، اگر انہیں روحانی اقدار کی حقیقی قیمت کا یقین ہوتا تو وہ قطعی اسی کی تلاش کرتے اور حطامِ دنیوی کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے، انسان کی فطرت ہی میں یہ داخل ہے کہ وہ اپنا بھلا چاہتا ہے، فائدہ کی تلاش کرتا ہے، اور نقصان یا ضرر سے بھاگتا ہے، میں جانتا ہوں کہ آگ پر انگلی رکھنے سے شدت کی سوزش ہوتی ہے، اس لیے میں آگ کے قریب نہیں جاتا، اگر اسی قسم کا یقین مجھے ہو جائے کہ آخرت قابلِ ترجیح ہے، کیونکہ یہی باقی رہنے والی ہے تو پھر میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ میں آخرت کی پرواہ نہ کروں اور "قحبہ مستورۂ دنیا" کی ناز برداری کرتا رہوں، جیسا کہ ہم نے اوپر وضاحت کی ہے، جہل یعنی صحیح علم و یقین کے فقدان ہی سے شر کا ارتکاب عمل میں آتا ہے، اور بہر حال یہ نفسیاتی قانون صحیح ہے کہ "عمل تابع حال ہوتا ہے اور حال تابع علم و یقین" لہٰذا عمل ہی سے حال و یقین ظاہر ہوتے ہیں، کسی شخص کے یقین کا پتہ چلانا ہو تو اس کا عمل دیکھا جانا چاہیے نہ کہ محض قول، خود اس شخص کو اپنے یقین کی کیفیت اس کے اپنے عمل ہی سے معلوم ہوتی ہے، نفس کے دھوکوں کا حال عمل کے محاسبہ سے ظاہر ہو جاتا ہے، اور حال قابلِ اعتبار

ل ترکِ دنیا بمردم آموزند ÷ خویشتن سیم و غلہ اندوزند۔

Marfat.com

ہے نہ کہ قال، کردار پر تصفیہ ہوتا ہے نہ کہ محض گفتار پر ؎

قدم باید اندر طریقت نہ دم　　　　کہ اصلے ندارد دمِ بے قدم

غرض یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہر شخص اپنے علم ویقین کے مطابق ہی عمل کر رہا ہے تو سقراط کی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ نیکی علم صحیح کا نام ہے، علم صحیح قطعاً عملِ صالح پیدا کرتا ہے، انسان کو اپنے فائدہ کا علم اور اس پر یقین ہونے کے بعد اس کو اختیار کیے بغیر وہ رہ نہیں سکتا، کیونکہ اس کی فطرت ہی ایسی بنی ہے کہ وہ خیر کی طرف راغب ہوتا ہے، بشرطیکہ اس کو خیر کا علم ہو جائے اور خیر ہی کے علم کو صحیح معنی میں "علم" کہا جا سکتا ہے اور لقائے حق ہی سے دیدۂ بینا حاصل ہوتا ہے ؎

دیدہ بینا از لقائے حق شود　　　　حق کجا ہمراہِ ہر احمق شود

(رومی)

اب ہم تھوڑی دیر کے لیے "حکمت یونانیاں" سے حکمت ایمانیاں کی طرف رجوع کرتے ہیں، نورِ عقل وحس کو نورِ حق سے زینت بخشتے ہیں۔

نورِ حس را نورِ حق تزئیں بود　　　　معنیٔ نورٌ علیٰ نور ایں بود　(رومی)

نیکی علم ہے، کیونکہ علم کی اصل "خشیۃ اللہ"[1] ہے (خوفِ خدا ہے) اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓءُ (پ ۲۲ ع ۱۹) خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں، اس لیے ابن مسعودؓ وغیرہ نے کہا ہے کہ کفی بخشیۃ اللہ علماً وکفی بالاغترار باللہ جھلاً۔ جب علم خوفِ خدا کا نام ہے، کثرتِ روایت کا نہیں، معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں (لیس العلم بکثرۃ الروایۃ ولکن العلم خشیۃ) تو ایسا علم قطعاً عمل کو درست کر دیتا ہے، یعنی اس سے نیکی پیدا ہوتی ہے، انسان صالح بن جاتا ہے اور اسی معنی میں کہا جا سکتا ہے کہ نیکی علم ہے، اور عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ من خشی اللہ فھو عالم ومن عصاہ فھو جاھل۔ اس بنا پر ہم ہر کتاب خواں وکتاب داں کو عالم نہیں کہہ سکتے، امام شعبیؒ اپنے

[1] امام احمدؒ نے معروفؒ سے نقل کیا ہے۔

وقت کے علما سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں "متلذذ بالمسائل" (Intellectual Epicure) ہو۔ مسائل سے بحث میں تمہیں لذت ملتی ہے، اور یہی لذت تمہاری غایت ہے۔ عالم سے مراد عامل باللہ فی اللہ عارف باللہ ہے، یعنی عالم وہ ہے جو عرفانِ حق وخوفِ خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لیے عمل کرتا ہے اور عمل کا مقصود اللہ ہی کی رضا و محبت کو قرار دیتا ہے۔

اسی علم کو زبانِ سنت میں "علم نافع" کہا گیا ہے اور اس کی وضاحت کی گئی ہے ایہ علم ایک نور ہے جو عالم کے حجابات کو رفع کرتا ہے اور اس کو عرفانِ حق عطا کرتا ہے، اسی علم کی وجہ سے وہ اپنے رب کی طرف راہ یاب ہوتا ہے، اس کو اپنے سے قریب، بلکہ اقرب پاتا ہے، اس کو حاضر و ناظر جانتا ہے، اس یافت قرب کی وجہ سے عالم کا انس اللہ سے بڑھتا جاتا ہے، اب اس کو ذکر و دعا میں حلاوت، مناجات میں لذت، ادائے فرضِ عبودیت میں سرور و مسرت حاصل ہوتی ہے، اب اس کا مقصود حق تعالیٰ ہو جاتے ہیں، جان و مال، فرزند و زن سے وہ زیادہ عزیز و محبوب بن جاتے ہیں اور وہ انہیں مخاطب کر کے کہتا ہے:

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم ۔۔۔ خاکے شوم و زیر پائے تو زیم
مقصودِ منِ خستہ زکونین توی ۔۔۔ از بہرِ تو میرم و برائے تو زیم (سحابی استرآبادی)

جب یہ تعلق عبد میں اور اس کے رب میں پیدا ہو جاتا ہے اور اس طرح جان پہچان ہو جاتی ہے تو حق تعالیٰ اس کے لیے کافی ہو جاتے ہیں کفی باللہ وکیلا! جو کچھ وہ مانگتا ہے اس کو ملتا ہے، جو کچھ وہ چاہتا ہے اس کو دیا جاتا ہے[1]۔ اور وہ چاہتا وہی ہے جس میں ان کی رضا ہوتی ہے۔ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر شے کا عوض حق تعالیٰ ہیں، لیکن ان کا عوض کوئی شے نہیں۔

---

[1] لئن سألنی لاعطینہ ولئن استعاذ نی لاعیذنہ۔

لکل شیءٍ اذا فارقتہ عوض ولیس للّٰہ ان فارقت من عوض[1]

عارف رومی نے اسی مطلب کو اپنے سُریلے نغموں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے بادشاہ سے انس پیدا ہو جاتا ہے تو پھر سارے درد و غم کا اس کو علاج مل جاتا ہے اور اس کی طرف رُخ کر کے وہ سارے جہان سے فارغ ہو جاتا ہے۔

آنکہ شد انسش بہ شاہ فرد خویش یافت درمانہائے جملہ درد خویش

چوں ازاں اقبال شیریں شد دہاں سرو شد برآدمی ملکِ جہاں

جس کو یہ علمِ نافع عطا ہوتا ہے اس کو مزید تین چیزیں دی جاتی ہیں۔ قلبِ خاشع نفسِ قانع اور دعاء مسموع۔ جب اصل علم خشیۃ اللہ ہے تو علم کے ساتھ ہی خدا کا خوف بھی عالم کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے، اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے، وہ طالبِ دنیا نہیں رہتا، وہ طالب علو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ ہمعصروں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں رکھتا، اس کو مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی آرزو نہیں رہتی (امام سفیان ثوری) امام حسنؒ کے الفاظ میں وہ ناھد فی الدنیا، راغب فی الاٰخرۃ، بصیر بدینہ، مواظب علی عبادۃ ربہ ہوتا ہے یعنی دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف راغب ہوتا ہے اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے اور اپنے رب کا عبادت گزار بندہ ہوتا ہے۔ دوسری روایت میں اس کی تعریف یوں کی گئی ہے الذی لا یحسد من فوقہ ولا یسخر من دونہ ولا یوخذ علی علم علمہ اللّٰہ یعنی وہ اپنے سے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا تمسخر نہیں کرتا اور اس علم کی وجہ سے جو اس کو اللہ نے سکھلایا ہے اس کا مواخذہ نہیں ہوتا۔ جوں جوں اس کا علم زیادہ ہوتا جاتا ہے، اللہ سے اس کا خوف، تواضع اور انکسار زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اھل العلم النافع کلما ازدادو من ھذا العلم ازدادوا للّٰہ تواضعاً و خشیۃ و انکساراً و ذلاً۔ رواہ ابن عمرو) عالم میں خاک کی طرح عمل،

---

[1] ہر چیز کا جو تجھ سے جاتی رہے بدلہ ہے، لیکن اگر اللہ تجھ سے جاتا ہے تو اس کا کوئی بدلہ نہیں۔

ذل و افتقار پیدا ہو جاتا ہے، کبر و فخر و رعونت کا نشان بھی باقی نہیں رہتا ؎

در خاک بیلقاں برسیدم بہ عابدے
گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن

گفتا برو چو خاک تحمل کن اے فقیہ
یا ہر چہ خواندۂ ہمہ در زیر خاک کن

علمِ نافع کا عامل اس فقر الی اللہ کی وجہ سے سارے عالم سے غنی ہوتا ہے "وہ غنی بالشئی" نہیں، وہ "غنی عن الشئی" ہوتا ہے، اس کا برگ و ساز قرآن عظیم ہے، اس کا قلب سوز و ساز، ذوق و شوق، تسلیم و رضا سے مملو ہوتا ہے وہ سراپا صدق و اخلاص و نیاز ہوتا ہے، اس کے فقر کا کچھ حال اقبال کی زبانی سنو:-

چیست فقر اے بندگانِ آب و گل
یک نگاہِ راہ بین، یک زندہ دل

فقر کارِ خویش را سنجیدن است
بر دو حرفِ لا الہ پیچیدن است

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر!
بستۂ فتراکِ او سلطان و میر

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضا است
ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰ است

فقر بر کرّوبیاں شبخوں زند
بر نوامیسِ جہاں شبخوں زند

برگ و سازِ او ست قرآن عظیم
مرد درویشے نہ گنجد در گلیم

✣

غرض وہ علم نیکی ہے جس کی اصل خشیۃ اللہ ہے جو اپنے حامل میں قلبِ خاشع و نفسِ قانع پیدا کرتا ہے، اور اس کی وجہ سے دعاءِ مسموع حاصل ہوتی ہے، اور جس شخص سے یہ علمِ نافع فوت ہو جاتا ہے وہ ان آفات میں مبتلا ہو جاتا ہے جن سے پیغمبر اسلام (روحی فداہ) نے پناہ مانگی تھی یعنی یہ علم اس پر وبال و حجت ہو جاتا ہے، اپنے علم سے وہ کوئی نفع نہیں پاتا، اس کا دل اپنے رب کے لیے نہ خشوع اختیار کرتا ہے، اور نہ اس کا نفس دنیا سے سیر ہوتا ہے، اور نہ اس کی دعا سُنی جاتی ہے، یہ علم نہیں جہل ہے اور تمام بدیوں کا مبدأ، ہمیں اس عارف کی تلاش ہے جو اپنی شمع سے محفل کو روشن کر دے اور ہمارے قلب سے کانٹوں کو نکال کر

Marfat.com

اس کو گلشن بنا دے ؎

عارف دل و جانِ تو معین سازد
خاکے کہ کند بجاش گلشن سازد
کامل ہمہ را زنقص بروں آرد
یک شمع ہزار شمع روشن سازد

(قادری ہندوستانی)

Marfat.com

تعلیم کا مقصد

گر جرعۂ ز جامِ معرفت نوش شود — وز کشمکش ہوا فراموش شود
قلبِ عارف زیرِ فلک کے گنبد — کے دریا را حباب سرپوش شود (سحابی استرآبادی)

نزول کے اعتبار سے قرآنِ مبین کی سب سے پہلی آیت اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ سے یہ بات صاف طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ پیدا کرنے والے نے ہمیں پڑھنے اور سیکھنے ہی کے لیے بنایا ہے۔ ہمیں کان، آنکھ اور دل (یا قرآن کے الفاظ میں سمع، و بصر و فواد) مشاہدہ، تجربہ و استنباطِ نتائج ہی کے لیے عطا کیے گئے ہیں! عام طور پر ہمارے علم کا معروض ہماری ذات یا انفس ہے، پھر آفاق ہے اور پھر انفس و آفاق کا پیدا کرنے والا! انفس و آفاق کی نشانیوں کا جاننا حق تعالیٰ کی معرفت کے لیے ضروری ہے اور قرآن نے علم کی حقیقی غایت حق تعالیٰ ہی کے عرفان و وجدان کو قرار دیا ہے! حق تعالیٰ کے عرفان ان کی یافت و شہود سے بڑھ کر اور کیا شئے ہو سکتی ہے جس سے انسان ایک لحظہ بھی مطمئن و شادکام ہو سکتا ہو۔

کیست زو بہتر بگو اے ہیچ کس — تا بداں دل شاد باشی یک نفس
من نہ شادی خواہم من نے خسروی — انچہ می خواہم من از تو ہم توی (رومی)

علم کا مقصدِ اولین حق تعالیٰ کا عرفان ہے، یعنی یہ جاننا ہے کہ حق تعالیٰ کن اسمائے حسنیٰ، صفات علیہ و افعال باہرہ سے موصوف و متصف ہیں، ان کا اظہار کس طرح کائنات کی لاانتہائی اشیا، اور انفس کے لاتعداد احوال و آثار میں ہو رہا ہے۔ قرآن کریم کے ارشادات کی روشنی میں عقل کو تابع وحی کر کے آفاق پر نظر ڈالی جائے تو ہر ورق معرفتِ کردگار کا دفتر بن جاتا ہے: اور ہر ذرہ اس کی وحدت کا گواہ، اور تمام عالم اسی کے جمال کا آئینہ نظر آنے لگتا ہے!

Marfat.com

ہمہ عالم جمالِ طلعت اوست　　گر کسے را کہ ایں نظر باشد! (سعدی)

ایمان کی اس نظر میں جب کائنات جلوہ گاہِ حق دکھائی دینے لگتی ہے تو نتیجے کے طور پر حق تعالیٰ کی عظمت وجلالت، ان کی خشیت ومحبت سے انسان کا قلب معمور ہو جاتا ہے اور حلاوت ولذت سے آشنا ہو جاتا ہے جو ذاتِ حق کا خاصہ ہے!

گلے بلبل جاں مست بیادِ تو مرا　　وے پایۂ غم پست بیادِ تو مرا

لذاتِ جہاں راہمہ درپا فگند　　ذوقیکہ دہد دست بیادِ تو مرا (جامی)

اسماء وصفات وافعالِ حق کے عرفان کے بعد علم کا مقصد قرآن کی رو سے یہ جاننا ہے کہ کون سے اعمال، احوال، اقوال یا اعتقادات ہیں جو حق تعالیٰ کو محبوب وپسندیدہ ہیں اور وہ چیزیں کونسی ہیں جو ان کو پسند نہیں اور جن سے انہوں نے انسان کو روکا ہے! قرآنِ مجید نے حق تعالیٰ کی مرضیات کی تفصیل ایمان، توحید، صدق، استقامت، سنت، حسنہ، یاد، محویت فی الحق، یافت وشہودِ حق کے سلسلہ میں شرح وبسط کے ساتھ کی ہے اور شرک وکفر، نفاق وارتداد، بدعت وفسق، غفلت ومحویت فی المخلوق اور یافت وشہودِ خلق کو کھول کر بیان کر دیا ہے اور مقربین، اصحاب یمین، اور اصحاب شمال کے مقام وصفات کو واضح طور پر معین کر دیا ہے۔ خیر وشر، علمِ ہدایت وعلمِ اضلال قطعاً حق تعالیٰ ہی عطا کرتے ہیں، خیر وشر میں امتیاز کرنا وہی سکھلاتے ہیں وھدینٰہ النجدین سے یہی مراد ہے، بدکرداری اور پرہیزگاری کا القا بھی ان ہی کی جانب سے ہوتا ہے، تاکہ کتاب وسنت کی روشنی میں بدکرداری سے گریز اور پرہیزگاری پر عمل کیا جا سکے۔

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا (پ ۳۰ ع ۱۶) سے یہی مطلب ہے، حق تعالیٰ ہی کو علم کا مبدأ قرار دے کر علمِ ہدایت وعلمِ اضلال کی تشریح ایک نقشہ سے کی جا سکتی ہے جو قرآنی تفصیلات کے اظہار میں "الیم فی اسم" یا "دریا بہ کوزہ" کا مصداق ہے!

Marfat.com

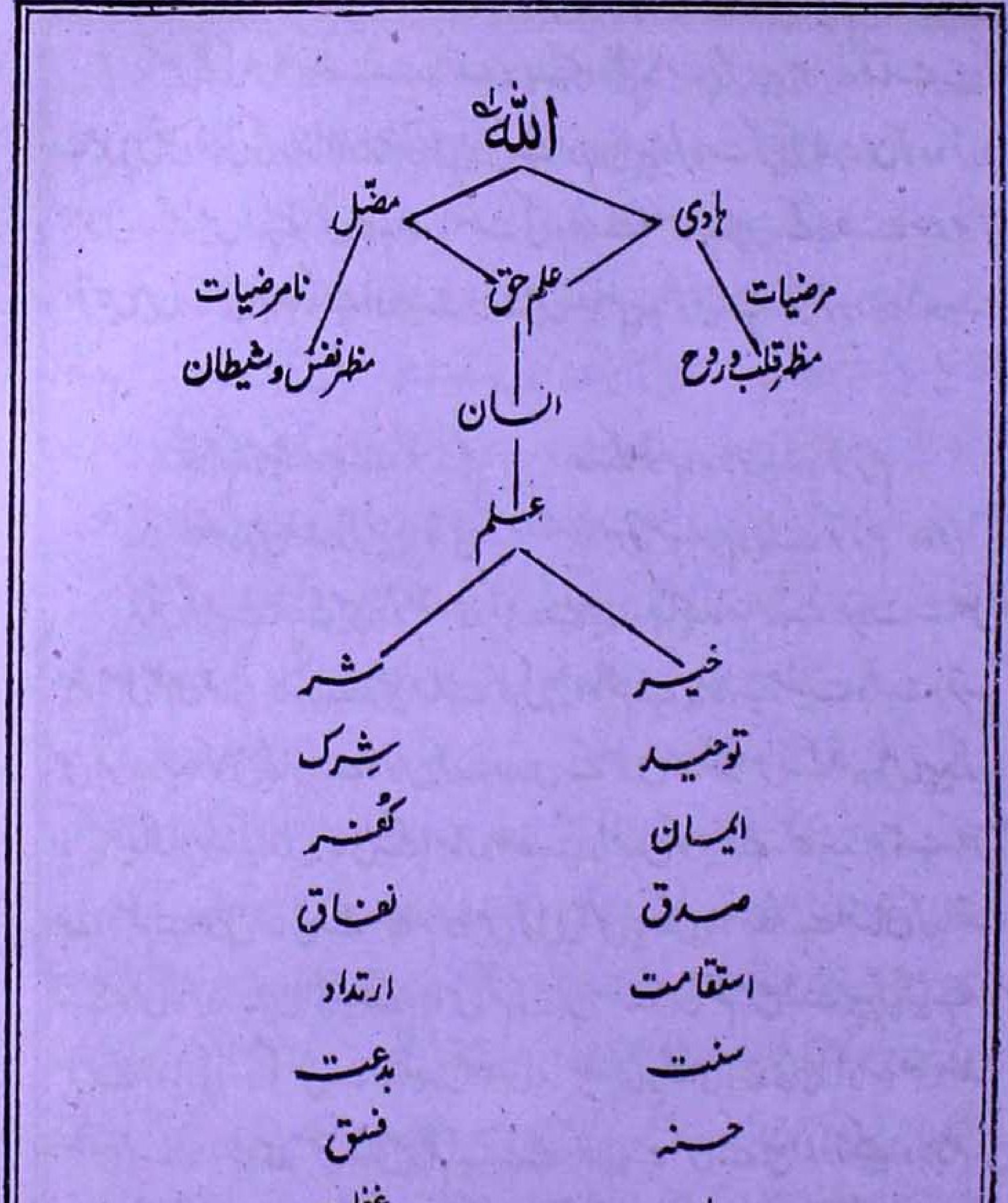
الله
ہادی
مضل
علم حق
مرضیات
نامرضیات
مظہر قلب و روح
مظہر نفس و شیطان
انسان
علم
خیر
شر
توحید
شرک
ایمان
کفر
صدق
نفاق
استقامت
ارتداد
سنت
بدعت
حسنہ
فسق
یاد
غفلت
محویت فی الحق
محویت فی الخلق
یافت و شہود حق
یافت و شہود خلق
مقربین
اصحاب یمین
اصحاب شمال

Marfat.com

جو شخص علم کی ان تفصیلات سے واقف ہو جاتا ہو وہ علم ہدایت پر عمل پیرا ہونے لگتا ہے یہی کرتا ہے جس میں حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہوتی ہے اور ان چیزوں سے گریز کرتا ہے جن کو وہ مکروہ و ناخوش رکھتے ہیں! اپنے اس مجاہدہ و ریاضت کی وجہ سے اصحابِ یمین کے درجہ سے بلند ہو کر مقربین میں شامل ہو جاتا ہے اور جنت ذات میں قیام پیدا کر لیتا ہے۔ فروحٌ و ریحانٌ و جنت نعیم!

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم — خاکے شوم و بہ زیر پائے تو زیم

مقصودِ من خستہ ز کونین توئی — از بہر تو میرم و برائے تو زیم (تمام)

قرآنِ کریم نے علم کے یہی ۲ مقصود قرار دیے ہیں، چنانچہ امام احمدؒ نے معروف سے نقل کیا ہو کہ اصل علم حق تعالیٰ کا ڈر ہے، یعنی سارے علم کی جڑ وہ علم ہے جو موجبِ خشیت و محبت و قربِ حق ہو اور بندہ کو حق تعالیٰ سے مانوس کرے اور ان کے شوق کا شعلہ اس کے قلب میں پیدا کرے اور یہ جیسا کہ اوپر کہا گیا، حق تعالیٰ کے اسماء و صفات و افعال کو جاننے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ علم ہے جو حق تعالیٰ کے احکام اور اس قول یا عمل یا حال یا اعتقاد سے انسان کو واقف کرائے جو ان کو محبوب ہیں اور پسندیدہ! اس علم کو زبانِ سنت میں "علم نافع" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کے ازدیاد کی دعا کی گئی ہے۔ اَللّٰھُمَّ انْفَعْنِی بِمَا عَلَّمْتَنِی وَعَلِّمْنِی وَزِدْنِی عِلْمًا وَارْزُقْنِی عِلْمًا تَنْفَعُنِی بِہٖ (رواہ الترمذی) "حق تعالیٰ جو علم آپ نے مجھے سکھلایا ہے اس سے نفع اندوز کیجیے اور جو علم نافع ہو وہ مجھے سکھلائیے اور میرے علم میں زیادتی کیجیے اور وہ علم مجھے عطا کیجیے جس سے میں نفع اندوز ہوں۔"

دوسری حدیث میں علم نافع کا سوال کیا گیا ہے اور غیر نافع سے استعاذہ:۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَافِعًا وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا یَنْفَعُ اخرجہ للنسائی وابن ماجہ ولفظہ ان النبی صلعم قال سالوا اللّٰہ علما نافعا وتعوذوا باللّٰہ من علم لا ینفع

جس شخص کو "علم نافع" حاصل ہو گیا اس نے اس کے ثمرات کے طور پر "قلب خاشع" بھی پایا۔ "نفس قانع" بھی اور "دعائے مسموع" بھی! اس کا قلب اپنی وسعت کے لحاظ سے ساری کائنات میں

نہیں سما سکتا۔ کیا حباب دریا کا سرپوش ہو سکتا ہے؟

مَنْ وسع الحق فما ضاق عَنْ خَلْقٍ فکیف الامرُ یا سامِعٌ![1] (شیخ اکبرؒ)

علم کے ان ثمرات پر ایک نظر ڈالو۔

(۱) قلبِ خاشع: علمِ نافع جب قلب میں اُتر جاتا ہے تو اب وہ قلب حق تعالیٰ کے لیے خاشع اور شکستہ ہو جاتا ہے اور اس کی ہیبت و جلال کے سامنے اس کی خشیت و محبت و تعظیم کے لیے سرافگندہ اور ذلیل ہو جاتا ہے! اور جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے، حق تعالیٰ کی معرفت بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ان کی خشیت و محبت میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے اور اس کا ذل و انکسار بھی روز افزوں! اسی کیفیتِ قلبی کو سعدی نے ان مشہور اشعار میں ادا کیا ہے:۔

در خاک بیلقاں برسیدم بعابدے گفتم مرا بہ تربیت از جہل پاک کن!

گفتا برو چو خاک تحمل کن اے فقیہ یا ہرچہ خواندۂ ہمہ در زیر خاک کن! (سعدیؒ)

علم کا ثمرہ ہی خشیۃ اللہ ہے! اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (پ ۲۲ ع ۱۶) حق تعالیٰ سے ان کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں! اسی لیے ابن مسعودؓ وغیرہ نے کہا ہے، کفی بخشیۃ اللہ علماً وکفی بالاغترار باللہ جھلاً۔ علم کا نتیجہ خوفِ خدا، اور جہل کا نتیجہ بے خوفی اور دھوکا! علم خوفِ خدا کا نام ہے کثرتِ روایات کا نہیں۔ معلومات کا ذخیرہ جمع کرنے کا نہیں، دماغ کو علومِ رسمی سے پُر کرنے کا نہیں۔ لیس العلم بکثرۃ الروایۃ ولکن العلم خشیۃ عالم وہی ہے جو خدا سے ڈرتا ہے اور جاہل وہی ہے جو اس کی نافرمانی کرتا ہے، "من خشی اللہ فھو عالم ومن عصاہ فھو جاھل"

عالم کی اس تعریف کو پیشِ نظر رکھ کر ہم ہر کتاب خواں اور کتاب داں کو عالم نہیں کہہ سکتے چنانچہ اسی معیار سے جانچ کر امام شعبیؒ اپنے زمانے کے علماء سے کہا کرتے تھے کہ تم عالم نہیں "متلذذ بالمسائل" (INTELLECTUAL EPICURE) ہو، تمہیں علمی مسائل سے بحث کرنے میں

---

[1] جس میں حق سما گیا وہ خلق سے کیونکر تنگ ہو سکتا ہے اور اس کا کیا حال ہوگا اے سننے والے۔

Marfat.com

لذت ملتی ہے اور یہی لذت تمہارا مقصد و غایت ہے اسی پر تم فدا ہو عالم در اصل "عامل للہ فی اللہ باللہ" ہے یعنی عالم وہ ہے جو عرفانِ حق اور خوفِ خدا رکھنے کی وجہ سے اللہ ہی کے لیے عمل کرتا ہے۔ اس کے عمل اور مجاہدہ کا مقصود اللہ ہی کی رضا و محبت ہوتی ہے! اس کا مطلوب و محبوب صرف حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں!

دل از غمِ کائنات برداشتہ بہ! | جز یادِ تو ہر چہ ہست بگذاشتہ بہ!
چشمے کہ نہ از نورِ تو روشن باشد | بشگافتہ و بخاک انباشتہ بہ!

(۲) نفسِ قانع: قلبِ خاشع کا لازمی نتیجہ نفسِ قانع ہے۔ جب دل میں خشوع پیدا ہو گیا، حق تعالیٰ سے ذل و افتقار کی نسبت قائم ہو گئی تو اب نفس اللہ سے راضی اور غیر اللہ سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ اب "غنی عن الاشیاء" ہو جاتا ہے! وہ جانتا ہے کہ کوئی شے حق تعالیٰ سے برتر نہیں جس کے حصول کی وہ خواہش کر سکے، اب سب کچھ اسے حاصل ہو جاتا ہے! اسی لیے فرمایا گیا ہے۔ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ! اس کو علوئے تمکین حاصل ہو جاتی ہے، وہی مخاطب ہوتا ہے اس قول کا: اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ!

نفس ساری کائنات کو پا کر بھی حریص رہ سکتا ہے۔ ھل من مزید کا نعرہ لگا سکتا ہے! لیکن جب وہ حق تعالیٰ کو پا لیتا ہے، ان سے مانوس ہو جاتا ہے تو پھر دنیا اس کی نظر میں حقیر و ذلیل ہو جاتی ہے اور حق تعالیٰ کی عظمت و جلال سے اس کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے! اثرِ اسرائیلی میں اس کا ذکر بڑی خوبی سے آیا ہے:۔

ابن آدم طلبنی تجدنی، فان وجدتنی وجدت کل شیٔ وان فتک
فاتک کل شیٔ وانا احب الیک من کل شیٔ

ابن آدم تو مجھے طلب کر تو مجھے پائیگا۔ جب تو نے مجھے پا لیا تو گویا تمام چیزیں تجھ کو مل گئیں۔ اگر تو نے مجھ کو کھو دیا تو گویا تو نے تمام چیزوں کو گم کر دیا، میں تیرے نزدیک ہر شئے سے زیادہ محبوب ہوں

Marfat.com

پسندیدہ ہوں، اسی مفہوم کو کسی عاشق نے یوں ادا کیا ہے:-

لِکُلِّ شَیْءٍ اِذَا فَارَقْتَہٗ عِوَضٌ وَلَیْسَ لِلّٰہِ اِنْ فَارَقْتَ مِنْ عِوَضٍ [۱]

عارف رومیؒ نے اسی چیز کو اپنے سریلے نغموں میں یوں ادا کیا ہے کہ جب بندہ کو اپنے شاہِ ذیجاہ سے انس و پیار پیدا ہو جاتا ہے تو پھر اس کو سارے دردوں کی دوا مل جاتی ہے اور وہ اس کی طرف اپنا رُخ پھیر کر سارے جہان سے فارغ و بے فکر ہو جاتا ہے:-

آنکہ شد اُنسش بشاہِ فردِ خویش یافت درمانہائے جملہ دردِ خویش

چوں ازاں اقبال شیریں شد دہاں سرد شد بر آدمی ملکِ جہاں (رومیؒ)

حق تعالیٰ سے مانوس ہو کر اس کا نفس دنیا سے سیر ہو جاتا ہے۔ اور دنیا کے اطوار سے بیزار ہو جاتا ہے، وہ طالبِ علو و رفعت نہیں ہوتا، وہ اپنی شہرت کا خواہاں نہیں رہتا، اس کو دولت و ثروت کی ہوس نہیں رہتی، وہ ہمعصروں اور دوستوں میں بلندی کی تمنا نہیں کرتا، اس کو لوگوں کی نگاہوں میں عظمت حاصل کرنے کی آرزو نہیں رہتی، اور مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لیے جانے کی خواہش نہیں رہتی (امام سفیان ثوری) امام حسن کے الفاظ میں (الزاھد فی الدنیا الراغب فی الآخرۃ، البصیر بدینہ، للمواظب علیٰ عبادۃ ربہ ہو جاتا ہے) یعنی دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے، آخرت کی طرف مائل ہوتا ہے، اپنے دین میں بصیرت رکھتا ہے، اور اپنے رب کا عبادت گذار بندہ بن جاتا ہے" وہ اپنے بڑے پر حسد نہیں کرتا اور اپنے سے چھوٹے کا مذاق نہیں اُڑاتا۔ جوں جوں اس کا علم بڑھتا جاتا ہے حق تعالیٰ کا خوف بڑھتا جاتا ہے، تواضع و انکسار میں زیادتی ہوتی جاتی ہے "اھل العلم النافع کلما ازداد و من ھذا ازداد واللہ تواضعًا و خشیۃً وانکسارًا و ذلًّا" (ابن عمر)

وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے زندہ رہتا ہے، مال و گنج کے لیے نہیں، وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے جان دیتا ہے، خوف و رنج سے نہیں مرتا۔

---

[۱] ہر چیز کا جو تجھ سے جاتی رہے بدلہ ہے لیکن اگر اللہ تجھ سے جاتا رہے تو اس کا کوئی بدل نہیں۔

Marfat.com

ہر کجا امر قدم را مسلکیست — زندگی و مردگی پیشش یکیست
بہر یزداں می زید نے بہر گنج — بہر یزداں می مرد نز خوف و رنج
ہست ایمانش برائے خواہ او — نے برائے جنت و اشمار و جو!
ترک کفرش ہم برائے حق بود — نے زبیم آنکہ در آتش رود
ایں چنیں آمد ز وصل آں خوی او — بے ریاضت نے بجستجوے او
آنگہاں خندد کہ او بیند رضا — ہمچو حلوائے شکر او را قضا (رومیؒ)

(۳) دعائے مسموع :- جب قلب میں خشیۃ پیدا ہو گئی اور وہ حق تعالیٰ کی محبت سے منور ہو گیا اور دنیا سے شکم سیر ہو گیا تو اب وہ حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب ہو جاتا ہے، اب اس کو ذکر و دعا میں حلاوت، مناجات میں لذت، ادائے فرضِ عبودیت میں سرور و مسرت حاصل ہونے لگتی ہے۔ اب وہ اپنے رب سے جو کچھ مانگتا ہے، اس کو دیا جاتا ہے، جو دعا کرتا ہے قبول کی جاتی ہے۔ چنانچہ حدیثِ قدسی میں صاف وعدہ کیا گیا ہے:-

لا یزالُ عبدی یتقربُ اِلیَّ بِالنوافل حتیٰ احبّہُ الیٰ قولہ فلئن سألنی لأُعطینّہ ولان استعاذنی لأُعیذنہ (وفی روایۃ) ولئن دعانی لاجبتہٗ (رواہ البخاری)

جب بندہ کو حق تعالیٰ سے انس و تقرب حاصل ہو جاتا ہے تو اب اس کی دعا مسموع ہوتی ہے، اس کا سوال پورا کیا جاتا ہے اور وہ حق تعالیٰ کی پرورش میں آ جاتا ہے، وہ اس کے ولی ہو جاتے ہیں۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کو وصیت فرمائی تھی کہ:-

---

لہ پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے: ہمیشہ میرا بندہ نزدیک ہوتا ہے مجھ سے بذریعہ نوافل کے تا آنکہ دوست رکھتا ہوں میں اس کو تو ہوتا ہوں میں شنوائی اس کی جو سنتا ہے وہ اس سے، اور بینائی اس کی جو دیکھتا ہے اس سے اور ہاتھ اس کا جو پکڑتا ہے اس سے اور پیر اس کا جو چلتا ہے اس سے، اور اگر سوال کرے مجھ سے تو دیتا ہوں میں اس کو، اور اگر پناہ مانگے مجھ سے تو البتہ پناہ دیتا ہوں میں اس کو (اور ایک روایۃ میں یہ بھی ہے کہ) اگر وہ دعا کرے مجھ سے تو البتہ میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں۔

Marfat.com

"یاغلام! احفظ اللّٰہ یحفظک، احفظ اللّٰہ تجدہ امامک، تعرف اللّٰہ فی الرخاء یعرفک اللّٰہ فی الشدۃ" یعنی اے لڑکے تو حق کو نگاہ رکھ (اس طرح کہ اوامر و نواہی کو بجا لا اور قضاء، قدر کو مان) تو اللہ تجھ کو اپنی حفاظت میں رکھیگا، تو اللہ کو نگاہ رکھ (مراقبہ علم و حضور و معیت کے ساتھ) تو اس کو اپنے سامنے پائیگا (وہ تجھ کو دنیا و آخرت دونوں کی آفتوں سے محفوظ رکھیگا) تو اللہ کی یاد آرام و چین کی حالت میں کر وہ تجھ کو سختی کی حالت میں یاد کریگا (تیری دعا کو قبول کریگا اور تیری مصیبت کو دور کریگا!) اسی لیے تو عارف رومیؒ نے کہا تھا:-

زندگی بے دوست جاں فرسودن است　　　مرگِ حاضر غائب از حق بودن است
عمر و مرگ ایں ہر دو باحق خوش بود!　　　بے خدا آبِ حیات آتش بو! (رومیؒ)

جب علمِ نافع نے ہمیں قلبِ خاشع، نفسِ قانع، دعائے مسموع کی نعمتوں سے بہرہ یاب کردیا تو اب اس میں حق تعالیٰ ہی میں مشغولیت حاصل ہو جاتی ہے، تمام عالم سے بخود فانی ہوکر باقی بحق ہو جاتے ہیں، ماسوی اللہ سے قلب کا تخلیہ ہو جاتا ہے اور یافت و شہودِ حق ہی ہمارا عمل ہو جاتا ہے، یعنی ہم مخلوقات کو چھوڑ کر خالق میں، معلومات کو ترک کرکے عالم میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے علمِ نافع کا ثمرہ اور اس کا انجام!

چوں بہ مطلوبت رسیدی اے ملیح　　　شد طلب گاری علم اکنوں قبیح
چوں شدی برباجہائے آسماں　　　سرد باشد جستجوئے نردباں (رومیؒ)

نسأل اللّٰہ علماً نافعاً و نعوذ بہ من علم لا ینفع و من قلب لا تخشع و من نفس لا تشبع و من دعاء لا یسمع، اللّٰھم انا نعوذ بک من ھٰؤلاء الاربع

انسانِ کامل[1]

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست!

زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستم دستانم آرزوست!

گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست! (رومیؒ)

ان اشعار میں عارفِ رومؒ نے دیو جانس کلبی کے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ ایک روز وہ دن کے وقت ہاتھ میں چراغ لے کر کسی گم شدہ شئے کی نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ تلاش کر رہا تھا! لوگوں نے یہ نظارہ دیکھ کر پوچھا کہ "اجی آخر ڈھونڈھتے کیا ہو؟" کہا کہ 'انسان' کو ڈھونڈھ رہا ہوں!

اسی حکیم کا ذکر ہے کہ ایک روز وہ اونچے مقام پر چڑھ کر پکارنے لگا کہ "لوگو! اِدھر آؤ!" جب چند لوگ اس کے قریب پہنچے تو اُس نے انہیں اپنے سونٹے سے مار بھگایا اور کہا کہ "میں نے تو انسان کو بُلایا تھا تم تو بول و براز ہو!"

گویا دیو جانس کی نظر میں انسانِ کامل اور اس 'انسان نما' صورت میں وہی فرق ہے جو کسی شخص میں اور اس کے بول و براز میں ہو سکتا ہے! دیو جانس اور اس کے متبعین نے انسانِ کامل کا جو تصور پیش کیا ہے اس کی زیادہ تفصیل تو ان کے ہاں نہیں ملتی البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ انسانِ کامل کی زندگی کا مقصود ذواقیت اور لذت پرستی نہیں بلکہ حق طلبی و حق رسی ہے جس کو وہ اپنی زبان میں "نیکی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ نیکی سے ان کی مراد خواہشات سے قلب کا کامل تخلیہ ہے! جب انسان کا قلب تمام نفسانی خواہشات سے فارغ ہو جاتا ہے، لذتوں کی تمنا اور آرزو اس کے دل سے نکل جاتی ہے، مال و دولت، جاہ و عزت کی طلب بالکل جاتی رہتی ہے تو وہ کمال

[1] یہ مقالہ نشرگاہ حیدرآباد دکن سے نشر کیا گیا۔

Marfat.com

کے اس زینہ تک پہنچ جاتا ہے جو انسان کے عروج کا آخری زینہ ہے! کلبیہ کا نعرہ تھا:۔

خر نیستی از آب و علف دست بدار۔ سگ نیستی از جیفۂ دنیا بگذر!

قلب لذت کی خواہش سے آزاد ہو جائے، لذت کے مؤیدات جاہ و شہرت، مال و دولت سے مستغنی ہو جائے۔ اتنی بات تو صاف ہے لیکن قلب کے اس تخلیہ کے بعد اس کا تحلیہ کس چیز سے ہو؟ کلبیہ کا جواب ہے نیکی سے! نیکی سے کیا مراد ہے؟ اس کا ایجابی تضمن کیا ہے؟ ارشاد ہوتا ہے کہ نیکی سے مراد "خواہشاتِ نفسانیہ سے قلب کا تزکیہ!!" اس دور سے کلبیہ نہیں نکلتے اور خود نیکی یا کمال کا کوئی ایجابی تضمن ہیں ان سے معلوم نہیں ہوتا یا پھر فلسفہ کی تاریخ میں یہ محفوظ نہیں کیا گیا۔

اب ہم اس تلاش میں یونان کے اس فلسفی کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کی "نگاہ زلزلہ عالم افکار" ہے، جو یونان کا سب سے بڑا مفکر ہے، ہماری مراد افلاطون سے ہے۔ یونان کے مفکرین میں سب سے پہلے افلاطون ہی نے روحِ انسانی کی تشفی بخش نفسیات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ روحِ انسانی کی تین ملکات میں تقسیم کرتا ہے جن میں سے ایک کی فطرت عقلی ہے اور دو کی غیر عقلی۔ سب سے ادنیٰ ملکات جو روح کا غیر شریف اور دنی حصہ ہیں، وہ احساسات، خواہشات اور اشتہاآت ہیں۔ ان کی فطرت غیر عقلی ہے۔ ان میں نہ کوئی نظم ہوتا ہے نہ ترتیب، ان کا نہ کوئی اصول ہوتا ہے نہ قاعدہ! ضروری ہے کہ ان پر ایک اعلیٰ ملکہ کی حکمرانی ہو، قہرمانی ہو، جو ان کو حدِ اعتدال میں رکھے، عفت و پاکبازی کے اصول کے تحت ان پر حکومت کرے! یہ اعلیٰ ملکہ عقل کا ہے جو اپنی فطرت کے لحاظ سے شریف ہے جو حکمت کا مقام ہے! جس طرح خواہشات اور اشتہاآت کا کام عقل کی فرمانبرداری و اطاعت پذیری ہے اسی طرح عقل کا فطری و الٰہی حق حکمرانی و قہرمانی ہے۔ عقل جذبات و خواہشات پر حکمرانی کے لیے بنائی گئی ہے! ان دو ملکات کے درمیان روح کا تیسرا ملکہ ہے جس کو ہم اپنی زبان میں ارادہ سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ احساسات و اشتہاآت کی طرح دنی و رذیل نہیں، فطرۃً

Marfat.com

مائل بہ شر نہیں۔ یہ خلقاً شریف ملکہ ہے اور جب اس کی صحیح رہبری کی جاتی ہے تو یہ اعلیٰ کمالات کے حصول کا ایک قوی ذریعہ بن جاتا ہے لیکن چونکہ یہ بذات خود غیر عقلی ہے اور کورانہ جذبہ کی شکل اختیار کرسکتا ہے، لہٰذا اس کا مقام عقل سے فروتر ہے۔ یہ عقل کا خادم ہے جس کو جذبات واشتہاآت کو مطیع اور رام کرنے کے کام پر لگایا جاسکتا ہے۔ افلاطون ادنیٰ ملکات کا مقام جگر کو قرار دیتا ہے، عقل کا سر کو، اور ارادہ کا گردن سے نیچے کے حصّہ کو، اس مقام کی وجہ سے وہ جذبات وخواہشات کو روک سکتا ہے اور عقل کی ہدایت ورہبری حاصل کرسکتا ہے۔

افلاطون کی رائے میں یہ تینوں ملکات حقیقی معنی میں ایک دوسرے سے جُدا وعلیٰحدہ ہیں اگر فطرتِ انسانی کو کامل وحدت قرار دیا جائے تو پھر اس امر کی توجیہ کسی طرح نہیں کی جاسکتی کہ کیوں عقل کو اکثر دفعہ جذبات کے خلاف اپنی پوری قوت سے جنگ کرنی پڑتی ہے۔ سچ پوچھو تو عقل ہی روح ہے اور حواس بدن کے محض وظائف ہیں۔ تاہم یہ نہ خیال کیا جائے کہ ان کے درمیان کوئی ربط وتعلق نہیں۔ ایسا نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ادنیٰ ملکات اعلیٰ ملکات کی خدمت واطاعت کے لیے ہیں، جسم روح کی خدمت گزاری کے لیے ہے۔ اس ربط وتعلق کو افلاطون نے ایک مشہور مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے جو رتھ بان اور پردار گھوڑوں کی مثال کہلاتی ہے۔ ان دو گھوڑوں میں سے ایک شریف ہے اور دوسرا رذیل، اس لیے ان دو کو ایک ساتھ قابو میں رکھنا نہایت مشکل کام ہے۔ شریف گھوڑا ارادہ کی تعبیر ہے اور رذیل جذبات وخواہشات کی، رتھ بان عقل ہے۔ شریف عنصر کا رُخ آسمان کی جانب ہوتا ہے، اس کا رجحان ومیلان علو ورفعت کی طرف ہے، وہ جمال وکمال کا دلدادہ ہے، لیکن جسم اس کو زمین کی طرف کھینچتا ہے، زمین کی لذتوں اور شہوتوں پر وہ جان دیتا ہے، ہر اچھی چیز کا تعلق شکم ہی سے قرار دیتا ہے یا پھر ساری کائنات کا محور ومرکز آلۂ تناسل کو سمجھتا ہے، اور اسی کا شیفتہ و ربودہ ہے۔ اب رتھ بان یا عقلِ قہرماں کا کام ہے کہ اپنے ان دونوں گھوڑوں کو قابو میں رکھے،

Marfat.com

ادنیٰ و رذیل کو اعلیٰ و شریف کے تابع کردے، ان کا رُخ علو و رفعت کی جانب پھیر دے، نتیجہ کے طور پر روح میں عدالت کی صفت پیدا ہوتی ہے جو اس کا کمال ہے، یعنی روح کا کمال اس کے مختلف ملکات یا حصوں کا ایک خاص ربط و تعلق ہے جس میں ہر ملکہ یا حصہ اپنی فطرت و ماہیت کے لحاظ سے اپنے صحیح مقام پر اپنے خاص فرائض کی ادائی میں مصروف ہو جاتا ہے اور وضع الشئی علیٰ محلہٖ کے اصول کی تعمیل و تکمیل ہو جاتی ہے! فرد عقلمند و حکیم اس وقت سمجھا جاتا ہے جب عقل روح کے دوسرے ملکات پر حکومت کرتی ہے اور جانتی ہے کہ ان کی فلاح و بہبود کس چیز میں مضمر ہے۔ فرد میں شجاعت کی صفت کا اس وقت ظہور ہوتا ہے جب ارادہ، لذت والم، کرب و طرب میں عقل کی ہدایت پر عمل کرتا ہے کہ کس چیز سے خوف کیا جائے اور کس چیز سے نہیں۔ اس میں عفت کی صفت اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب ارادہ اور جذبات و شہوات عقل کے حکم و اقتدار کا اتباع کرنے لگتے ہیں۔ جب عقل، ارادے اور شہوتوں میں توافق و ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی ہر ایک اپنا مناسب فرض ادا کرنے لگتا ہے تو فرد میں عدالت کی صفت کا ظہور ہوتا ہے، امہات فضائل یہی چار ہیں: حکمت و شجاعت، عفت و عدالت۔

اب انسانِ کامل کی روح میں کامل توافق، ہم آہنگی و ربط پایا جاتا ہے، جس میں اعلیٰ کا ادنیٰ پر کامل اقتدار ہوتا ہے، جس کی وجہ سے حکمت، شجاعت، عفت و عدالت کی صفاتِ حسنہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ متجلّی ہوتی ہیں، اور یہی صفات جملہ فضائل کا مبدا و منبع ہیں، تمام محاسن کا ان ہی سے ظہور ہوتا ہے! ان کا حامل انسانِ کامل ہے، اپنی قیمت کے لحاظ سے "دارائے دو جہان" ہے! گو "کشتگانِ شہوت" کی نظر میں حقیر و صغیر ہی کیوں نہ ہو ؎

پیشِ طفلاں خوار و زار و ریش خند ۔ پیشِ حق محبوب و مطلوب و پسند! (رومی)

انسان جسم و روح پر مشتمل ہے، جسم عناصرِ کثیرہ سے مرکب ہے اور روح میں کئی ملکات پائے جاتے ہیں، اس طرح انسان ایک کثرت ہے لیکن جب جسم کو روح کا تابع کر دیا جاتا ہے اور روح کے مختلف ملکات عقل کے منقاد ہو جاتے ہیں تو اب انسان میں ایک وحدت پیدا ہو جاتی ہے، ایسی

Marfat.com

وحدت جس کی تکوین مختلف عناصر سے ہوئی ہے اور جو اپنا ظہور کثرت میں کرتی ہے۔ اسی لیے افلاطون کہتا ہے کہ کمال توافق، ہم آہنگی یا وحدت کا نام ہے اور مرد کامل وہ مطرب (Musician) ہے جو گویا مختلف آوازوں کی ترتیب سے ایک دلفریب نغمہ پیدا کرتا ہے۔ یہ دلفریب نغمہ توحید کا نتیجہ ہے! چونکہ حق تعالیٰ واحد ہیں لہٰذا کمال یا فضیلتِ عدالت افلاطون کے الفاظ میں "تشبہ باللہ"[1] ہے۔

اس وحدت یا کمال کا لازمی، ضروری قطعی نتیجہ مسرت ہے۔ روحِ انسانی کی فطری خوبی یہی کمال یا فضیلت ہے اور اس کا فطری نتیجہ مسرت ہے۔ انسانِ کامل ہمیشہ مسرور و شاداں ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ لکد کوبِ جہان سے بالکلیہ محفوظ نہیں ہوتا: اس کے دوست و احباب اس کے ساتھ بے شرمی کا برتاؤ کر سکتے ہیں، وہ کورانہ نفرت کا شکار ہو سکتا ہے، اس کو کشاں کشاں زندان میں جھونکا جا سکتا ہے، اور تازیانہ کی سزا دی جا سکتی ہے، وہ اپنے مصائب کا انجام سولی پر پا سکتا ہے، "تاہم" عدالت کے سوا ہر چیز کو کھو کر وہ مسرور و شاداں ہو سکتا ہے! اس کی روح نغمۂ الٰہی کی گونج سے ہمیشہ فرح و انبساط، ذوق و مستی کی حالت میں ہوتی ہے، وہ اغیار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

کیست ز و بہتر بگوئے ہیچ کس   تا بداں دل شاد باشی یک نفس

من نہ شادی خواہم و نے خسروی   انچہ می خواہم من از تو ہم توی (رومی)

افلاطون کا یہ بیان حکمتِ ایمانی کی نظر میں اسی وقت کامل مانا جائیگا جب عقل کو بھی شرع کے تحت کر دیا جائے:

صبح ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے

جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول (اقبال)

---

[1] Being made like unto God

Marfat.com

امامِ غزالی کا فلسفۂ مذہب

کس را پسِ پردۂ قضا راہ نشد ... وز سرِ قدر ہیچ کس آگاہ نشد
ہر کس ز سرِ قیاس چیزے گفتند ... معلوم نگشت و قصہ کوتاہ نشد (غزالیؒ)

میری تحقیق کی رو سے (اور مجھے اپنے عجز کا اعتراف ہے)" فلسفہ عقل و استدلال کے ذریعے کسی شے کی آخری و انتہائی حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کا نام ہے اور فلسفہ اپنی موزوں ترین شکل میں تمام موجودات کی انتہائی ماہیت کو دریافت کرنے کی سعی کے سوا کچھ نہیں"

اس کے برخلاف سائنس کا سارا تعلق عالمِ مظاہر سے ہے، سائنس واقعاتِ تجربیہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے۔ عالمِ سائنس۔ مظاہرِ عالم کے ایک مجموعہ کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ متعلقہ واقعات کو جن کی اس کو تحقیق کرنی ہے جمع کرتا ہے، پھر ان کی تعریف و تحدید کرتا ہے، پھر ان کی تحلیل و ترکیب کی طرف توجہ کرتا ہے، پھر ان کا اصطفاف کرتا ہے پھر پھر ان شرائط یا علل کا مطالعہ کرتا ہے جن کے تحت یہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں، ان کی یکسانیتِ عمل کا تعین کرتا ہے، یعنی ان کے قوانینِ عمل کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالہ کی صورت میں پیش کر دیتا ہے اور یہاں پر اس کا کام عالمِ سائنس کی حیثیت سے ختم ہو جاتا ہے، یعنی اُس نے واقعاتِ تجربیہ یا مظاہر کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا، ان کے طرزِ وقوع و طریقۂ عمل کو سمجھا دیا! غرض عالمِ سائنس کا کام اس عالمِ شہادت سے ہے۔ اس کی نگاہ واقعات اور مظاہر کی جانب لگی رہتی ہے، اس کی توجہ تجربات کی طرف ہوتی ہے۔ اشیاء کے باہمی ربط کو وہ دریافت کرتا ہے، ان کے پیش کرنے میں وہ حزم و احتیاط سے

ؔ یہ مقالہ نشرگاہ حیدرآباد دکن سے نشر کیا گیا۔

Marfat.com

کام لیتا ہے اور اس طرح وہ ان قوانین و علل کو معلوم کر لیتا ہے جن کے تحت عالمِ شہادت کے واقعات ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ اس علم سے اس کو قوت حاصل ہوتی ہے اور کائنات کی تسخیر میں وہ کامیاب ہوتا ہے!

عالمِ سائنس کے برخلاف فلسفی کو عالمِ غیب کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ مظاہر کے ماورا پہنچ کر حقائق اشیاء کا علم حاصل کرنا چاہتا ہے، حقائق کے انتہائی علوم پر مطلع ہونا چاہتا ہے، اُس حقیقت کی ماہیت سے واقف ہونا چاہتا ہے جو انتہائی و آخری حقیقت ہے جو اشیاء کا باطن ہے، جو باوجود اشیاء میں شدت ظہور کے غیب الغیب ہے جس کا علم انسان کے حواس و قیاس و ادراک و فہم و عقل کے لیے مستور ہے۔

اس غیب کے علم کی طلب انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس کی جستجو و طلب ہی نے اس کو حیوان سے ممتاز کر رکھا ہے۔ اس کے تمام علوم و فنون، حکمت و فلسفہ اسی غیب کے یقین اور اس کی پیہم جستجو کا نتیجہ ہیں! اسی غیب کی یافت کی تڑپ میں وہ تن کی پرورش کو بھی ایک حقیر و ذلیل عمل قرار دیتا رہا ہے!

لیکن جن غیبوں تک انسان اب تک پہنچ سکا ہے وہ صحیح معنی میں غیب نہیں بلکہ ہمارے عالمِ شہادت ہی کے ذرا مخفی اور دور افتادہ گوشے ہیں جن کو محض اضافی یا اعتباری غیوب کہا جا سکتا ہے! غالب نے اس حقیقت کو کس خوبی سے ادا کیا ہے:

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود　　　ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

باقی اصلی اور حقیقی غیب یا "غیب الغیب" تک انسانی عقل اور ذرائع علم کی رسائی کسی کو بھی نہیں ہو سکتی! قُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ (پ ع ۱۱) یعنی غیب کا علم صرف اللہ ہی کو ہے کہہ کر قرآن اس حقیقت کو واضح کر رہا ہے اور انسان سے اس علم کی قطعی نفی کر رہا ہے۔

تاریخِ فلسفہ پر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ فلسفہ میں ادعائی نظامات کے پیش ہونے کے بعد ہی جب غیب کے کلی و یقینی علم کا فلسفیوں نے دعویٰ کیا تو ارتیابیت اور لاادریت نے ان کے ان بلند بانگ دعووں کی شدت سے تردید شروع کر دی اور انسانی علم

کو عالمِ شہادت ہی تک محدود کر دیا۔ ہیوم نے فلسفۂ جدید میں نہایت قوت کے ساتھ یہ واضح کر دیا کہ انسان کا سارا علم مظاہر ہی کی حد تک محدود ہے، کیونکہ اس کا دار و مدار 'ارتسامات' یا ان کی نقل "تصورات" پر ہے، لہذا محسوس ہی کو ہم 'موجود' کہہ سکتے ہیں اور 'غائب' کا ہمیں کوئی علم نہیں ہو سکتا۔ ہیوم کی ارتیابیت نے کانٹ کو اس کے خواب ادعائیت سے جگایا اور جاگنے کے بعد اس کی تحقیق کا نتیجہ یہ نکلا کہ حقائق اشیاء کا علم نہ صرف یہ کہ اب تک انسان کو حاصل نہیں ہوا بلکہ عقل و استدلال کی راہ سے ہمیشہ کے لیے ناممکن الحصول ہے۔ حقائقِ اشیاء کو کانٹ کی اصطلاح میں 'بواطن' (Noumena) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے اور انسانی علم اس کے مقابلہ میں 'ظواہر' (Phenomena) یا قرآن کی اصطلاح میں "عالمِ شہادت" تک محدود ہے!

تاریخِ فلسفہ میں غزالی ہی وہ اولو العزم اور جلیل القدر فلسفی ہیں جنہوں نے وجداناً ان حقائق کو پیشِ نظر رکھ کر عقلِ نظری کو علمِ وحی کے تابع کر دیا اور مشکوٰۃِ نبوی سے اخذِ نور کر کے کائنات کے متعلق وہ نظریہ پیش کیا جو گو "ماورا رطورِ عقل" (Supra-rational) ضرور ہے لیکن قطعاً خلافِ عقل (Contra-rational) نہیں، جس سے واقف ہو کر انسان اس صداقت کا قائل ہو جاتا ہے:

ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش | با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است

غزالی عقل و ایمان (جن کو جنونِ الٰہی، سے تعبیر کیا جاتا ہے) حکمت و شریعت 'علم استدلالی و قبول ایمانی' کے وجدانات سے استفادہ کر کے ہمیں اس حقیقت الحقائق سے مانوس کر دیتے ہیں جن کے یافت و حصول کی تڑپ فطرتِ انسانی میں روزِ آفرینش ہی سے موجود ہے۔ اسی لیے مجھے ان کا فلسفہ سب سے زیادہ پسند ہے۔ ہم اس مختصر تحریر میں ان کی اسی 'یافت' کے چند روشن پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کر رہے ہیں۔

غزالی نے اہلِ عقل کی توجہ اس روشن حقیقت کی طرف منعطف کی کہ جوہرِ انسانی

اپنی اصل فطرت کے اعتبار سے بالکل سادہ پیدا کیا گیا ہے اور اس کو حق تعالیٰ کے لاتعداد عالموں کی ابتدا میں کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اس کو عالم کی خبر ادراک کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کا ہر ادراک اس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ وہ موجودات کے کسی خاص عالم کا علم حاصل کرے۔ سب سے اوّل انسان میں قوتِ لامسہ پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ موجودات کے بہت سے عوالم کا ادراک کرنے لگتا ہے۔ مثلاً گرمی، سردی، خشکی، تری، سختی، نرمی، مگر یہ قوت رنگ اور آوازوں کے ادراک سے بالکل قاصر ہے۔ "ہنگامۂ رنگ وصوت" اس کے لیے قطعاً معدوم ہوتا ہے! لامسہ کے بعد انسان میں قوتِ باصرہ پیدا ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ رنگ اور شکلوں سے واقف ہوتا ہے، عالم کی رنگینیوں کا مشاہدہ کرتا ہے! پھر قوتِ سامعہ بیدار ہوتی ہے جس کے ذریعہ وہ آوازوں اور نغموں کو سنتا ہے اور کیف اندوز ہوتا ہے پھر انسان میں قوتِ ذائقہ پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ مختلف لذتوں سے بہرہ یاب ہوتا ہے!

اب وہ عالمِ محسوسات کے دائرہ سے آگے قدم اٹھاتا ہے اور سات سال کی عمر کے قریب اس میں قوتِ تمیز پیدا ہوتی ہے! یہ حالت اس کے 'اطوارِ وجود' میں سے ایک طور ہے اور اس حالت میں وہ ایسے امور کا ادراک کرنے لگتا ہے جو عالمِ محسوسات سے ماوراء ہوتے ہیں! پھر وہ ترقی کرتا ہے اور اس حالت پر فائز ہوتا ہے جس میں اس کے لیے عقل پیدا کی جاتی ہے اب وہ واجب ومحال، ممکن وناممکن، جائز وناجائز کا ادراک کرنے لگتا ہے جن کا شعور اس کو پہلی حالتوں میں حاصل نہ تھا!

غزالی تبلاتے ہیں کہ عقل کی سرحد کے ماوراء ایک اور درجہ بھی ہے جس میں انسان کی دوسری آنکھ کھلتی ہے، جس کے ذریعہ وہ غیب کی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے اور ایسے امور کا ادراک کرنے لگتا ہے جن کے ادراک سے عقل ایسی ہی قاصر ہے جیسے قوتِ تمیز ادراکِ معقولات سے اور قوتِ حس مدرکاتِ تمیز سے! اسی درجہ کا نام نبوت ہے!

Marfat.com

بعض لوگ اس درجہ کے منکر ہیں، لیکن ان کا یہ انکار عین جہالت ہے اور اس انکار کی اس کے سوا کوئی وجہ نہیں کہ وہ خود اس حالت پر فائز نہیں ہوئے اور چونکہ ان کے حق میں یہ حالت کبھی موجود نہیں ہوئی اس لیے وہ گمان کرتے ہیں کہ یہ حالت فی نفسہ موجود نہیں، عدم علم سے وہ عدمِ وجود کا استنباط کرتے ہیں! اگر اندھے کو متواتر روایت کے ذریعہ رنگوں اور شکلوں کا علم نہ ہوتا اور اوّل مرتبہ ان امور کا اس کے سامنے ذکر کیا جاتا تو وہ ان کو ہرگز نہیں سمجھتا اور ان کا کبھی اقرار نہ کرتا!

اہلِ عقل کا نبوت کے درجہ سے انکار ایک معنی میں جائز ہے۔ غزالی خود صراحت کرتے ہیں کہ "تصدیق تو ہمیشہ سمجھنے کے بعد ہوتی ہے" بغیر سمجھنے کے کسی چیز کی تصدیق سخت دشوار ہے۔ اس لیے وہ نبوت کی خاصیت کا ایک نمونہ خود انسان کے تجرباتِ زندگی ہی میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسے روشن نمونے اور صاف مثال کے بعد انکار کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی، ذرا اس نمونہ پر غور کرو۔ یہ نمونہ خواب ہے۔ دیکھو خواب میں انسان کو بعض دفعہ ہونے والے واقعات کا صریحاً علم ہو جاتا ہے یا تمثیل کی صورت میں ان کا انکشاف ہوتا ہے جو تعبیر کے ذریعہ سمجھ میں آجاتے ہیں (Veridical Dreams) اس بات کا اگر انسان کو خود تجربہ نہ ہوا ہوتا اور اس سے یہ کہا جاتا کہ بعض وقت آدمی مردہ کی مانند بے ہوش ہو جاتا ہے، اس کی قوتِ حس، اس کی شنوائی و بینائی زائل ہو جاتی ہے اور غفلت و ذہول کی اس حالت میں اس کو غیب کا ادراک ہوتا ہے، وہ ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کرتا ہے ـــ تو یہ سن کر انسان اس کے ماننے سے قطعاً انکار کرتا ہے، اس کو محال قرار دیتا ہے اور اس پر یوں دلیل قائم کرتا ہے کہ آلاتِ ادراک تو قوائے حسی ہی ہیں، جس شخص کو ان آلات کی موجودگی کی حالت میں ایسے واقعات کا ادراک نہیں ہو سکتا تو پھر ان قویٰ کے معطل و زائل ہو جانے کے بعد کس طرح علم ہو سکتا ہے؟ مگر اس قسم کے قیاس کی تردید کیا وجود اور مشاہدہ سے نہیں ہو رہی ہے؟ جس طرح عقل کے ذریعہ انسان کو وہ نظر حاصل ہوتی ہے جو تعقلات و تصورات کا مشاہدہ کرتی ہے جن کے ادراک سے حواس بالکل قاصر ہیں، بالکل اسی طرح نبوت سے

Marfat.com

مراد ایک ایسی حالت ہے جسکی وجہ سے ایسی نورانی نظر حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے ذریعہ امورِ غیب اور وہ امور جن کا عقل قطعاً ادراک نہیں کر سکتی ظاہر ہونے لگتے ہیں، لہٰذا

بند احکامِ عقل میں رہنا یہ بھی ایک نوع کی حماقت ہے (درد)

ان فلسفیوں کو جو عقلیت کے پرستار ہیں اور عقل کے سوا علم و عرفان کے کسی اور ملکہ اور قوت کے قائل نہیں، نبوت کے درجہ کی خبر دے کر، اس کے واضح اور اجاگر نمونہ کو خود ان کے تجربہ میں مبتلا کرا اور یہ ثابت کر کے کہ حقائقِ ایمان کی یافت میں عقل کی آنکھ اتنی ہی معتبر ہے جتنی کہ مادر زاد اندھے کی آنکھ رنگوں کے ادراک میں، غزالی ارکان و حدود شرعی کی حقیقت کو مشکوٰۃِ نبوی سے اخذ کر کے فلسفیانہ طریقہ پر اس کی جو تفہیم کرتے ہیں وہ بڑی دلچسپ ہے:

زیں شہد یک انگشت بسانم بلبت ازلذت آگر محو نگردی تُف کن

فرماتے ہیں کہ انسان دو چیزوں سے بنایا گیا ہے: جسم اور قلب۔ قلب سے مراد حقیقتِ روحِ انسانی ہے جو عرفانِ الٰہی کا محل ہے، نہ وہ گوشت و خون کا ٹکڑا جس میں مردے اور چار پائے بھی شریک ہیں، اور یہی وہ چیز ہے جس کے لیے جسم ایک آلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ جسم کی صحت جسم کے لیے باعثِ سعادت ہے اور اس کا مرض اس کے لیے باعثِ ہلاکت۔ اسی طرح قلب کے لیے بھی صحت و عافیت کی ایک حالت ہوتی ہے اور مرض و تکلیف کی ایک کیفیت، جیسا کہ قرآن میں اشارہ کیا گیا ہے کہ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ (ان کے دلوں میں بیماری ہے) اللہ کا نہ جاننا زہر مہلک ہے اور خواہشاتِ نفسانی کی پیروی کر کے احکامِ الٰہی کو ترک کرنا اور معصیت میں مبتلا ہونا قلب کا سخت روگ ہے۔ اللہ کی معرفت اس کے لیے زندگی بخش تریاق ہے اور خواہشاتِ نفسانی کی مخالفت اور احکام و اوامرِ الٰہی کی متابعت اس کے لیے دوائے شافی ہے۔ جس طرح بدن کا علاج دوا کے استعمال ہی سے ہو سکتا ہے اسی طرح قلب کے امراض کا معالجہ بھی دواؤں کے استعمال ہی سے ممکن ہے۔ جس طرح حصولِ صحتِ جسمانی میں دواؤں کی تاثیر

کو عقلاء اپنی بضاعت عقل سے نہیں سمجھ سکتے بلکہ اس میں ان کو اطباء کی تقلید واجب ہے اسی طرح انبیاء نے امراضِ قلبی کے علاج کے لیے جو عبادتیں خاص حدو مقدار میں مقرر کی ہیں ان کی وجۂ تاثیر کا سمجھنا بھی عقلاء کی بضاعتِ عقل کے لیے ممکن نہیں، ان کو انبیاء کی تقلید واجب ہے۔ انبیاء نے ان خواص کو نورِ نبوت سے معلوم کیا ہے نہ کہ بضاعتِ عقل سے۔ نیز جس طرح دوائیں نوع اور مقدار سے مرکب ہوتی ہیں کہ ایک دوا دوسری دوا سے وزن و مقدار میں مضاعف استعمال کی جاتی ہے اور ان کی مقدار کا اختلاف حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اسی طرح عبادات بھی جو دوائیں ہیں امراضِ قلوب کی مختلف نوع و مقدار کے افعال سے مرکب ہوتی ہیں، مثلاً سجدہ رکوع سے دو چند ہوتا ہے، نماز فجر مقدار میں نماز عصر سے نصف ہوتی ہے! یہ مقداریں اسرار سے خالی نہیں اور یہ اسرار ان خواص میں سے ہیں جن سے نورِ نبوت کے سوا کسی اور کو آگاہی نہیں ہوتی! جو شخص طریق عقل سے ان امور کی حکمت کو جاننا چاہتا ہے یا ان کے متعلق یہ خیال کرتا ہے کہ یہ محض اتفاقی طور پر مذکور ہوئے ہیں اور ان میں کوئی ایسا راز نہیں جو بطریق خاصیت موجب حکم ہوا ہو، وہ نہایت احمق اور جاہل ہے!

غرض انبیاء امراضِ قلوب کے طبیب ہوتے ہیں جن کے احکام کی تعمیل شفائے قلبی کے طالبوں کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ شفائے بدنی کے جویا کے لیے امراضِ جسمانی کے طبیبوں کی ہدایتیں۔ اور عقل کا فائدہ صاف ظاہر ہے۔ اسی کے ذریعہ ہمیں اس نکتہ کا علم ہوتا ہے! وہ نبوت کی تصدیق کرتی ہے اور خود کو ان امور کے ادراک سے عاجز پاتی ہے جن کو نور نبوت روشن اور منکشف پاتا ہے! عقل ہمارا ہاتھ پکڑ کر اسی طرح نبوت کے حوالہ کر دیتی ہے جس طرح اندھوں کو راہبر اور متحیر مریضوں کو طبیبِ شفیق کے حوالہ کر دیا جاتا ہے۔ عقل کی رسائی اور اس کی پرواز بس یہیں تک ہے، اس سے آگے وہ قدم نہیں بڑھا سکتی! اب طبیب جو کچھ سمجھائے سمجھ لینا چاہیے، اور اس کی ہدایتوں پر کاربند ہونا چاہیے! اسی مفہوم کو حضرتِ اقبال نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا ہے:

Marfat.com

خرد سے راہرو روشن بصر ہے — خرد کیا ہے؟ چراغِ رہگزر ہے!

درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا — چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے؟ (بالِ جبریل)

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور — چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے (〃)

جب عقل جذبات اور شہوات کے اثر سے بہک کر نورِ نبوت کا انکار کرتی ہے اور خود غیب کے دائرہ میں قدم زن ہوتی ہے تو اب اس کے ارشاداتِ عالیہ کی قیمت "ان مستی کے انڈوں" سے بھی گری ہوئی ہوتی ہے جو کبھی کبھی مرغی بغیر مرغ کے دینے لگتی ہے اور اس قسم کی عقل والے کی باتیں سُن کر ہم کہہ اُٹھتے ہیں ع

ماکیاں کز زورِ مستی خایہ گیرد بے خروس

یہ ہیں غزالی کی یافت کے چند روشن پہلو! وقت کی تنگ دامانی ہمیں مزید تفصیل کی اجازت نہیں دیتی ورنہ

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی!

Marfat.com

تصحیحِ فکر[1]

اے برادر تو ہمیں اندیشۂ — مابقی اُستخوان و ریشۂ

گر گل است اندیشۂ تو گلشنی — ور بود خارے تو ہمہ گلخنی (رومیؒ)

افکار وخیالات ہی سے مقاصد وغایات کا تعین ہوتا ہے۔ مقاصد کردار، افعال واعمال میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، افعال ہی کی تکرار سے عادت قائم ہوتی ہے، عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت تشکیل پاتی ہے اور سیرت ہی ہماری قسمت کا تعین کرتی ہے، جیسی سیرت ویسی قسمت' لہٰذا جیسے خیالات ویسی کائنات۔ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ۔

یہ قانون' ذہن کے دائرہ میں وہی صداقت واہمیت رکھتا ہے جو قانونِ تجاذب' دائرہ' فطرت میں، قطعی ویقینی، جب سیرت اور قسمت کی تشکیل وتعین میں افکار وخیالات ہی کی کارفرمائی ہے تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لئے اپنے افکار وخیالات کی اصلاح اُس کا اپنا نہایت اہم فریضہ ہے۔ قوم سازی اور فرد کی رُوح کی تکمیل اصلاحِ خیال پر منحصر ہے۔ ع

یک تنقیۂ دماغ می باید کرد

مقاصد وغایات کا دائرہ' ذہنِ انسانی ہے، انسان کا کوئی فعل مصلحت وغایت سے خالی نہیں ہوتا، اب مقاصد کا تعین' غور وفکر، سوچ اور بچار پر منحصر ہے۔ فکر ہی کائنات کی سب سے زیادہ عظیم الشان قوت ہے، اور یہی اِن دنوں انسان میں سب سے زیادہ غیر تربیت یافتہ قوت ہے۔ اس کی تربیت ہی کے متعلق مجھے یہاں کچھ کہنا ہے۔

---

[1] یہ مقالہ "بزمِ فلسفہ" کی کرسی نشینی کے موقع پر سنایا گیا جو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے شعبۂ فلسفہ کی بزمِ مباحثہ ہے، اور "معارف" اپریل ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔

Marfat.com

فرض کیجئے کہ آپ کو ایک باغ لگانا ہے اس کے لئے آپ کو چند قوانین پر عمل کرنا ہوگا، جن کو باغبانی کے قوانین سے تعبیر کیا جاتا ہے، سب سے پہلی چیز تو یہ دریافت کرنی ہے کہ باغ لگایا کہاں جائے، پھر اس جگہ کو مسطح اور خس و خاشاک سے پاک کرنا ہوگا، یہ چیز سب سے زیادہ اہم ہے، پھر ہمیں پھولوں یا ترکاریوں کے بیج کا انتخاب کرنا چاہیئے، اور اس عمدگی سے تیار کی ہوئی زمین میں انھیں بونا چاہیئے۔ ہمیں اس امر کا بھی خیال ہے کہ بیج عمدہ ہیں، ناقص نہیں، پھر موسم گرما میں ان بیجوں کو پانی دینا پڑتا ہے، تاکہ شدتِ تمازت انھیں جلا نہ ڈالے۔ اب ہمیں انتظار کرنا پڑتا ہے کہ وقتِ مقررہ گذر جائے اور بالآخر گل تر رونمائی کرے، اگر بے صبری سے ہم بیجوں کو کھود کر دیکھنا چاہیں کہ یہ جل تو نہیں گئے، تو پھر ان بیجوں کو نشو و نما کا موقع نہیں ملے گا۔ بعض دفعہ ہمیں کچھ زیادہ دن انتظار کرنا پڑتا ہے، لیکن اگر ہم نے زمین کو خس و خاشاک سے اچھی طرح پاک کیا ہے، بیجوں کے انتخاب میں غلطی نہیں کی، آبیاری کی ہے، تو ہمیں یقین ہے کہ ایک دن زندگی دامنِ زمین چیر کر پودوں کی شکل میں جلوہ افروز ہوگی، اسی زمانہ میں ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ باد و باراں، آفتاب و حرارت، بیجوں کے نشو و نما کے لئے ضروری ہے طوفان تک انھیں نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ عناصر ان کے دشمن نہیں، ساری کائنات اور کائنات کی ساری قوتیں ان کے ساتھ اشتراکِ عمل کر رہی ہیں!

فرض کرو کہ انتظار کی مدت بحمداللہ گذر گئی، باریک بیجوں نے خوش رنگ و دل فریب لالہ و یاسمن کی شکل اختیار کی، فطرت کا زبردست لیکن مانوس معجزہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش ہوا، شروع ہی سے ہم جانتے ہیں، اور یہ علم مرتبۂ یقین تک پہنچا ہے کہ جس پھول کا بیج ہم نے بویا ہے وہی پھول والا پودا رونما ہوتا ہے، اور ہزاروں باریکیوں کے ساتھ اپنے اندر ان تمام چیزوں کا اعادہ کرتا ہے جو اس پودے میں پائی جاتی ہیں جس کا یہ بیج ہے، کیا اس بیج کو اصلی پھول کی نہ بھولنے والی صورت یاد رہتی ہے؟

پھول کی غایتِ تخلیق سے تو ہم واقف نہیں، لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ ہمارے

Marfat.com

دل کا سُرور، آنکھوں کا نور ہے، کسی کے پاکیزہ الفاظ میں ہم اس کو "ربیعِ قلبی، نورِ بصری، جلاءِ حزنی، ذہابِ ہمّی" کہہ سکتے ہیں!

باغبانی کے یہ قواعد تو آپ سب جانتے ہی ہیں، کوئی بات نئی نہیں، لیکن میری دانست میں نئی بات جو آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ بالکل انہی قواعد و قوانین کے استعمال و پابندی سے آپ دُنیا کی تمام حسین و خوشگوار چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں، جو زندگی کے بیج میں مستور ہے، وہی ہم میں سے ہر ایک میں موجُود ہے، ان چیزوں کے حصُول کے لئے ہمیں زندگی کی ویسی ہی خدمت کرنی پڑتی ہے جیسی کہ ان پھولوں کے بیجوں کی ہم نے کی تھی۔

دلفریب پھولوں کے لئے آپ نے خارج (عالمِ اکبر) میں باغ لگایا تھا، شادمانی و مسرت کے حصول کے لئے، آپ کو باطن (عالمِ اصغر) میں باغ کے لئے زمین تیار کرنی ہے، شاید آپ کو علم نہیں کہ اس کا محلِّ وقوع ٹھیک کہاں ہے؟ یہ باغ آپ کو اپنے "میدانِ فکر" میں لگانا ہے، کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے ہاں ایک عظیم الشان میدانِ فکر موجود ہے جس کی وُسعت کو ارض و سما نہیں پا سکتے، صرف ہمارا دل ہی اس کو سما سکتا ہے، افسوس ہے کہ یہ میدان خس و خاشاک سے پٹا پڑا ہے، بہ جانتے ہو کہ یہ خس و خاشاک کیا ہے؟ وہی سلبی افکار و خیالات جن کو مختصر طور پر شر انگیز، بد، غلط خیالات کہنا کافی ہوگا، واقفانِ راز کا اصرار ہے کہ یہی ہمارے تمام مصائب و آفات کا سرچشمہ ہیں، ان سے ذہن و قلب کو پاک و صاف کرنا چاہیئے۔ اس راز کو سمجھنے کے لئے اس نفسیاتی قانون پر غور کرو، جس کا ہم نے ابتداہی میں ذکر کیا ہے، افکار و خیالات ہی سے ہم زندگی کے مقاصد کا تعین کرتے ہیں، اب یہ مقاصد ہی محرک بن کر ہمیں عمل پر آمادہ کرتے ہیں، اعمال کی تکرار عاداتِ راسخہ کے قیام کا باعث ہوتی ہے، اور سیرت سوائے اِن عاداتِ راسخہ کے منظّم مجموعہ کے کوئی اور چیز نہیں، اور ہماری سیرت ہی ہماری قسمت کا دُوسرا نام ہے! سلبی خیالاتِ فاسد، مقاصد کا

Marfat.com

تعین کرتے ہیں، انہی سے تو شر کا صدور ہوتا ہے، شر کا ارتکاب، عادت بن کر سیرتِ بد کی تشکیل کرتا ہے، اب میکانکی طور پر بغیر غور و فکر کے شر ہی کا صدور ہونے لگتا ہے، اور شر کے نتائج و ثمرات سے ہم سب واقف ہیں، درد و رنج، غم و الم، حزن و یاس۔

میدانِ فکر کا سلبی خیالات کے خس و خاشاک سے پاک ہونا ضروری ہے، اور نیک خیالات کی تخم ریزی لازمی۔ سلبی خیالات کو دور کرنے کا طریقہ ان سے جنگ کرنا نہیں، ان کا زور مردافگن ہوتا ہے، جب ہم ان سے مقابلہ کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہماری ساری توجہ ان ہی کی طرف لگی ہوتی ہے، آبِ حیات (یا چشمۂ حیات) کا بہاؤ توجہ کی طرف ہوتا ہے، بالفاظِ دیگر، اگر ہم کسی گناہ یا شر کی جانب توجہ کریں، اس کے استیصال کی خاطر سہی، تو زندگی کی تمام قوتیں اس کی جانب رخ کرتی ہیں، اس طرح اس کی طاقت میں اور اضافہ ہوتا ہے، مثلاً اگر ہمیں بے خوابی کا مرض ہے، تو ہم جس قدر اس کے متعلق فکر کریں گے اور اس کو دور کرنا چاہیں گے، بالفاظِ دیگر اس کا مقابلہ کریں گے، اسی قدر یہ تکلیف زیادہ ہوتی جائے گی، اس کے برخلاف اگر ہم اس کو بھول جائیں تو ہم ٹھنڈی نیند سو جائیں گے، اسی طرح شر کے مقابلہ سے اس کی طرف توجہ ہوتی ہے، اور توجہ سے اس کی قوت میں اضافہ ہوتا ہے۔

شر کا مقابلہ خیر سے کرنا چاہیئے، ظلمت کا مقابلہ نور سے۔ ظلمت کو دور کرنا ہو تو نور کو داخل کرنا چاہیئے۔ ظلمت کا مقابلہ ظلمت سے کرنا "ظلمات فوق ظلمات" کا مصداق بنتا ہے۔[1] اگر تمہیں نفرت کو دور کرنا ہو تو محبت کا تصور کرو، خوف کو دور کرنا ہو تو شجاعت و ہمت پر نظر جماؤ۔ خود غرضی کے بجائے ایثارِ نفس کا خیال رکھو، اسی طرح تمہیں غصہ کے بجائے حلم، بیماری کے بجائے صحت، کج خلقی کے بجائے خوش خلقی، شکایت کے بجائے صبر و شکر، خلق کی جبہ سائی

[1] احادیث میں خطرات و وساوس کو دور کرنے کے لئے بعض اذکار یا مطلق ذکر کی ترغیب دی گئی ہے۔ اوپر جو علاج پیش کر رہے ہیں اس کا استنباط ان ہی احادیث سے کیا گیا ہے، جو عجیب الاثر نفسیاتی طریقہ ہے۔

Marfat.com

کے بجائے رازقِ مطلق کا خیال اپنے ذہن میں جمانا چاہیئے، تمہارا معروضِ فکر جو ہوگا، رفتہ رفتہ وہی تم بھی بن جاؤ گے، یہی معنی ہیں جامی سامیؒ کے اِس قولِ بلیغ کے ؎

گر در دلِ تو گُل گذرد گُل باشی
ور بُلبلِ بے قرار بُلبل باشی

تو جزوی و حق کل است گر روزے چند
اندیشۂ کُل پیشہ کُنی کُل باشی

اس فکر کے ایک دُوسرے اعتبار پر غور کرو، دُنیا میں وہی چیز بُری ہے جس کو ہم بُرا سمجھتے ہیں، اگر ہم اس کو بُرا نہ سمجھیں تو ممکن ہے کہ وُہ ہمارے جسم کو آزار پہنچائے، لیکن وہ ہمارے قلب کو چھُو نہیں سکتی، یاد رکھو دُنیا میں ہر چیز کی قیمت رائے پر منحصر ہے، اور رائے تمہارے اختیار میں ہے، جب چاہو رائے کو ترک کردو، پھر اس ملاّح کی طرح جس نے اپنے جہاز کو سمندری پہاڑیوں سے بچا نکالا ہو تمہیں ہر طرف سکون نظر آئے گا۔ اگر تم اپنی رائے کو ترک کردو، تو پھر یہ شکایت باقی نہ رہے گی، کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا، اس شکایت کو ترک کردو کہ ہائے مجھے نقصان پہنچا تو نقصان خود باقی نہ رہے گا، اِسی لئے کہا گیا ہے کہ "عقلمند آدمی کی خوش قسمتی یہ ہے کہ وُہ کسی خوش قسمتی کا محتاج نہیں"۔

خیالات کا ماحول پر اثر نا قابلِ انکار ہے، خیالات کی پختگی اور قوتِ انسان کی رُوح کو سخت جسمانی تکلیف میں بھی مطمئن اور قوی رکھ سکتی ہے، ارادہ نتیجہ ہے توجہّ کا یعنی خیال و فکر کا، جن خیالات کا اظہار انسان عمل میں کرنا چاہتا ہے، اُن ہی پر توجہّ کو مرکوز کرتا ہے، ان ہی کو ذہن میں دُہراتا ہے، اُلٹتا پلٹتا ہے، ان ہی سے اس کے ذہن کی فضا مملُو ہوتی ہے اور یہی خیالات عالمِ آثار میں عمل کی صُورت اختیار کرتے ہیں، خیال حقیقت ہے عمل اس کا ظہور ہے۔ دکیم جیمس نے سچ کہا ہے "زندگی کا ڈرامہ ایک ذہنی ڈرامہ ہے، ساری مشکل ذہنی مشکل ہے"۔

میدانِ فکر کو خس و خاشاک سے پاک کرکے نیک خیالات کی تخم ریزی کرو۔ باغ کے بیجوں کی طرح خیالات کے انتخاب میں بھی حزم و احتیاط ضروری ہے، اور جس طرح بیج کو پودے کی

Marfat.com

شکل میں نمایاں ہوتے کچھ عرصہ لگا تھا، اور تمہیں انتظار کرنا پڑا تھا اسی طرح خیالات کو قلب میں تغیر پیدا کرنے اور ہر نیک عمل میں ظاہر ہوتے دیر لگتی ہے، تمہیں پست ہمت نہ ہونا چاہیئے اور نہ رنجیدہ۔ اگر تم نے اپنا کام قاعدے کے موافق کیا ہے، خس و خاشاک کو صاف کیا ہے، نیک خیالات کے بونے میں احتیاط برتی ہے، تو شادمانی، مسرت، طمانیت دبردِ قلبی، سرور و کیف وہ گلہائے شاداب ہیں جو نتیجہ کے طور پر تمہیں حاصل ہوں گے۔

ان حقائق سے واقف ہونے کی وجہ سے عقلمند جانتا ہے، کہ دُنیا میں اس کا کوئی دشمن ہے تو خود اس کا نفس ہے، أَعْدَىٰ عَدُوِّكَ نَفْسُكَ الَّتِي بَيْنَ جَنْبَيْكَ (البیہقی من حدیث ابن عباسؓ) اس لئے نہ وہ کسی پر ملامت کرتا ہے اور نہ کسی کی مذمت، بردِ قلبی کے ساتھ محاسبۂ نفس کرتا ہے، صبر و سکون کے ساتھ اپنا اخلاقی فرض ادا کرتا ہے، صرف یہی نہیں کرتا بلکہ کسی مزید مرض میں مبتلا ہونے سے پرہیز کرتا ہے، وہ اپنے خیالات پر نظر رکھتا ہے، قلب کا دربان بن جاتا ہے، بد یا سلبی خیال کو داخل ہونے نہیں دیتا، داخل ہو جائے تو فوراً نیک یا ایجابی خیال کو اس کی جگہ لے آتا ہے، اپنے افعال کو بے عیب بناتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حال، نتیجہ ہے ماضی کا، قسمت، نتیجہ ہے خیالات کا!

کامل گوید جہان تمام و اہل است ناقص گوید کہ کوتہ است و سہل است

شطرنج ہماں عرصہ ہماں رخت ہماں ایں بردن و باختن ز علم جہل است

(سحابی استرآبادی)

Marfat.com

احساس

جانا بقمار خانہ رندے چند اند / با مردم کم عیار کم پیوندند
رندے چند اند کس نداند چند اند / بر نسیہ و نقد ہر دو عالم خندند

(محمود)

اس صداقت سے انکار مشکل ہے کہ 'احساس' فکر سے زیادہ عظیم قوت ہے! جب حالتِ اضطراب میں ہم دعا کے لئے ہاتھ اُٹھاتے ہیں، تو دُعا کے الفاظ (افکار) نہیں، بلکہ وہ شدید احساس جو اُن افکار کے پیچھے ہوتا ہے، زندگی میں تغیّر پیدا کرتا ہے! اُن جذبات و احساسات ہی کی قوت کے بل پر ہم چیخ اُٹھتے ہیں۔

کونین را چو نعلین انداختیم و رفتیم!
دیوانگانِ شاہیم رِندِ برہنہ پائیم!

افکار کے ساتھ جب تک جذبہ و احساس کی آمیزش نہیں ہوتی، افکار و تعقّلات میں قوت نہیں پیدا ہوتی، وہ بے جان ہوتے ہیں! ان میں گرمی ان ہی جذبات کی 'آتشِ درونی' سے پیدا ہوتی ہے! مجھے اس صداقت کا احساس ابتدا میں ایک بیوہ سے گفتگو میں ہوا۔ اس نے مجھ سے کہا "باوجود بے سروسامانی کے میں کبھی فقر و قلت میں مبتلا نہیں ہوئی" اور اس کی وجہ اس نے یہی بتلائی کہ وہ ہمیشہ یہی محسوس کرتی تھی، کہ وہ غنی ہے! یعنی اس کا ہمیشہ یہ یقین رہا، کہ "حق تعالےٰ کے ہوتے ہوئے کیا غم کیا کم!" ایک غنیِ مطلق کی معیت کا اِدراک اُس کے قلب کو غنا و بے نیازی سے بھر چکا تھا۔ اور اسی احساس نے فقر و اِقلال کو

Marfat.com

اس سے دُور رکھا تھا!

حضرت بلال رضؓ سے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:۔

لَا تَخْشَ مِنْ ذِی الْعَرْشِ اِقْلَالًا

یعنی خدائے قدیر سے قلت و فقر کے بارے میں ڈرو مت! اگر ہم اس علمِ صحیح کے بعد، قلب سے خوف کو دُور کرلیں اور خود کو غنی محسوس کرنے لگیں تو ہماری تمام ضروریات پوری ہوتی رہتی ہیں اور اِتنا بچ رہتا ہے، کہ ہم اِنفاق بھی کرسکتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر ہمارے قلب میں فقر کا خوف جاگزیں ہوجائے، تو پھر ہر اچھی چیز ہم سے بھاگنے لگتی ہے! گُلِ تر بھی خارِ خشک ہوجاتا ہے۔

یہی حال صحت کا بھی ہے۔ باوجود بیمار ہونے کے اگر ہم خود کو تندرست محسوس کریں، باطنی طور پر، تو بہت جلد ہم تندرست ہوجاتے ہیں! باوجود بیمار ہونے کے تندرست کس طرح محسوس کریں؟ جواب یہ ہے کہ اگر ہم واقعی بیمار ہیں اور صحت قطعاً ٹوٹ گئی ہے تو ہمیں آرام لینا چاہیئے اور دُوسروں کو اجازت دینی چاہیئے کہ ہمارا علاج کریں، لیکن اگر ہماری صحت محض خراب ہے تو تندرست محسوس کرنا تندرست ہونے کی حتمی تدبیر ہے! یہاں بھی یہ احساس کہ حق تعالےٰ "قوی" ہیں اور "سلام" ہیں اور وہ ہمارے ساتھ ہیں، قریب ہیں، اقرب ہیں، محیط ہیں، ہمارے ظاہر و باطن، اوّل و آخر ہیں، ہمارے جسم و جان کو صحیح و تندرست رکھنے کے لئے کافی ہے، لیکن محض جاننا کافی نہیں، اس کا تحقّق ضروری ہے۔ وہ احساس اور وجدان کی چیز ہے۔

تعقّل علیحدہ چیز ہے اور وجدانِ قلب علیحدہ۔ تعقّل یا عقلی علم "عقیلہ" ہے۔ روک ہے، مانع و حائل ہے، اسی لئے عرفانِ حق کے لئے ہمیں محض عقلی علم کو ترک

کرنا پڑتا ہے۔ جب یہ علم ترک کر دیا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا آخری نشان بھی باقی نہیں رہتا اور اس کی کامل نفی ہو جاتی ہے تو ہمیں سب کچھ مل جاتا ہے اور ہم چیخ اٹھتے ہیں:

ازکنارِ خویش یابم ہر دمے من بوئے یار
چوں نہ گیرم خویشتن را ہر شبے اندر کنار

(رومی)

صداقتِ مطلقہ کی یافت اُس وقت ہوتی ہے جب ہم تعقّل کی سرحد عبور کر جاتے ہیں۔ جب ہم علمِ اکتسابی سے دست بردار ہو جاتے ہیں تو ہمیں وہ دولت مل جاتی ہے جو ہمیشہ سے ہم ہی میں موجود تھی! جب ہم 'فکر' چھوڑ دیتے ہیں تو ہم 'تسکینیّت' کے سمندر میں تیرنے لگتے ہیں۔ حضور و شہودِ حق، وجداناً واحساناً نصیبِ جان ہو جاتا ہے! دولتِ قرب و وصال ہمیں حاصل ہو جاتی ہے۔

موج دریائے ہوس اینجا غبارِ سینہ است
گر شود ایں آب ساکن تختۂ آئینہ است

(درد)

تعقّل و تفکّر کے ذریعہ حق تعالیٰ کو پانے کی جب تک کوشش کی جاتی ہے، وجدانِ قلبی پر ایک غلاف "شدید و غلیظ" پڑ جاتا ہے، یہ علم کا "حجابِ اکبر" ہے، یہ حق کی یافت میں سب سے بڑا حجاب ہے۔ جب ہم قلب کی سمت کو حق کی طرف کر دیتے ہیں، تو حجاب اُٹھ جاتا ہے۔ "آگاہی و حضور" باطنِ قلب کی اسی کشش و نگرانی کا نام ہے جو ذوق و شوق، سرور و انشراح، جذب و مستی سے معمور ہوتا ہے! باطن کی یہی حالت فیض بے کیف بلا مزاحمتِ خطراتِ غیر و خیالاتِ ماسویٰ بلکہ بلا امتیازِ اعتباراتِ صفاتیہ و اسمائیہ، وہ مقام ہے جس کی بشارت "الذین یومنون بالغیب" سے دی گئی ہے جس کو

Marfat.com

متاخرین سلسلۂ نقشبندیہ نے "کمالاتِ نبوت" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے!

اب ہمیں کُل میں اپنا صحیح مقام معلوم ہو جاتا ہے! سیاراتِ سماوی کی طرح ہم اپنے محور پر گردش کرنے لگتے ہیں، کامل توازن و توافق کے ساتھ! ہماری زندگی بے ساختہ و بے تکلف ہو جاتی ہے جس میں ہر چیز اپنے صحیح وقت پر اور صحیح طریقہ پر وقوع پذیر ہوتی ہے۔ ہمیں کامل سکینت و طمانیت نصیب ہوتی ہے اور ہمیں "فی جَنبِ اللّٰہِ" ہونے کا احساس ہونے لگتا ہے، ذاتِ قیوم کا آسرا مل جاتا ہے اور ہم ساکن ہو جاتے ہیں یا رحمتِ حق کے سمندر میں تیرنے لگتے ہیں اور ہر جانب "وجہ اللّٰہ" کا شہود ہونے لگتا ہے! ہر شئے کو اپنے صحیح مقام پر ہر واقعہ کو اپنے صحیح وقت پر وقوع پذیر ہوتا پاتے ہیں۔

اس دولت کا حصول تعقل یا تفکر سے ممکن نہیں، یہ ادرائے طورِ عقل ہے، عقل شاید درِ حق تک رہبری کر سکتی ہے، اس کے بعد ہمیں وجدان و احساس کی مدد سے آگے قدم بڑھانا پڑتا ہے۔ قرب و وصال کی نعمت کا اندازہ فکر و تعقل کے ذریعہ ممکن نہیں یہ صرف احساس و وجدان سے کیا جا سکتا ہے۔ مَنْ ذَاقَ وَجَدَ، جس نے چکھا پایا اسی کی پرورش ضروری ہے، جو تعقل و استدلال سے بالکل مختلف چیز ہے۔

جوں جوں اس راہ میں قدم آگے بڑھتے جاتے ہیں، صداقت سادہ معلوم ہونے لگتی ہے! حق تعالیٰ کے عرفان کے لئے ہمیں زیادہ تر اس علم نظری کو ترک کرنا پڑتا ہے جو ہم نے ان کے متعلق حاصل کیا تھا، یہاں تک کہ ہر عقلی علم کی نفی ہو جائے۔ جب اس طرح ہر شئے کی نفی ہو جاتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمیں سب کچھ مل گیا! جوہر جاں نذر کر کے ہم جاناں کو پاتے ہیں! ؏

لعل تو چوں حاصل است جوہر جاں گو مباش

عقل کے بتلائے ہوئے وہ تمام پیچیدہ نظریات، رموز و اسرار جو ہم نے سیکھے تھے سب

"گو مباش" کے حکم میں آجاتے ہیں، جب ہمیں حق کا عرفان حاصل ہو جاتا ہے تو پھر حق کے متعلق سارے نظریوں کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی! اب جس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے وہ صرف حضور و شہودِ حق ہے! اسی "نسبتِ باطن" کی تقویت ہے! "حضور و شہودِ ذاتِ حق علی الدوام بلا ملاحظہ اعتبارے از اعتباراتِ گرنیۂ و مسرور و ملتذ بودنِ باطن بہ اس حالت و جذب و کشیدگیٔ دائمی الی اللہ علیٰ نہج مجہول الکیفیت" اس طرح کائنات کی قدیم گتھی حل ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ کی ذات سے توصّلِ تام حاصل ہو جاتا ہے۔ نظری و عقلی طور پر نہیں بلکہ عملی و ذاتی تجربہ کی بنا پر!

ہر روز ہم اس "مراقبہ" کے لئے وقت نکال سکتے ہیں! ہم خدا کی عقلی تعریف کرنے کی کوشش نہیں کرتے، کیونکہ خدا تمام تعریفات سے ماوراء ہے۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ ہم خدا کو عقل سے جاننے کی خواہش نہیں کرتے، ہم قلب کی گہرائیوں میں اس کو پاتے ہیں یا انفس کی گہرائیوں میں اس کی سکینت کا احساس کرتے ہیں! جب ہم مراقب ہوتے ہیں تو حق تعالیٰ کو ہم اپنے پاس ہی پاتے ہیں۔ اِنَّہٗ سُبْحَانَہٗ تَعَالٰی ھُوَ الْاَقْرَبُ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ فِی الْوُجُوْدِ کَذٰلِکَ فِی الْوِجْدَانِ۔

تجدنی فی سواد اللیل عبدی
قریباً منک فاطلبنی تجدنی

"رات کی تاریکی میں اے بندے تو مجھے اپنے قریب پائے گا، مجھے ڈھونڈ مجھے پائے گا ضرور!"

مرا اندر شبِ تاریک یابی
ز جانِ خویش ہم نزدیک یابی
مرا نزدیکِ خود پیوستہ می داں
نمی دانی دگر دانی بیابی

Marfat.com

یا پھر جب ہم "مراقبہ" میں خاموش بیٹھتے ہیں۔۔۔ خاموش، اشخاص و تعینات سے نظرِ قلب کو ہٹا کر ماسوئی سے قلب کا تخلیہ کر کے، حق سبحانہ تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہِ بے جہت لگا کر، تو ہمیں "توحیدِ محمدی" و توحیدِ مطلق کی حالت نصیب ہوتی ہے اور مبدأ فیاض سے فیوض و برکات کی بارش ہونے لگتی ہے! ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہمارا مادی جسم تحلیل ہو رہا ہے، اور ہم رُوح مجرّد بن رہے ہیں! تمام مذاہبِ حقہ کا یہی مقصود ہے۔ مادہ سے رُوح کی طرف عروج، زمانی و حادث سے سرمدی ولا زمانی کی طرف صعود! اسم۔ رسم سے گذر کر، نام و نشان سے چھوٹ کر قبلہ توجہ تنزیہِ مُطلق و غیب صرف کو قرار دینا عُلوِ ہمت اسی کا نام ہے اور بلند ہمتی حق تعالےٰ کی نظر میں محبوب ہے اِنَّ اللهَ یُحِبُّ مَعَالِیَ الْھِمَم! کیا خوب کہا ہے کسی نے:

آں لقمہ کہ در دہاں نہ گنجد طلبم

کیونکہ مقصود 'وصول' ہے نہ کہ 'حصول'، اور مطلوب 'قرب' ہے نہ کہ 'ادراک'

"رفتم تا بدایں عنقا بدامم
تنید نہائے دامش را غلامم
کسے را گرچہ برگِ ایں سفر نیست
بہ از سودائے او چیزے دگر نیست

دونوں صورتوں میں، خواہ ہم وصول کے قائل ہوں یا حصول کے، قرب کے قائل ہوں یا ادراک کے۔ اکابر وجودیہ کے پیرو ہوں یا اکابر شہودیہ کے، صورتِ حال، ما ورائے طورِ عقل ہے، وجدان قلبی کے دائرہ کی چیز ہے اور ہر وقت قلب کا نیاز و شکستگی کے ساتھ ذاتِ الٰہی کی طرف متوجہ رہنا ضروری ہے۔ یہاں تک کہ توجہ الی اللہ بے مزاحمتِ خواطر ملکہ بن جائے اور یہی صوفیہ کی اصطلاح میں "حضور" کہلاتا

Marfat.com

ہے، ذکر کا مقصود یہی حضور ہے!

زندگی کا اصل مجاہدہ یا "کوشش" یہی ہے "اس کے ساتھ "کشش" کی امید لگی رہے!

درِ کریم سے مایوس کون پلٹتا ہے۔

عاشق کہ شد یار بحالش نظر نہ کرد

اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

طالب کا کام ادائے فرائض و سنن ہو کہ وہ کے بعد ذکر و مراقبہ کے سوا کچھ نہیں یہاں تک کہ حضور کا بلکہ حاصل ہو جائے اور اس کے نتیجہ کے طور پر "فنائے نفس" اور تہذیب اخلاق سے وہ مشرف ہو جاتا ہے اور "اخلاق اللہ" سے تخلق!

"فنائے نفس" اصطلاح سلوک ہے جس کا مفہوم "حالتِ اطمینان" ہے ورنہ نفسِ ناطقہ ہرگز فنا نہیں ہو سکتا، شریعت کی اصطلاح میں یہی حالت "اطمینانِ نفس" کہلاتی ہے اور "نفسِ مطمئنہ" اپنے رب سے راضی و مرضی ہوتا ہے، وہی عبدِ کامل ہے اور دخولِ جنت کی اسی کو بشارت دی گئی۔

یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ (عم، ع ۱۴)

"اے نفسِ مطمئنہ اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر تو میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔"

خوب سمجھ لو، کہ تمام سیر و سلوک، کا حاصل، زندگی کا مقصود ما سوی اللہ کی گرفتاری سے دل کا آزاد ہو جانا ہے، دوام حضور و شہود کا میسر ہونا ہے، تاکہ اس کے نتیجہ کے طور پر صبر بربلا، رضا بقضا، تحمل مکروہات کی قوت قلب کو حاصل ہو جائے اور مشتہیات نفسیہ سے وہ رک جائے۔ جب یہ دولت حاصل ہو جائے تو سمجھ لینا چاہیے، کہ تمام مقامات و مراتب

Marfat.com

حاصل ہو گئے۔ اب ہم اپنی زندگی طمانیت و سکینت سے بسر کرتے ہیں اور کہتے ہیں :

جدائی مبادا مرا از خدا

دگر ہر چہ پیش آیدم شائدم

(پہلوان محمود)

Marfat.com

قانونِ تجاذب

اور تعمیرِ سیرت

بدی کنی و نیک طمع می داری — ہم بد باشد سزائے بد کرداری
باآنکہ خداوند کریم است و رحیم — گندم ندہد بار چو جو می کاری (رومی)

قانونِ تجاذب (LAW OF ATTRACTION) ذہنی یا روحانی زندگی کا ایک ضروری کلی اور عالمگیر قانون ہے، نہ اس کی ضد قابلِ تصور ہے اور نہ اس کا کوئی استثنار ہے۔ کون شبہہ کر سکتا ہے کہ جن طبائع میں مماثلت پائی جاتی ہے وہ ایک انجذابی قوت کے زیرِ اثر ایک دوسرے پر غیر شعوری طور پر مائل ہوتی ہیں اسی لیے تو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کی سیرت کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو دیکھو اس کی صحبت کیسی ہے، قانون کی صداقت کا تو ہر کوئی قائل ہے لیکن ہمیں یہاں اس کے بعض تضمنات کو ذرا کھول کر بیان کرنا ہے۔

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی

فکر کی دنیا میں اس قانون کی سرگرمی پر غور کرو! ایجابی اور نیک خیالات مماثل خیالات کو اپنی طرف جذب کرتے ہیں اور ان کے درمیان ائتلاف یا وابستگی ہوتی ہے، اسی طرح بد، سلبی اور شر انگیز افکار باہم وابستہ ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو پیدا کرتے ہیں، اپنی طرف کھینچتے ہیں، قوت پہنچاتے ہیں، تمہارے ذہن میں ایک خیال آتا ہے، اب اس کو تھوڑی دیر روکے رکھو، اس پر تخیل کی تعمیری قوتوں کو مرکوز کرو، مماثل خیالات کا ظہور شروع ہو جائیگا۔ رفتہ رفتہ ان میں زیادتی ہو جائیگی اور بالآخر ان کا ہجوم ہونے لگیگا اور تمہارے ذہن کی فضا

Marfat.com

ان سے مملو ہو جائیگی، جن لوگوں نے اپنے ذہن کی تربیت میں کوشش کی ہے اور اپنے افکار وخیالات پر قابو پیدا کر لیا ہے وہ اس قانون کو تعمیری طریقہ سے استعمال کرتے ہیں اور دنیا سے اپنی قوتِ فکری کا لوہا منواتے ہیں!

دیکھو مصنف کسی خاص موضوع پر قلم اُٹھانا چاہتا ہے، ایک مرکزی خیال اس کے قلب پر چھایا ہوا ہے، وہ رات دن اسی میں غرق ہوتا ہے، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے اس کا ذہن اسی میں مصروف ہوتا ہے، ناگہاں افکار و تصورات کا تسلسل شروع ہو جاتا ہے، اور نامعلوم و ناقابل علم منبع سے خیالات کا چشمہ اُبلنے لگتا ہے اور جب تک یہ حالت نہ ہو مصنف لکھنے کی کوشش نہیں کرتا!

اسی طرح مقرر اپنی تقریر کی تیاری کے لیے اپنے موضوع پر ذہن کی سرچ لائٹ ڈالتا ہے، انہماک کے ساتھ اس پر غور کرتا ہے، قانونِ تجاذب کا غیر مرئی عمل مماثل تصورات کا ذخیرہ بہت جلد فراہم کر دیتا ہے، ان میں ترتیب بھی پیدا ہو جاتی ہے اور نظام بھی، یہ سب مبدءِ نامعلوم سے پیدا ہوتے ہیں، اور مقرر کا ذہن ان کی قیام گاہ ہوتا ہے! یاد رکھو کہ مفکر تصورات کا خالق نہیں حامل ہوتا ہے وہ تصورات کو پیدا نہیں کرتا، وہ محض قانون کی پیروی کرتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر اس کو خیالات و افکار کا تحفہ عطا کیا جاتا ہے، یہ عطا ہر شخص کی استعداد کے مطابق ہوتی ہے۔

قانون کے تضمن و تعبیر سے واقف ہونے کے بعد حصولِ مسرت اور تزکیۂ نفس یا سیرت سازی کی خاطر اس کا استعمال کرو، اس کی توضیح میں ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن ہم دو ایک مثالوں پر یہاں اکتفا کرینگے۔ فرض کرو کہ بیماری کا وہم تمہارے دل میں پیدا ہوا، اب بجائے اس کے کہ تم اس کو قبول کر لو اور اس کے متعلق فکر کرنے لگو، اور ذہن کو مماثل وسوسوں اور وہموں کا آماج گاہ بنا لو تمہیں چاہیے کہ اس وہم کی نفی کرو اور وہ اس طرح کہ مبدءِ علم کی طرف فوراً متوجہ ہو جاؤ، یعنی حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرو اور آہستگی سے لیکن

Marfat.com

پورے اعتماد و اذعان کے ساتھ کہو،

حَصَّنْتُ نَفْسِیْ بِالْحَیِّ الْقَیُّوْمِ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ اَبَدًا وَّ دَفَعْتُ عَنْهَا السُّوْءَ بِالْفِ الْفِ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ[1]

یا یوں کہو "میں حق تعالیٰ کی حفاظت میں ہوں اور تمام بیماریوں اور آفتوں سے محفوظ و مامون" ان الفاظ کو پکار کر کہنے کی ضرورت نہیں محض ذہنی طور پر یہ کہے جاسکتے ہیں جو شخص اس طرح سلبی خیالات کو ذہن میں اُترنے اور اپنی جگہ بنانے سے روکتا ہے، اور قانونِ تجاذب کو اجازت نہیں دیتا کہ اپنے عمل سے ان سلبی، فاسد اور تباہ کن تصورات کی تعداد میں اضافہ کرے اور قلب کو خوف وہراس سے بھر دے، بلکہ اس کے برخلاف اپنی حقیقت کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے اور وہاں سے ایجابی اور قوت بخش تصورات کو اخذ کرتا ہے جو قانونِ تجاذب کے عمل سے ہر آن زیادہ ہوتے جاتے ہیں، ہر دم نئی طاقت حاصل کرتے جاتے ہیں، قلب کو قوی کرتے ہیں، سیرت کی تعمیر کرتے ہیں، اور وفورِ قوت کی وجہ سے عمل میں نمایاں ہوتے ہیں، صحت کو درست کرتے ہیں، ماحول کو خوش گوار طریقہ سے بدل دیتے ہیں، موافقِ مرام نتائج پیدا کرتے ہیں اور اس طرح قسمت ہی کو بدل دیتے ہیں، یاد رکھو بیماری کی اصلی علت ذہنی ہوتی ہے، کیونکہ اگر ہم جراثیم کے نظریے کو بھی مان لیں تو بھی یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جراثیم کا اثر اس قلب پر نہیں ہوتا جو ایجابی (POSITIVE) ہوتا ہے یعنی جو خود کو سلبی خیالات کا بازی گاہ نہیں بناتا جو ہر دم وساوس اور ہواجس کی نفی کرتا ہے، اور ان کی بجائے ایجابی اور حیات بخش اور نیک خیالات کا اثبات کرتا رہتا ہے اور ان کے مبدء یعنی اپنی حقیقت کو کسی آن فراموش نہیں کرتا، ایسا قلب بیماری کا آسانی کے ساتھ شکار کیسے ہو سکتا ہے؟ بیماری طبیعت کی

---

[1] میں نے اپنے نفس کو محفوظ کیا اُس ذات پاک کی مدد سے جو حی اور قیوم ہے اور جو کبھی نہیں مرتی اور اپنے نفس سے بُرائی کو دور کیا، اسی کی حول وقوت سے - یہ حدیث کے الفاظ ہیں، ضروری نہیں کہ ان ہی کا استعمال کیا جائے، ان کے بجائے کوئی اور موزوں الفاظ استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

Marfat.com

کمزوری سے پیدا ہوتی ہے، طبیعت اگر قوی ہو تو سرے سے بیماری کا وجود ہی ناممکن ہے، یہ کوئی ایجابی چیز نہیں بلکہ سلبی صفت ہے، قدرت کا نہ ہونا ہی عجز ہے، قوت کا نہ ہونا ہی بیماری ہے، سلبی خیالات منفی افکار قوت کو سلب کرتے ہیں، قلب کو کمزور کرتے ہیں، اعضا کو مضمحل کرتے ہیں، اعصاب میں تناؤ پیدا کرتے ہیں، اور اسی لیے ان کو ایجابی و ثبوتی تصورات سے بدل دینا چاہیے ایجابی افکار کا مبدء حق تعالیٰ ہیں، جوں ہی ہم نے ان کی طرف اپنا رخ کیا، گویا ہم ظلمت سے نکل کر روشنی میں آئے، اب روشنی کی کرنیں آہستہ آہستہ ہمارے جسم میں داخل ہوتی ہیں، ان سے مردہ اعصاب جاگ اٹھتے ہیں، مضمحل اعضا میں توانائی آتی ہے، قلب و جگر تازہ دم ہو جاتے ہیں، کھوئی ہوئی صحت پوری قوت کے ساتھ عود کر آتی ہے صحت کے حصول کے لیے اور اس کے قیام و بقا کے لیے اس قطعی وحتمی نسخے کو یاد رکھو اور ہمیشہ اس کو استعمال کرتے رہو۔

قانونِ تجاذب کے استعمال کی ایک اور مثال پر غور کرو، تم پر کسی نے زیادتی کی ہے تمہارے ساتھ غیر منصفانہ برتاؤ کیا گیا ہے، تمہیں غصہ آتا ہے، رنج ہوتا ہے، اضطراب ہوتا ہے، اور تم اس نقصان پر ذہن کی ساری قوتوں کو مرکوز کر دیتے ہو، نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے مماثل خیالات کا ہجوم قلب پر ہونے لگتا ہے، یہ تاریک، اندوہ خیز، زہریلے خیالات جو قانونِ تجاذب کے عمل سے پیدا ہو رہے ہیں اپنے منحوس سایہ سے تمہاری ذہنیت کو مسموم کر دیتے ہیں، تمہاری سیرت فنا ہو جاتی ہے، تمہاری صحت ٹوٹنے لگتی ہے، اور ممکن ہے کہ بالآخر تمہارا دماغ بھی متاثر ہو جائے اور اس میں فتور آنے لگے، آتشِ انتقام کا سوختہ فاتر دماغ اگر انتقام پر اتر آئے تو اس کے نتائج اور اثرات عموماً مسرت و طمانیتِ قلب کے لیے مفید نہیں ثابت ہوتے۔

مرغ پر نارستہ چوں پراں شود   لقمۂ ہر گربہ دراں شود (مثنوی)

اب اگر تم دَعْ اَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (پ ۲۲ ع ۳) پر عمل کرتے ہوئے اس کو معاف کیے دیتے ہو اور اپنے خیالات کی رو کو بدل دیتے ہو، سلبی خیالات کی بجائے ایجابی افکار کے قبول کرنے کے

ل چھوڑ دے ان کا ستانا اور بھروسہ کر اللہ پر۔

لیے تیار ہو جاتے ہو تو تمہیں ان تمام شر انگیز و فتنہ خیز نتائج سے نجات مل جاتی ہے، اور اب تجاذب کا قانون تمام اچھی چیزوں کے رُخ کو تمہاری طرف پھیر دیتا ہے، اب تم کو حقیقی معنی میں حریت نصیب ہوتی ہے، طمانیت حاصل ہوتی ہے، مسرت میسر ہوتی ہے، کیونکہ تم نے سینہ کو کینہ سے پاک کیا، غضب سے پاک کیا، ان منفی جذبات کے دور ہو جانے سے تمہارے قلب سے ظلمت دور ہوئی، نور کا دخول ہوا اور تمہاری ہستی کا ہر ذرہ اس نور سے جگمگا اٹھا، اسی لیے تو کسی عارف نے کہا ہے :-

عالم تمام یک گل بے خاری شود !   دل را اگر ز کینہ مصفا کند کسے

ہر فعل کا اثر، ہر حرکت کا ردِ عمل، ہر علت کا معلول قطعی ہوتا ہے، یہ قانون کلی اور ضروری ہے، اب کینہ و غضب کے جذبات کا لازمی و جبری نتیجہ غم و حزن کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اسی طرح عفو و احسان و رحمت، کرم، صبر و شکر کا قطعی و ضروری نتیجہ مسرت و طمانیت توافق و الفت، فلاح وغیرہ کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ! علیت کے اس کلی عالمگیر، وجوبی و لزومی قانون پر یقین ہو جائے تو اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَاءَ[1] والے حکم پر عمل کرتے ہوئے ہمیں کوئی تکلف نہیں ہوتا اور ہم اپنے اس عقیدہ کا اظہار کسی شاعر تمام المعرفت کے سریلے نغموں میں یوں کرتے ہیں :

ہر کسے در راہِ من خارے نہد من گل نہم !   او سزائے خار یابد من جزائے گل برم

یہ سن کر اور مان کر بھی تم ذرا جھلا کر کہتے ہو، کیا یہ میرے بس کی بات ہے، میں بہر حال بشر ہوں اور فطرۃً مائل بہ شر ہوں، فطرۃً ظلوم ہوں، جہول ہوں، ظلمت و جہل میری ماہیت میں داخل ہیں، ان صفاتِ عدمیہ کو مجھ سے دور کیسے کیا جا سکتا ہے، ان کی وجہ سے آفت و مصیبت میں مبتلا ہوتا رہتا ہوں لیکن سچ پوچھو تو حال یہ ہے ؎

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں   پھر وہی زندگی ہماری ہے ! (غالب)

---

[1] جس نے تمہارے ساتھ برائی کی ہے اس کے ساتھ بھلائی کرو۔

تم ایک حد تک ٹھیک کہتے ہو آؤ ہم تمہیں ایک نفسیاتی طریقہ بتلائیں جس کے استعمال سے تمہیں غایت کے حصول میں آسانی ہوگی۔

جس شخص سے تمہیں نقصان پہنچا ہے، اور جس کے خیال سے تمہارے بدن میں سوزش ہوتی ہے اور جس کو معاف کرنا تم ممکن نہیں سمجھتے اس کو معاف کرنے کے لیے تمہیں چاہیے کہ کچھ دن اس صداقت پر غور کرو۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (پ ۲۵ ع ۵)

اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے تو اللہ درگزر ہی کر دیتا ہے۔

نیز انما ھی اعمالکم ترد علیکم (الحدیث) یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں

ذرا سوچو اصل میں تمہارا کوئی دشمن نہیں سوائے تمہارے نفس کے یہ سب کچھ اسی کا کمایا ہوا ہے، اور اسی کے عین کا تقاضا یداک اوکتا وفوک نفخ[1]۔ دوسرے کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دینا تمہاری عقل کی کجی اور جذبات کی خامی کی دلیل ہے، جوں جوں تم اس صداقت پر غور کرتے جاؤ گے تم پر واقعات کھلتے جائینگے، اور ہر آفت، ہر مصیبت کی علت تم اپنی ہی کسی حماقت کو پاؤ گے! اگر سلسلۂ تفکر کو چند روز جاری رکھو گے تو حقیقت اس قدر مُبرہن ہو جائیگی کہ بے اختیار چیخ اٹھو گے کہ غلطی میری تھی کسی دوسرے کی نہیں اور حق تعالیٰ کی طرف ظلم کی نسبت تو کسی طرح نہیں کی جاسکتی۔ اِنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ[2]

ہر چہ ہست از قامتِ ناسازِ بے اندامِ ماست ورنہ تشریفِ تو بر بالائے کس کوتاہ نیست

اس اصول کی صداقت کے وجدان میں کھل جانے کے بعد تم اپنے دشمن کو بھی معاف کرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔

---

[1] تیرے ہاتھوں نے کمایا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے۔

[2] بیشک اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں۔

اگر تم جذباتی انسان ہو عقل سے کافی حصہ تمہیں نہیں ملا ہے اور مذکورہ بالا اصول تمہاری سمجھ میں کسی طرح نہیں آتا تو تمہیں یہ دوسرا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے :۔

جس شخص کو تمہیں معاف کرنا ہے اس کی شبیہ اپنے تخیل کی مدد سے اپنی نظروں کے سامنے لے آؤ اور اب اس کو مخاطب کر کے کہو "میں تمہیں (نام شخص) حسبۃً للہ پوری طرح معاف کرتا ہوں، دعا کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ تمہیں اپنی نعمتوں سے سرفراز کریں اور تمہیں نورانی کر دیں، آمین"

اگر تم یہ عمل چند روز مسلسل و خلوص دل کے ساتھ کرتے رہو تو کچھ دن میں تمہیں یہ معلوم کر کے تعجب ہو گا کہ تمہارے لیے اس شخص کو معاف کر دینا زیادہ مشکل تو ہیں، اپنے اس مجاہدے سے اگر تم نے حسنِ خُلق حاصل کر لیا کہ خلق کی طرف سے جفا کے باوجود ان سے وفا کی، رحمت و شفقت کو اپنا شعار بنایا، اور ان کے لیے بخشش و عفو کی دعا کی، تو اب حقیقی مسرت، طمانیت، سکون، برد قلبی، محبت، وہ انعامات ہیں جو حق تعالیٰ کی جانب سے تم کو عطا کیے جائیں گے، اور وہ تمہیں بطریقِ اجتبا اپنی جانب کھینچ لینگے۔

راہ بسیار است مردم را بسوئے حق و لے

راہ نزدیکش دل مردم بدست آوردن است

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ، لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ

(پ ۲۳ ع ۶)

لہ بیشک یہی ہو بڑی مراد ملنی، ایسی چیزوں کے واسطے چاہیے محنت کریں محنت کرنے والے۔

قرآن اور سیرت سازی[1]

شہ نیست کسے کہ تختِ علج دارد تا آنکہ نہ شاہانہ مزاجے دارد
یعنی کہ خروس پیشِ اربابِ شعور سلطاں نشود اگرچہ تاجے دارد (درد)

دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت شئے، سب سے زیادہ گراں قدر اور عزیز شئے، پاک سیرت ہے، زندگی تربیت گاہ ہے، حق تعالیٰ مربی و معلم ہیں، واقعات و حادثات وہ آلات و ادوات ہیں جن کے ذریعہ وہ ہماری سیرت کی تکمیل کر رہے ہیں، دنیا کی "روح ساز" وادی میں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت ہی کے خفتہ نغمے بیدار کیے جاتے ہیں، زندگی کی غایت ہی یہ نظر آتی ہے کہ سیرت کو سنوارا جائے، پختہ کیا جائے، کامل بنایا جائے، کیوں؟ اس لیے کہ سیرت ہی پر دنیوی کامیابی کا انحصار ہے، سیرت ہی پر فوزِ آخرت کا مدار ہے، دین و دنیا کی اصلاح سیرت ہی کی اصلاح سے ہوسکتی ہے، سیرت ہی پر جسمانی اور روحانی صحت مبنی ہوتی ہے، اور بردقلبی اور طمانیتِ خاطر پاک سیرت ہی کا نتیجہ ہے؛ بنی آدم کا "اکرام" سیرت ہی کی پاکی کی وجہ سے ہوتا ہے، جو انسان پاک سیرت نہیں وہ صورۃً گو انسان ہے، لیکن حقیقۃً وہ حیوان ہے، یا دیو ہے یا غول ہے،" شیاطین الانس" میں اس کا شمار ہے، وہ دنیا، دین اور آخرت کی حقیقی اقدار سے محروم ہے:

سیرت، علمائے نفسیات کی باریک بیں اور دوررس نگاہ میں ان تعینات، عادات، میلانات کا مجموعہ ہے جو فرد کے کردار کی رہنمائی کرتا ہے، اس کو دوسروں سے متمیز کرتا ہے، اور اس کی وحدتِ کردار کا باعث ہے، ہر فرد دوسرے فرد سے متمیز ہوتا ہے، صورت اور

---

[1] یہ مقالہ معارف میں مارچ ۱۹۳۲ء میں اول مرتبہ شائع ہوا۔

Marfat.com

سیرت میں، صورت کی غیریت تو حقیقی واقعی ہوتی ہے، یہ رفع نہیں کی جاسکتی، اور نہ کوئی اس کو رفع کرنا چاہتا ہے، لیکن سیرت میں ایک قسم کی مماثلت ہوسکتی ہے، یہ مماثلت عینیت نہیں انفرادیت ناقابلِ انکار ہے، باوجود مماثلت کے انفرادیت موجود ہوتی ہے، اور اس انفرادیت کا مبدأ، اور اس کے وہ اقتضاءات و قابلیات ہیں، جو اپنا ظہور عادات و افعال میں کرتے ہیں اور اس تمام مجموعہ کو ہم نفسیات کی اصطلاح میں سیرت سے تعبیر کرتے ہیں، سیرت افعال میں وحدت پیدا کرتی ہے، اور سیرت کے کامل علم کے بعد بڑی حد تک فرد کے افعال کی پیشین گوئی ممکن ہوجاتی ہے۔

سیرت کی تحلیل میں ہمیں اس امر کا خیال رکھنا چاہیے کہ یہ عادات کی تنظیم کا نام ہے عادت کی تشکیل افعال کی تکرار سے ہوتی ہے، افعال کا صدور بظاہر محرکات پر مبنی ہوتا ہے، لیکن محرکات کا ماخذ و منبع وہ تیقنات و اذعانات ہوتے ہیں، جو انسان زندگی کے تجربات ماحول کے اثرات، تعلیم اور دوسرے ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ علم و یقین عمل و عادات یہ وہ اہم عناصر ہیں، جن میں سیرت کی تحلیل کی جاسکتی ہے، سیرت سازی کے طریقے کو جاننے کے لیے ہمیں ان ہی عناصر کی تحقیق کرنی ہوگی۔

(۱) علم و یقین: اَلعِلمُ نُکتَۃٌ، سیرت سازی کے لیے صرف ایک نکتہ کا وجدانی اجمالی علم کافی ہے، پھر عقلی طور پر اس کی تفصیل و توضیح میں دفاتر رنگے جاسکتے ہیں ؎

دل گفت مرا علم لدنی ہوس است — تعلیم کن گرت بدیں دسترس است
گفتم کہ الف، دگر مگفتم ہیچ — در خانہ اگر کس است یک حرف بس است

(شیخ عزیز الدین محمود الکاشی)

وہ وجدانی علم، علم لدنی، حق تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے، اسی اقرار کی مضبوط چٹان پر سیرت کی مشید عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے، اس اقرار کے تضمنات پر غور کرو، جب میں ایمان و اذعان کی شاہانہ قوت سے حق تعالیٰ کے الٰہ ہونے کا اقرار کرتا ہوں تو سب سے پہلے میں بیان

Marfat.com

رہا ہوں کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، وہی عبادت یا پرستش کے قابل ہیں، عبادت کیا ہے، یہ غایتِ تذلل کا نام ہے، اظہارِ ذلت کا نام ہے، میرا یہ سر اگر جھک سکتا ہے تو بس میرے خالق، میرے مولیٰ، میرے مالک وحاکم ہی کے سامنے جھک سکتا ہے، اور غیر کے سامنے ہرگز نہیں جھک سکتا! اظہارِ ذلت کی وجہ کیا ہے؟ میں فقیر ہوں محتاج ہوں، میرا معبود غنی کہ قوت واقتدار سے متصف ہے، علم وحکمت سے موصوف ہے، رب ہے، پالنے والا ہے مستعان ہے، مدد کرنے والا ہے، استعانت ہی کی خاطر میں اس کے سامنے اظہارِ ذلت کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ سارا عالم فقیر ہے، اور میرا معبود ہی صرف غنی وحمید ہے، میں اس کا فقیر ہو کر سارے عالم سے غنی ہوں، میرا یہ احساس کہ میں اس شہنشاہ کا دریوزہ گر ہوں، جس کے دریوزہ گر سارے شاہ وگدا ہیں، مجھے سارے عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے اور میں کفیٰ باللہ وکیلا کہہ کر عبادت واستعانت کے نقطۂ نظر سے ماسوی اللہ سے کٹ جاتا ہوں، اور فقر وذلت یا بندگی کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لیتا ہوں، اب کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی میرے لیے نہ امید کا مرکز بن سکتی ہے، اور نہ خوف وہراس کا سبب، ان سب کا فقر، ان سب کی ذلت ومجبوری، بیچارگی وبے بسی میری نظروں میں اتنی ہی آشکارا وہویدا ہو جاتی ہے جتنی کہ خود میری بیکسی ومجبوری، ہم سب عبد ہیں، کوئی چیز اصالۃً ہماری نہیں، فقر ہماری ذاتی صفت ہے، امانۃً چند روز کے لیے چند چیزیں ہم کو دی جاتی ہیں، نادانی سے ہم ان کو اپنی سمجھتے ہیں، حقیقی مالک کو بھول جاتے ہیں، انہی کی محبت میں فریفتہ ہو جاتے ہیں، حقیقی اقدار سے غافل ہو جاتے ہیں، ناگہاں یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے، اور یہ ساری محبوب ومرغوب چیزیں موت ہم سے چھین لیتی ہے، اور پھر اپنے اصلی فقر وذلت کے ساتھ ہم نادم وپشیمان اس جہان سے رخصت ہو جاتے ہیں تاکہ اپنے اعمال کے اثرات کو، اپنے افعال کے نتائج کو، اپنے کردار کے اثمار وعواقب کو جو اس دنیا میں بھی اپنی موجودگی کا مختلف رنگوں میں ہمیں احساس بخش رہے تھے، زیادہ نمایاں، زیادہ واضح اور اجاگر طریقے سے دیکھیں، اور حسرت وندامت کی آگ میں جلیں۔

Marfat.com

سیرت کی تعمیر اسی اساسی یقین پر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں، جن کے آگے یہ میرا سر جو سارے جہان کے مقابلہ میں معزز و مفتخر، بلند و بالا ہے، فقیرانہ شان سے جھک رہا ہے اور حیات و علم، رزق و فراخی، صحت و عزت، ہدایت و رشد کی استدعا کر رہا ہے، اور غیر متزلزل یقین کے ساتھ کر رہا ہے کہ حواس کی آنکھ چاہے جو تماشا دکھلائے، اور وہم چاہے جو مانے اور منوائے، یہ ساری نعمتیں حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں، اور دیتے ہیں، ان کے سوا نہ کسی میں حول و قوت ہے اور نہ فعل و اثر وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ! صورتوں سے جو ہم نے اُمیدیں باندھ رکھی ہیں، صورتوں کو جو ہم نے خوف کی چیزیں سمجھ رکھی ہیں، صورتوں کے سامنے جو ہم ذلت کا اظہار کر رہے ہیں، اور صورتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں، اور ان کو رب بنا رکھا ہے، یہ کس قدر عظیم الشان دھوکا ہے، اس کے ضرر و اضلال کا پہلو کس قدر قوی ہے: عزتِ نفس کی خونریزی کو دیکھو، اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھو، اس کذب و افتراء کے نتائج پر غور کرو، فقیروں کے در پر سوال کرنے سے بھی کچھ ملا ہے، اس غریب کے ہاں کیا رکھا ہے' جو دوسروں کو دے۔ اُمیدوں کا خون ہونا لازمی ہے، حسرت و حرمان قطعی، جو بیچارہ اپنے درد دُکھ کو دفع نہ کر سکتا ہو، وہ تمہارے درد و غم کا کیا علاج کر سکتا ہے، وہ تمہارا مولیٰ و رب کیسے ہو سکتا ہے، ہائے تم نے حقیقت کو چھوڑ کر سایہ کا تعاقب شروع کر دیا ہے، بیدار کو چھوڑ کر مدہوش سے التجا کر رہے ہو، زندے کو چھوڑ کر مردے سے لپٹے ہوئے ہو! تمہارے وہم نے تمہیں کس التباس میں مبتلا کر رکھا ہے!

بقولِ دشمن پیمانِ دوست بشکستی　　ببیں کہ از کہ بریدی و باکہ پیوستی!

معبود و مستعان صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی سے ہمیں جوڑنا چاہیے، وہی ہماری اُمیدوں کے مرکز ہیں، ان ہی کی ناراضی سے ہمیں خوف کرنا چاہیے، اور چوب و سنگ یا گوشت و پوست کے جھوٹے خداؤں سے بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لینی چاہیے، ان سے نفع و ضرر کی توقع قطعاً چھوڑ دینی چاہیے۔

Marfat.com

تاچندگہ از چوب گہ از سنگ تراشی ‏ ‏ بگذر از خدائے کہ بصد رنگ تر اشی

حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت پر یقین، یہ ایمان سیرت کا سنگِ بنیاد ہے، اسی یقین کی پرورش ہونی چاہیے، الٰہ باطلہ کی نفی، الٰہِ حق کا اثبات قلب کی گہرائیوں میں متمکن ہوجائے تحت الشعور نفس میں جاگزیں ہو، رگوں میں خون کی طرح دوڑ جائے، علم الیقین کے مرتبہ سے گزر کر حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جائے، متحقق ہوجائے تو پھر ایسی شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے جس کا مقابلہ کائنات کی کوئی قوت نہیں کر سکتی، وہ بفحوائے تخلقوا باخلاق اللہِ خلقِ الٰہی سے مزین ہوتا ہے، تمام صفاتِ رذیلہ سے پاک اور تمام اوصافِ حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے، کامل عبد ہوتا ہے، جس سے بہتر جس سے زیادہ مقدس دنیا میں کوئی شے نہیں ہوتی۔

توحیدِ معبودیت کی رو سے حق تعالیٰ ہی مالک و حاکم قرار پاتے ہیں اور مستحقِ عبادت ٹھہرتے ہیں، ہمارا سر حقیقی مالک و حاکم ہی کے سامنے جھکتا ہے جس کے آگے ساری کائنات سرنگوں ہے، طوعاً و کرہاً اور توحیدِ ربوبیت کی رو سے حقیقی فاعل حق تعالیٰ ہی قرار پاتے ہیں وہی خالق ہیں، وہی نافع و ضار ہیں، وہی زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں، ہمارا ہاتھ ان ہی کے آگے دراز ہوتا ہے، اور انہی سے ہم مدد و اعانت کے لیے درخواست کرتے ہیں! غنی کی فقیری ہمیں ساری کائنات سے بے نیاز اور غنی کر دیتی ہے!

دیکھو توحیدِ معبودیت و ربوبیت کا سبق دے کر عرب کے اُمّی معلّم (فداہ ابی و امی) نے اپنے متبعین کو صفاتِ رذیلہ سے کس طرح پاک اور صفاتِ حمیدہ سے کس طرح مزین کر دیا تھا، صفاتِ رذیلہ جن سے تمام علمائے اخلاق قلوب کا تزکیہ چاہتے ہیں، اس رباعی میں یوں ادا کیے گئے ہیں:-

خواہی کہ دلت شود صاف چو آئینہ ‏ ‏ دہ چیز بروں کن از درونِ سینہ

حرص و حسد و بخل و حرام و غیبت ‏ ‏ کذب و غضب و کبر و ریا و کینہ

دیکھو ان صفاتِ قبیحہ سے قلب کا تزکیہ سقراط کے "طنزیات" افلاطون کے "مکالمات" ارسطو کی "اخلاقیات" اور جدید فلسفیوں کے عالمانہ "خطبات" کے بغیر پڑھے اور سمجھے صرف لا اِلٰہ اِلّا اللہ کے مختصر جملہ کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے کس آسانی سے ہو جاتا ہے۔

جب تک انسان دولت کو اپنی ملک سمجھتا ہے، خود ہی کو اس کا مالک جانتا ہے؛ نہ حرص کا اس کے قلب سے تسلط اٹھ سکتا ہے اور نہ بخل وحسد کا، جوں ہی اس نے سچے دل سے توحید فی الآثار کا اقرار کیا، اور یہ مان لیا کہ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَہُمَا، اللہ ہی کے لیے ہے سارے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، تو اس نے اپنی مالکیت وحاکمیت کی نفی کی اور حق تعالیٰ کی مالکیت وحاکمیت کا اثبات کیا، حقیقی مالک و حاکم ومتصرف حق تعالیٰ کو جانا، اور اپنی ذات کو محض "امین" سمجھا، اب اس کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ حقیقی مالک ہی کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے، امین امانت کے شرائط کے تحت ہی تصرف کا اختیار رکھتا ہے، اب اگر دولت پر جو اس وقت اس کی امانت میں ہے، کوئی آفت آجاتی ہے تو وہ بحیثیت امین اس کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے، اگر بچ نہ سکے تو جانتا ہے کہ مالکِ حقیقی امانت کا استرداد چاہتا ہے، اور بخوشی وہ اپنی امانت حوالہ کر دیتا ہے، اس طرح نہ اس کے جانے کا اس کو رنج ہوتا ہے، اور نہ اس کے آنے کی خوشی، اور اس کا قلب ان اختلال پیدا کرنے والے تاثرات سے پاک اور آزاد رہتا ہے، اور وہ ع:

یک دل دارے بس است یک دوست ترا

کہہ کر حق تعالیٰ ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، اور ایک دم رنج وغم، پریشانی وپشیمانی کے تمام احساسات وجذبات سے حقیقی معنی میں نجات حاصل کر لیتا ہے، ایسے ہی خوش قسمت کی ذہنیت کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔

لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا — تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور شیخی نہ کرو

Marfat.com

بِمَآ اٰتٰکُمْ (پ۲۷ ع ۱۹) اس پر جو تم کو اس نے دیا۔

ان اصول کو سمجھ لینے کے بعد غور کرو کہ وہ شخص حریص کیسے ہو سکتا ہے، جو مال و دولت کا حقیقی مالک حق تعالیٰ کو سمجھتا ہے، اور ان احمقوں کو جو اپنی ذات کو مالک سمجھ رہے ہیں، مخاطب کر کے کہتا ہے:-

گماں مبر کہ زر و سیم دادہ اند ترا ودیعتے است کہ داری بدست روزے چند

چہ سود گر بشوی غرہ بر متاعِ کسے چو بش بر سر دکانِ روستا خرسند

حرص کے ساتھ بخل و حسد کی بھی جڑیں کٹ جاتی ہیں، جب مال و دولت ودیعت و امانت ہیں اور وہ بھی چند روزہ امانت، موت کے وقت یہ ہم سے واپس لے لی جاتی ہیں، اور دوسروں کے حوالہ کی جاتی ہیں، تو پھر اس علم کے بعد ہماری ذہنیت اس چوہیا کی طرح کیسے رہ سکتی ہے جو بنیے کی دکان کی ساری چیزوں کو اپنی سمجھتی ہے اور اپنے ہی کو مالک و متصرف جان کر بخل و حرص کا شکار بنتی ہے، غیر کے مال میں بخل بے معنی ہے، بخل ہوتا ہے اپنے مال میں، مال اپنا نہیں، پھر بخل کیسا؟ حرص کی بنیاد ہی اس خیال پر قائم ہے کہ مالک ہم ہیں، حقدار ہم ہیں، ہم کو نہیں مل رہا ہے، دوسروں کو مل رہا ہے، ہم کو کیوں نہ ملے! جب مال میرا ہے نہ تیرا بلکہ مالکِ حقیقی کا تو حسد کس پر؟ حسد و حرص اور ان کے لازمی نتائج ہم و غم، درد و حزن رنج والم نتیجہ ہیں خیانت فی الامانت کا، یعنی شرک کا، جوں ہی شرک کی جڑیں قلب سے لا اِلٰہ اِلا اللہ کے ذریعہ اکھاڑ کر پھینک دی گئیں، اور اس کی بجائے توحید جلوہ افروز ہو گئی انسان ان تباہ کن جذبات کے چنگل سے نجات پا جاتا ہے، حقیقی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے، سکون و برد قلبی کی دولت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

کبر و فخر و عجب کی اس قلب میں گنجائش ہی کہاں جو اپنے کو حاکم نہیں محکوم، مالک نہیں مملوک، رب نہیں مربوب، مولیٰ نہیں عبد سمجھتا ہو، اپنی محکومیت و مملوکیت کا یقین جو موحد کے دل کی گہرائیوں میں جاگزین ہے۔ فخر و غرور کے جذبات کو پیدا ہونے نہیں دیتا

اس کی عضویت اس زہر کو قبول کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہی نہیں رکھتی۔

اب توحید فی الربوبیت کے قیام کے آثار پر غور کرو جب تم نے فاعل حقیقی حق تعالیٰ کو مان لیا، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ کے قائل ہو گئے، نافع و ضار فی الحقیقت انہی کو سمجھنے لگے، تو خوف و حزن سے تم نے رستگاری حاصل کر لی، غیر کو نافع و ضار قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم کو اس سے نفع پہنچنے کی اُمید ہوتی ہے، اور اس اُمید کی شکست حزن و غم کو ضروری طور پر پیدا کرتی ہے، اس سے ضرر کا اندیشہ تمہارے سینہ کو خوف سے بھر دیتا ہے، جونہی تم نے وہم کے اس بت کو توڑا، اور حق تعالیٰ کی اس تنبیہ کو یاد کیا، کہ

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَنْفَعُکَ وَلَا یَضُرُّکَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّکَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (پ ١٦٦)

اللہ کے سوا کسی کو مت پکار، ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ بُرا، پھر اگر تو ایسا کرے، تو تو ہو جائیگا ظالموں میں۔

غیر اللہ کی ربوبیت تمہارے قلب سے فنا ہو گئی، نفع کی اُمید، ضرر کا خوف تمہارے سینہ سے جاتا رہا، اور حزن و خوف سے تم نے ہمیشہ کے لیے نجات پالی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ (پ ٢٦ ع ٢)

مقرر جنہوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر ثابت قدم رہے تو نہ ڈر ہو اُن پر اور نہ وہ غمگین ہونگے۔

ربوبیت پر جہاں تم نے استقامت پیدا کر لی کہ دنیا اور زندگی کے متعلق تمہارا سارا نقطۂ نظر بدل گیا، نقطۂ نظر کا بدلنا تھا، کہ زمین و آسمان بدل گئے ؎

چو برخیزد خیال از چشم احول
زمین و آسماں گردد مبدل

ایک وہم تھا، خیال تھا جس نے تمہیں خوف و حزن کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، اب تم نے اس خیال کی تصحیح کی، ذہنی صحت تمہیں حاصل ہوئی، نور کی طرف تم نے اپنا منہ کر لیا،

Marfat.com

اور تمہاری روح اپنے خالق وحاکم کو مخاطب کر کے چیخ اٹھی۔

اَللّٰھُمَّ اَسْلَمْتُ نَفْسِیْ اِلَیْکَ وَ — اے اللہ میں نے اپنی جان تیرے سپرد کی اور اپنا
وَجَّھْتُ وَجْھِیْ اِلَیْکَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِیْ — منہ تیری طرف کیا اپنے کام تیرے حوالے کیے
اِلَیْکَ وَاَلْجَأْتُ ظَھْرِیْ اِلَیْکَ رَغْبَةً — اپنی پیٹھ تیرے سامنے جھکائی تیرے فضل کی امید
وَّرَھْبَةً اِلَیْکَ لَا مَلْجَأَ وَلَا مَنْجَأَ مِنْکَ — میں اور تیری ناراضی سے ڈر کر، میری پناہ اور نجات
اِلَّا اِلَیْکَ[۱] — کا مرکز تو ہی ہے۔

اس اقرارِ ربوبیت کے ساتھ ہی تم نے اپنے قلب میں طمانیت و راحت محسوس کی، اعتماد ویقین نے خفتہ قوتوں کو جگایا، سارا عالم تمہیں نفع و ضرر سے خالی، تمہارے ساتھ تعاون عمل کے لیے تیار، تمہارا رفیق وخادم نظر آنے لگا! زندگی کے راستہ میں تمہارے، قدم بیباک انداز میں اٹھنے لگے، تمہارا سینہ کینہ سے پاک ہوگیا، کیونکہ تمہارا یہ وہم دور ہوگیا کہ سوائے حق تعالیٰ کے ضرر اور نقصان پہنچانے والا درحقیقت دوسرا کوئی ہو سکتا ہے، حواس کی آنکھ جس کو دشمنِ بے رحم دیکھ رہی تھی، ایمان کی آنکھ اس کو حق تعالیٰ کا فرستادہ بتلا رہی ہے اور سعدیؒ کے پر اثر الفاظ میں کہہ رہی ہے

چوں دشمنِ بے رحم فرستادۂ اوست — بدعہدم اگر نہ دارم این دشمن دوست

اسی وقت غیظ وغضب سے بھی تمہارا نفس پاک ہوگیا، دوست پر غضب کیسا؟ اس یقین کے بعد کہ ہر آفت، ہر مصیبت سیرت کے کسی نقص کو رفع کرنے آتی ہے، معلم حقیقی کی طرف سے تنبیہ ہے جو ہمیں اپنے نقائص و ذمائم کی طرف متوجہ کرتی ہے، ان کی اصلاح کا موقع دیتی ہے، ہم کو ظلمت سے نکالتی اور نور کی طرف ہمارا رُخ پھیر دیتی ہے، حق تعالیٰ سے جوڑتی اور نفس وشیطان سے توڑتی ہے، ہاں پھر اس یقین واذعان کے بعد ہمارا سینہ غیظ و غضب کا محل کیسے بن سکتا ہے؟

---

[۱] یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہے۔ رواہ الجماعۃ عن البراء بن عازب، رسول اللہ سوتے وقت آخری چیز یہ پڑھتے تھے۔

ریا جو خلق کے لیے اپنے اعمال کی تزئین ہے، اسی وقت ممکن ہے، جب خلق کو نافع و ضار سمجھا جائے، خلق سے توقعات وابستہ ہوں، یا ضرر کا اندیشہ ہو، اس وہم کے دور ہو جانے کے ساتھ ہی ریاکاری اور تصنع و نمائش کی جڑیں کٹ جاتی ہیں، عمل صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے جاری ہو جاتا ہے، حور و قصور کے لیے نہیں رہتا، کیونکہ یہ بھی مخلوق ہیں، اور مخلوق سے نہ راحت ہے اور نہ سرور و عزت اور نہ یہ مقصود بالذات۔

کذب یا دروغ بانی کا محرک یا تو نفع کا حصول ہوتا ہے یا ضرر کے دفع کا خیال؛ یا پھر خود بینی و خود ستائی، کبر و فخر، عجب و ریا، ہم نے اوپر دیکھا کہ ربوبیتِ حق ان صفاتِ ذمیمہ کا استیصال کس خوبی سے کر سکتی ہے، اسی لیے موحّد کا قلب صداقت کا خزینہ ہوتا ہے، وہ وعدوں کا پکا، قول کا سچا ہوتا ہے وَالْمُوفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا[1] کا مصداق۔

اسی طرح غیبت شرک فی الربوبیت کا نتیجہ ہے، غیبت کی وجہ یا تو عداوت ہوتی ہے جس کا محرک نقصان و ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے، یا حسد یا محض کذب سے حاصل ہونے والی شیطانی لذت، ربوبیت کا صحیح علم اور اس پر یقین ان تمام ذمائم کی بے خطا دوا ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کیا، غیر اللہ کو حقیقی نافع و ضار قرار دے کر عداوت و بغض و حسد میں مبتلا ہوں، اور غیبت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، خود آفریدہ التباس کو صحتِ علمی نے دفع کر دیا اور ان ذمائم کی گرفت سے قلب کو نجات ملی۔

غرض تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب یعنی سیرت سازی کے لیے سب سے پہلے شرک فی المعبودیت اور شرک فی الربوبیت کی بیخ کنی ضروری ہے، لا کی شمشیر سے مالکیت، حاکمیت اور ربوبیت ذواتِ خلق سے کاٹ دی جاتی ہے، اور الا سے اس کا اثبات ذاتِ حق میں کیا جاتا ہے، اور اس طرح اخلاقِ الٰہیہ سے آراستہ ہونے کی قابلیت اور استعداد پیدا کی جاتی ہے، اب مجاہدہ اور عمل اس مقصود کے حصول کے لیے ضروری ہیں اس کی توضیح

---

[1] پورا کرنے والے اپنے اقرار کو جب عہد کریں۔

Marfat.com

میں چند مقامات کا پیشِ نظر رہنا لازمی ہے۔

ابتدا میں ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ علم ہی سے عمل پیدا ہوتا ہے لیکن علم سے مراد محض نظری علم نہیں لینا چاہیے، جو کانوں کی راہ سے داخل ہوتا ہے لیکن قلب میں جاگزین نہیں ہوتا، اس لیے عمل کی صورت میں نمایاں ہونے کی قوت نہیں رکھتا اور اس لیے منفعت بخش نہیں ہوتا[1]۔ علم سے مراد ہماری مراد وہ یقین و اذعان ہے جو قلب کی گہرائیوں میں اپنا مسکن بناتا ہے، خون کی طرح تمام رگوں میں دوڑتا ہے، دماغ پر کامل تسلط رکھتا ہے، اور لازماً عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے، ایسا یقین تفکر و تدبر یا مراقبہ سے پیدا ہوتا ہے اسی لیے تفکر کو عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے[2]، تفکر و مراقبہ سے علم راسخ ہوتا ہے[3]، مضبوط ہوتا ہے، تلوین جاتی ہے، تمکین رونما ہوتی ہے اور راسخ عقیدہ ہی عملاً اپنا خارج میں ظہور کرتا ہے۔ جب عمل کی تکرار ہوتی ہے، تو عادت پیدا ہو جاتی ہے، جو فطرتِ ثانیہ کہلاتی ہے، اب عمل کے لیے فکر و غور کی ضرورت باقی نہیں رہتی، غیر شعوری نفس عمل کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے، مضائقت رفع ہو جاتی ہے، سہولت پیدا ہو جاتی ہے سیرت قائم ہو جاتی ہے، اسی لیے کہا گیا ہے۔ ع

چند روز جہد کن باقی بخند

اب ہمیں سیرت سازی کے دوسرے اہم عنصر مجاہدہ یا عمل و عادت کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

(۲) **مُجَاھِدَہ**: پاک سیرت جس طرح بغیر صحیح علم اور عقیدہ کے ممکن نہیں، اسی طرح بغیر عملِ صالح اور مجاہدہ کے اس کی تمام خوبیوں کا نمایاں ہونا بھی ممکن نہیں

---

[1] لیے علم سے استعاذہ کیا گیا ہے۔ اعوذ بك من علم لا ینفع و من قلب لا یخشع۔

[2] تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سبعین سنۃ (الدیلمی و روی ابو الشیخ من حدیث ابو ہریرۃ)

[3] قل انی اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنیٰ و فرادیٰ ثم تتفکروا، (پ۲۲۔ ع ۱۲) سے تفکر کا حکم صاف طور پر سمجھ میں آتا ہے۔

اسی لیے فرمایا گیا: جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ[1] اور صحیح عقیدہ مجاہدہ ہی کی چشم بصیرت فرد کے سامنے نیکیوں کی تمام راہیں کھول دیجاتی ہیں۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا،[2] اب ہمیں مجاہدہ کی ماہیت اور اس کے طریقوں کو سمجھ لینا چاہیے۔

ذرا اپنے ذہن کے نہان خانہ کو تو دیکھو کہ کیا یہ ایک لحظ خیالات، تصورات، خواطر اور وساوس سے خالی بھی رہتا ہے؟ علم کا ایک دریا ہے کہ ابلا چلا آرہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لامتناہی مبدأ سے نکل رہا ہے، اس کی ماہیت و نوعیت پر غور کرو تو ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ یا تو ہدایتی علم ہے یا اضلالی۔ اس کی آمد کسی طریقہ سے روکی نہیں جا سکتی، کونسی قوت اس کو روک سکتی ہے؟ کسی خیال کو محض ارادہ کی قوت سے پیدا نہ ہونے دینا بشری طاقت سے باہر ہے، خیالات آزادی کے ساتھ ایک نامعلوم منبع سے ظہور کرتے ہیں، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نہ ان کے پیدا کرنے پر قادر ہے اور نہ ان کے فنا کرنے پر! لیکن انسان کو اتنی طاقت دی گئی ہے کہ اپنی توجہ اضلالی علم کی طرف سے ہٹا کر ہدایتی علم کی طرف مبذول کردے، یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیالات کو ایجابی خیالات میں بدل دے، یہی مجاہدہ کی ماہیت ہے، ذہن میں سلبی یا اضلالی خیال غیر اختیاری و اضطراری طور پر پیدا ہو رہا ہے، اب یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں اس خیال کو گلے سے لگاؤں، پیار کروں، قلب کے میدان میں تخت بچھادوں، اور اس کو معزز مہمان کی طرح عزت و وقار سے بٹھادوں، یا یہ کہ اس کے ذہن کے دروازہ سے سر نکالتے ہی اس کے مقابل ہدایتی یا ایجابی خیال کو اس کی سرکوبی کے لیے لے آؤں، اور نور کی قوت کو ظلمت کی طاقت سے لڑادوں، ظاہر ہے کہ نور و ظلمت کے مقابلہ میں نور ہی کامیاب ہوگا، کیونکہ ظلمت نور ہی کے غیاب کا

---

[1] مجاہدہ کرو اللہ کے واسطے جیسا کہ چاہیے اس کے واسطے مجاہدہ کرنا (پ ۱۷ ع ۱۰)

[2] جنھوں نے ہمارے واسطے مجاہدہ کیا ہم ان کو اپنی راہیں سجھا دینگے (پ ۲۱ ع ۳)

تو نام ہے، نور ہی کے عدم سے ظلمت پیدا ہوتی ہے، جہاں نور ہو وہاں ظلمت کیسے چھا سکتی ہے! مجاہد حق تعالیٰ ہی کی حول وقوت سے اضلالی علم کے بجائے ہدایتی علم پر عمل کرنے کا نام ہے، اضلالی خیالات کے ذہن میں خطور کرتے ہی مجاہد کی روح "خیر کے مبدء" کی طرف استعانت کے لیے متوجہ ہو جاتی ہے، استعاذہ کرتی ہے، پناہ مانگتی ہے، اپنی محدود قوت پر بھروسہ نہیں کرتی اپنی بیچارگی سے واقف ہوتی ہے، لامتناہی قوت کے آستان پر تیزی کے ساتھ پہنچ جاتی ہے، اور چیخ اٹھتی ہے:-

"سبحان ذی الملك والملكوت سبحان ذی العزة والجبروت سبحان الحق الذی لایموت اعوذ بعفوك من عقابك واعوذ برضاك من سخطك و اعوذبك منك جل وجهك [۱]"

اور یہ لامتناہی عزت وجبروت، یہ لامحدود ملک وملکوت والا آقا ہم سے دور نہیں، وہ جو بالذات ہے جہان میں موجود ہر جگہ "ہمارے پاس ہی تو ہے، رگِ جان سے زیادہ قریب ہے، ہمارا زندہ تر، وہ "الغیاث" کی اس پکار پر شانِ رحمت کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے، اور اس کی تجلی کے ساتھ ہی قلب کے ضرر و اضلال سے پوری حفاظت ہو جاتی ہے! یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیال کی جگہ ایجابی خیال لے لیتا ہے، اور شر کا صدور ہی نہیں ہونے پاتا۔

نفسیات کے اس مسلّمہ قانون کو یاد کرو، جس پر اس مقالہ کی بنیاد قائم ہے، کہ افکار ہی سے اعمال کا صدور ہوتا ہے، اعمال ہی کی تکرار سے عادت کا قیام ممکن ہے، اور عادات کی تنظیم و ترتیب سے سیرت کی تشکیل ہوتی ہے، مجاہدہ سلبی یا بد یا اضلالی خیالات کا گویا دروازہ ہی پر مقابلہ ہے جوں ہی ان خیالات نے کتم عدم سے سر نکالا، ان کے مقابل کے ایجابی یا نیک یا ہدایتی خیالات نے ان سے ٹکر لی، اپنی محدود کمزور قوت سے ان کا مقابلہ نہیں کیا، بلکہ نامتناہی قوت وجبروت کے مبدء سے اخذ فیض کیا۔ اور اس طرح بے پناہ

[۱] یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جس کو حاکم نے حضرت عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

Marfat.com

طاقت کے ساتھ ان پر ضرب لگادی اور ان کا قلع قمع کر دیا جب عمل ہی کا صدور اس طرح روک دیا گیا، اور ابتدا ہی میں روک دیا گیا، تو تکرار کی نوبت ہی کہاں، عادت کا قیام کس طرح ممکن اور سیرتِ بد کی تشکیل کا کیا ذکر، یاد رکھو کہ فاسد خیالات کو قوت اس وقت ملتی ہے جب وہ تخیل کے دروازے سے خانۂ قلب میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہ داخل اسی وقت ہو سکتے ہیں، جب دربانِ قلب غفلت کی نیند سو رہا ہو، چوکس نہ ہو، ہوشیار اور خبردار نہ ہو، یا پھر اپنی حول وقوت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہے! اس صورت میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زور مردافگن ہے، ان سے مقابلہ بچوں کا کھیل نہیں، یہ بڑے سے بڑے پہلوان کو آسانی سے پچھاڑ سکتے ہیں، ان کے داؤں پیچ سے بہادر سے بہادر بھی پناہ مانگتے ہیں، ان سے مقابلہ کی ایک ہی صورت ہے، ان کے درود کے وقت ہی انہیں پچھاڑا جائے، سنبھلنے کا موقع نہ دیا جائے اور حق تعالیٰ کے حول وقوت سے ان کا سامنا کیا جائے اَللّٰھُمَّ اعذنی من شر نفسی[1] کی فریاد فوراً بلند ہو، اعوذ بك منك کی چیخ فوراً نکلے، پھر شکست ناممکن ہے، کامیابی قطعی ہے، حق تعالیٰ کی پناہ میں آکر مغلوبیت کیا معنی رکھتی ہے، ناکامی کیا چیز ہے، ان کی معیت کے ساتھ ہی بلندی نصیب ہوتی ہے اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ[2] کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے۔

یہی نفسیاتی الہیاتی طریقہ بدعادات کی شکست میں بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے، بدعادت سے مراد کوئی عادت ہے، جو ہمارے اختیار و تصرف میں نہیں، بدعادت کی غلامی تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے، بدعادت کا غلام دنیا میں نہ کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ بردِ قلبی اس کو نصیب ہو سکتی ہے، چونکہ افعال ہی کی تکرار سے عادت بنتی ہے، اور افعال کا محرک ہمیشہ خیال یا تصور ہوتا ہے، لہذا بدعادت کی شکست خیال کی تبدیلی پر

---

[1] اے اللہ میرے نفس کے شر سے مجھ کو پناہ دے۔

[2] تم ہی رہو گے غالب اور اللہ تمہارے ساتھ ہیں (پ ۲۶ ع ۸)

منحصر ہے، عادت کے قائم ہو جانے پر فعل کے ارتکاب کی ایک طبعی خواہش ہوتی ہے، لیکن ساتھ ہی اس خواہش کی تکمیل کا خیال پیدا ہوتا ہے، ممکن ہے کہ خواہش پر ہمارا قابو نہ ہو لیکن خیال ہمارے تصرف میں آسکتا ہے، اگر خیال کا صحیح طریقہ سے مقابلہ کر لیا جائے تو خواہش بھی مغلوب ہو جاتی ہے، مثال کے طور پر شرابی کی حالت پر غور کرو۔ اس کو شراب کی خواہش ہوتی ہے اور یہ خواہش یہ خیال پیدا کرتی ہے کہ چل کر پینا چاہیے، خیال کا کامیابی سے مقابلہ کرنے پر خواہش کے اشتداد میں کمی ہوتی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ کا مقابلہ دوسرے دفعہ کے مقابلہ کو آسان تر بناتا ہے اور مجموعی نتیجہ حیرت خیز ہوتا ہے، یہی معنی ہیں اس قول کے کہ "خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں"

بہر طور بری عادتوں کے آہنی پنجہ سے رہائی اسی وقت ممکن ہے کہ خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کا مقابلہ کیا جائے اور اسی طریقہ سے مقابلہ کیا جائے جس کا اوپر ذکر ہوا، اگر اس کے باوجود ہمیں ناکامی کی صورت دیکھنی پڑے، تو ہمیں مایوس اور ناامید نہیں ہونا چاہیے، مجاہد کے نزدیک یاس کفر ہے گناہ کے ارتکاب کے بعد یا عادتِ بد کا پھر ایک مرتبہ (باوجود عزم راسخ کے کہ ایسا نہ ہوگا) شکار بننے کے بعد جو ندامت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، جو حزن و ملال کہ وہ محسوس کرتا ہے، وہ اس کے ارادوں کو مضبوط کرنے میں غیر محسوس طریقہ پر مفید ہوتے ہیں اور وہ وقت بہت جلد آپہنچتا ہے، جب وہ محض اسی طریقہ پر عمل پیرا ہو کر فاتحانہ شان سے اپنی خود ساختہ بیڑیوں کو توڑ کر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاتا ہے، عارف رومی نے مجاہدہ کے اس اعتبار کو اپنے خاص انداز میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے؛

اندریں رہ می تراش و می خراش — تادمِ آخر دمے فارغ مباش

تادمِ آخر دمے آخر بود — کہ عنایت با تو صاحب سر بود

دوست دارد دوست ایں آشفتگی — کوششِ بیہودہ بہ از خفتگی!

کارکے کن تو تو کاہل مباش — اندک اندک خاک چہ را می تراش

چوں زچاہے می کنی ہر روز خاک | عاقبت اندر رسی در آبِ پاک
چوں نشینی بر سرِ کوئے کسے! | عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

بہرحال مجاہد ہمت سے کام لیتا ہے، حق تعالیٰ نے اس کو جو اختیار دے رکھا ہے، اس کو استعمال کرتا ہے، اور عزمِ راسخ رکھتا ہے کہ جب تک گوہرِ مقصود ہاتھ نہ آئے قلب کا تزکیہ، روح کا تجلیہ نہ ہو جائے، وہ دم نہ لیگا، اور حقِ مجاہدہ ادا کریگا، ولولہ انگیز طریقے سے ہر قدم پر وہ گنگناتا جاتا ہے۔

دست از طلب ندارم تا کارِ من برآید
یا تن رسد بجاناں یا جان زتن برآید

کامیابی و فتحمندی اس مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے کَانَ حَقًّا عَلَیۡنَا نَصۡرُ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ کا وعدہ اس سے متعلق ہے! ہدایت کے راستے کھل جاتے ہیں لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا کا قول پورا ہوتا ہے۔

مجاہدہ بیوی بچوں کا چھوڑنا، راتوں میں کم سونا، فاقہ پر فاقہ کرنا حقوقِ نفس کو تلف کرنے کا نام نہیں، مجاہدہ "حقوقِ نفس" کا ادا اور غیر شرعی "حظوظِ نفس" کا ترک کرنا ہے، مجاہدہ قلب کا تصفیہ ہے، روح کا تجلیہ ہے، اس کا بہترین طریقہ خیالاتِ فاسدہ کا دماغ سے تخلیہ ہے، جو شخص اپنے قلب و دماغ میں فاسد خیالات کے بجائے پاک خیالات کو سلبی افکار کے بجائے ایجابی افکار کو جگہ دیتا ہے، وہ اعمالِ سیئہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے، اس کے لیے امتثالِ مامور، اجتنابِ محظور، اور رضا بہ مقدور آسان ہو جاتے ہیں، جو عارفِ اعظم شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے الفاظ میں دین کا خلاصہ ہیں[1]!

ایجابی خیالات میں سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جو سرچشمہ ہیں تمام محامد و محاسن کا، تمام خوبیوں اور نیکیوں کا، جو مبدء ہیں طمانیت و سرور کا، علو و

---

[1] فتوح الغیب مقالۂ اول۔

Marfat.com

بلندی کا، قوت وعزت کا، اگر تم اپنے قلب کو تمام سلبی خیالات سے خالی کر کے حق تعالیٰ کے خیال کو اس میں جمانے کی کوشش کرو گے تو چند روز میں پاؤ گے کہ یہ تمام صفات مقید پیمانہ میں تم میں خود ظاہر ہو رہی ہیں، نفسیات کا یہ عام قانون ہے کہ آدمی جس چیز کے خیال اور دھن میں رہتا ہے، رفتہ رفتہ اسی کی خو بو اس میں پیدا ہونے لگتی ہے، یا نفسیاتی زبان میں یوں کہو کہ اس کا جو معروضِ فکر ہوتا ہے وہی وہ بھی بن جاتا ہے! اس قانون کو جان کر اور مان کر تم ہرگز سلبی خیالات پر فکر و توجہ کو زیادہ مرکوز نہ کرو گے، ایجابی خیالات ہی کو جمانے اور بسانے کی کوشش کرو گے، اب ہم عارف روم کے الفاظ میں پوچھتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے بہتر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے جس سے تم ایک لحظہ کے لیے حقیقی معنی میں خوش رہ سکتے ہو۔

کیست زو بہتر بگو اے ہیچ کس　　　تابداں دلشاد باشی یک نفس؟

اگر تمہیں چشم بصیرت ملی ہے، اور تم عارف روم کے ساتھ اتفاق کرتے ہو تو پھر کیا حق تعالیٰ کی دھن سے بہتر اور کسی کی دھن ہو سکتی ہے؟ اب دن کا زیادہ حصہ اسی دھن میں گزارو، گفتار کو چھوڑ کر اسی کار بزرگ میں لگ جاؤ، رفتہ رفتہ جامی سامی نے جو کہا تھا، اس کا تم کو تحقق ہونے لگیگا ؎

گر در دلِ تو گل گزرد گل باشی　　　در بلبلِ بے قرار بلبل باشی

تو جزوی و حق کل است اگر روزی چند　　　اندیشۂ کل پیشہ کنی کل باشی

جو چیز تم کو خود تجربہ سے معلوم ہو جائیگی اس کا ذکر ہم کیا کریں، لیکن تحریص کے لیے اتنا کہنا کافی ہے، کہ تم پر سرور اور فرح کے دروازے کھل جائیں گے، اطمینانِ قلب، جو دنیا کی کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا ہے وہ نقد دم ہوگا اور اس آیۂ کریمہ کا اپنی ذات کو مصداق پاؤ گے۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي　　　اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا پھر چل اپنے

Marfat.com

اِلٰی رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِیْ رب کی طرف تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی

فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری

(پ ۳۰ ع ۱۴) بہشت میں۔

نفسِ مطمئنہ کا حصول، رضائے الٰہی کا تحقق، جنت ذات میں دخول، یہ نتائج ہیں اس مجاہدہ کی تکمیل کے! جو لذت کہ حق تعالیٰ کی یاد میں ہے، جو مستی اس کی یافت وشہود سے حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلہ میں "لذاتِ جہاں" ہیچ ہیں، جامیؔ اس ذوق و مستی کو اس والہانہ انداز سے ادا فرماتے ہیں:۔

کلے بلبلِ جاں مست بیادِ تو مرا   وے پایۂ غم پست بیادِ تو مرا

لذاتِ جہاں را ہمہ در پا فگند   ذوقیکہ دہد دست بیادِ تو مرا

حق تعالیٰ کی یاد کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کا ذکر زبان پر جاری رہے، فَاذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا۔ پر عمل ہو، اٹھتے بیٹھتے یہی مشغلہ ہو، اس سے مقصود رضا و قرب الٰہی ہو جب تمہاری توجہ ذکر کی وجہ سے خرافاتِ دنیوی سے ہٹ کر ایک نکتہ پر مرکوز ہوگی، تو خود بخود فاسد، سلبی پریشان کن خیالات و وساوس کا دروازہ بند ہو جائیگا، اور جونہی خیالات کی یہ پراگندگی موقوف ہوئی ایک روحانی کیف و طمانیت سے تمہارا قلب مملو ہو جائیگا! اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ کے یہی معنی ہیں، ذکر کا قیام مشق اور مجاہدہ سے آہستہ آہستہ ہوتا جاتا ہے، اور ذہول و غفلت کا ارتفاع ہو جاتا ہے۔ اس دولت کے حاصل ہو جانے کے بعد تم تمام چیزوں سے غنی ہو جاتے ہو، نہ کسی چیز کے حصول سے تمہیں لذت ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کے ضائع ہونے سے رنج! لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ کے مصداق ہونے لگتے ہو، اللہ کو رکھ کر تمہیں کسی چیز کی خواہش نہیں رہتی، تم عارفِ روم کے الفاظ میں کہنے لگتے ہو:۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست   تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

Marfat.com

یاد کے قائم کرنے کا ایک اور آسان گر ہم تمہیں بتلاتے ہیں، یہ تو تم مانتے ہو کہ ہر شے کے خالق حق تعالیٰ ہیں، شے ان کی مخلوق ہے، ہمارا رات دن سابقہ ان ہی اشیاء سے ہوتا ہے، یہی ہمارے دل اور دماغ میں بسی ہوئی ہیں، انہی کی محبت سے ہمارے قلوب بھرے ہوئے ہیں، چونکہ یہ فانی اور گریز پا ہیں، ان کا زوال اور ان کی فنا پذیری ہمارے غم و حزن کا باعث ہوتی ہے، اب قانونِ ایتلاف ذہنی کی رو سے یہ ممکن ہے کہ مخلوق کو دیکھ کر خالق کی طرف ذہن منتقل ہو جائے، تم یہی کوشش کرتے رہو کہ شے کو دیکھ کر تمہارا خیال شے کے خالق کی طرف جائے، اس طرح تمہیں ہر طرف حق تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آئیگا، اور اینما تولوا فثم وجہ اللہ کے معنی کا ابتدائی فہم حاصل ہونے لگے گا۔ شئی کی سلبی جہت سے توجہ ہٹ کر جہتِ حق کی طرف مرکوز ہو جائیگی۔ اور اس طرح یاد قائم ہونے لگیگی، تمہارا معروضِ فکر اب شے نہیں حق ہوگا، اور ان تمام انوار سے تمہارا قلب معمور ہونے لگیگا جو وجہ اللہ کی طرف رُخ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس طریقہ سے تمہیں بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ سعادت و مسرت کا سرچشمہ خود ہمارا قلب ہے، حق تعالیٰ کی جلوہ گاہ خود ہمارا قلب ہے، آفاق میں حق تعالیٰ ظاہر ہیں ہر شئے کے ساتھ جہتِ حق موجود ہے، صحیح علم کے استعمال سے وہم اور التباس دور ہوا اور نظر کی اصلاح ہوئی، نقطۂ نظر بدلا، معلوم ہوا کہ انفس و آفاق میں حق تعالیٰ نہاں وعیاں ہیں، انہی سے تعلق قائم کرنا، انہی کی یاد کا جمانا تمام مسرتوں اور سعادتوں کا حاصل کرنا ہے، ان سے غفلت اور ذہول اور خلق میں استغراق اور فنائیت تمام بلاؤں اور آفتوں میں گرفتار ہونا ہے مَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ يَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا جو کوئی اپنے رب کی یاد سے منہ موڑتا ہے، چڑھتے عذاب میں ڈال دیا جاتا ہے (پ ۲۹ ع ۱۱)

اسی مفہوم کو رومی کے دل نشین الفاظ میں یاد رکھو:۔

گر گریزی بر اُمیدِ راحتے　　　ہم ازانجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست　　　جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

حق تعالیٰ کو چھوڑ کر خلق میں محویت، خواہ بظاہر وہ کیسی ہی دلفریب اور دل کش نظر کیوں نہ آئے نور کو چھوڑ کر ظلمت میں گرفتار ہونا ہے، اور ظلمت سے ضیق، غم و حزن و خوف کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے، ظلمت میں چیزیں اپنے صحیح خد و خال میں کہاں نظر آتی ہیں، کسی شے کا حسن و جمال تاریکی میں کیا دکھائی دیگا! پھر تمہاری نظر میں اشیا کی یہ دلفریبی تمہارے نفس کا دھوکہ ہے، التباس ہے، تمہارا واہمہ بھی تو خلاق ہے کیسی کیسی دلربا صورتیں یہ تمہاری خوشی کے لیے پیدا کرتا ہے، ان سے تمہیں بھی لذت حاصل ہوتی ہے، تھوڑی ہی دیر بعد غم کا سایہ تمہارے قلب پر چھا جاتا ہے، ابھی اعتماد ہوتا ہے، ذرا دیر بعد خوف کا زبردست حملہ ہوتا ہے، اور تم کانپ اُٹھتے ہو، تمہاری طبیعت میں استقلال نہیں، استحکام نہیں، تمہاری کوئی پناہ گاہ نہیں! اگر تم اپنی غفلت سے جاگ اُٹھو، اگر تمہاری چشمِ بصیرت کھل جائے، اور نور اور صداقت کی دنیا نظر آنے لگے، تو تمہیں اشیاء ویسی ہی دکھائی دینے لگینگی جیسی کہ وہ ہیں، اب تم کو حیاتِ طیبہ نصیب ہوگی۔ طمانیت و بردِ قلبی حاصل ہوگی، خوف و حزن زائل ہو جائیگا، استقلال و استحکام عطا ہوگا، اور حق تعالیٰ کے اس وعدہ کا ایفا ہوگا:

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ أَوْ أُنْثَىٰ وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهُ حَيَاةً طَيِّبَةً (پ ۱۴ ع ۱۶)　　جس نے نیک کام کیا، مرد ہو یا عورت، اور وہ ایمان پہ ہے تو ہم اس کو زندگی دینگے ایک اچھی زندگی،

یادِ حق کو قائم کرنے، تمہارا رخ ظلمت سے نور کی طرف پھیرنے، مجاہدہ کے راستہ کو آسان کرنے، خلق سے توڑنے اور حق سے جوڑنے میں نیکوں کی صحبت عجیب و غریب اثر رکھتی ہے، صحبت کا اثر نفسیات کا ایک مسلّمہ اصول [۱] ہے، ہر فرد میں بے سوچے سمجھے ہر قسم کے قضایا کو قبول کرنے

[۱] ومثل جليس الصالح كمثل صاحب المسك ان لم يصبك منه شيء اصابك من ريحه ومثل جليس السوء كمثل صاحب الكير ان لم يصبك من سواده اصابك من دخانه (ابو داؤد ونسائی عن انس رض).

نیک ہمنشین کی مثال مشک والے کی سی ہو اگر تجھے اس سے کچھ نہ ملے تو خوشبو تو ضرور پہنچیگی اور بُرے ہمنشین کی مثال لوہار کی بھٹی کی سی ہے، اگر اس کی سیاہی تجھ کو نہ لگے تو دھواں تو ضرور پہنچیگا۔

کی استعداد یا صلاحیت پائی جاتی ہے، جب یہ قضایا خود اپنے ذہن کے اندر سے وصول ہوتے ہیں، تو اس کو جدید نفسیات کی اصطلاح میں "خود ایعازی" (AUTO SUGGESTION) کہا جاتا ہے۔ اور جب کسی خارجی ذریعہ سے حاصل ہوں تو "غیر ایعازی" (HETERO-SUGGSTION) کہا جاتا ہے، رات دن ہم خود ایعازی اور غیر ایعازی کے اثر کے تحت خیالات کو قبول کر رہے ہیں، اور ان کو جزوِ ذہن بنا رہے ہیں، اگر سلبی یا اضلالی افکار غیر ایعازی قوت کی وجہ سے ہمارے قلب میں جگہ پا رہے ہیں، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بُری صحبت میں ہیں، اور ان کے تیقنات و افعال کی نقل کر رہے ہیں، اور اضطراری طور پر ان سے متاثر ہو رہے ہیں، ان کے سمّی اثرات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم صحبتِ ناجنس سے قطعی احتراز کریں ؎

زاحمقاں بگریز چوں عیسیٰ گریخت
صحبتِ احمق بسے خونہا بریخت

سلبی اثرات سے اس طرح بچ کر ایجابی اور ہدایتی علم کے لیے نیکوں کی صحبت کی تلاش کرنی چاہیئے، اہل اللہ کی زبان سے حاصل کیا ہوا علم اپنے اندر خاص اثر و قوت رکھتا ہے، وہ قلب کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے، یقین و اذعان کی شکل اختیار کر لیتا ہے، علمِ حق کو شیخ اکبر محی الدین عربیؒ نے علم "اذواق" قرار دیا ہے، اور فرماتے ہیں کہ علم الحق علم الاذواق لا عن الاوراق وھو العلم الصحیح وما عداہ فحدث و تخمین لیس العلم اصلاً یعنی علمِ حق ذوق و وجدان سے حاصل شدہ علم ہے، محض کتابوں سے حاصل کردہ نہیں، اور یہی علمِ صحیح ہے، باقی اٹکل پچو، مطلق علم نہیں، شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کا علم قیاسی نہیں، مبدءِ نبوت سے اخذ کردہ ہے، قطعی و یقینی ہے، حقیقی و واقعی ہے، اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ خود ان کے معلم ہو گئے ہیں، اور اب وہ براہِ راست اسی مبدء سے علم حاصل کرنے لگتے ہیں، اِتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ[1] اس پر دلیل ہے، اسی لیے ایک

[1] اللہ سے ڈرو وہ تمہیں علم دیتے ہیں۔

Marfat.com

دوسرے رازداں کی نصیحت ہے کہ خذ العلم بافواہ رجال اللہ، لا من الصحائف والدفاتر مردانِ حق کی زبان سے علم حاصل کرو، کتابوں اور دفتروں سے نہیں، کیونکہ ان کتابوں میں قیاس و تخمین اور ظن و رائے کے سوا کیا رکھا ہے۔ اہل اللہ کی صحبت خاک کو کیمیا کرتی ہے، ان کے افعال و اعمال ان کے افکار و خیالات رفتہ رفتہ قلوب کے زنگ کو دھوتے جاتے ہیں، اور تم غیر شعوری طور پر نیکی کی طرف مائل ہوتے جاتے ہو، اور بدی سے مجتنب اور محترز، اور بالآخر ظلمت سے نکل کر نور کی طرف تمہارا منہ ہو جاتا ہے، عارفِ روم نے صحبتِ مردانِ حق کے اثرات کو یوں بیان فرمایا ہے۔

خواہی کہ دریں زمانہ فردے گردی	یا در رہ دیں صاحبِ دردے گردی
ایں را بجز از صحبتِ مرداں مطلب	مردے گردی چو گردِ مردے گردی

یہ کُونُوا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ کے حکم کے پنہاں فائدوں کی اجمالی توضیح ہے۔

سیرت سازی کے قرآنی اصول کی اوپر جو توضیح پیش کی گئی، اس کو اجمالاً ایک دفعہ پھر دہرا لیجیے اذا تکرر تقرر، تکرار سے چیزیں زیادہ دلنشین ہوتی ہیں، سیرت کی عمارت کا سنگ زاویہ لا الٰہ الا اللہ پر پختہ یقین و اذعان ہے، تمام انبیاء کا اپنی قوم کو یہی پیغام تھا کہ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ اے قوم اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود و رب نہیں، اللہ ہی لائقِ عبادت ہیں استعانت انہی سے کی جانی چاہیے میرا سر انہی کے سامنے جھک سکتا ہے، غیر کے سامنے نہیں اس بنیادی عقیدہ کا زبان سے اظہار اور قلب سے اقرار ضروری ہے، زبان سے باربار کی تکرار یقین کو پختہ کرتی ہے جس قدر یقین میں پختگی ہو گی اسی قدر عمل میں سہولت ہو گی، یقین میں شدت پیدا کرنے کے لیے غور و فکر، تدبر و مراقبہ ضروری ہیں، یقین اس شدت کا پیدا ہو جائے کہ شک و شبہ کی مطلقاً گنجائش نہ رہے، تم جانتے ہو کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے تمہارا ہاتھ جل جائیگا اسی طرح تمہیں توحید فی المعبودیت و توحید فی الربوبیت کا یقین ہو جانا چاہیے، ذلت (جو عبادت

کی اصل ہے، حق تعالیٰ ہی کے سامنے اس کا ظہور ہو سکتا ہے، جو ہمارے مالک ہیں حاکم ہیں، مولیٰ ہیں، خالق ہیں، رب ہیں، وکیل و نصیر ہیں، حق تعالیٰ ہی نافع و ضار ہیں، مُعِز و مُذِل ہیں، حاجت و مراد سوا ان کے کوئی پوری نہیں کر سکتا! اسی لیے انہی کے سامنے دستِ سوال دراز ہو سکتا ہے، کسی اور کے سامنے ہرگز نہیں، زبان پر یہ دعا جاری رہے اور قلب میں اس کا مفہوم متمکن۔

اَللّٰھُمَّ کَمَا صُنْتَ وُجُوْھَنَا اَنْ تَسْجُدَ لِغَیْرِکَ فَصُنْ اَیْدِیَنَا اَنْ تَمْتَدَّ بِالسُّؤَالِ لِغَیْرِکَ۔ الٰہی جس طرح تو نے ہمارے چہروں کو غیر کے آگے سجدہ کرنے سے بچالیا، اسی طرح ہمارے ہاتھوں کو اپنے غیر کے آگے سوال کرنے سے بچائے رکھ۔

اس عقیدہ اور یقین کا شخص اپنے ہم جنسوں کے آگے کیسے خود کو ذلیل کر سکتا ہے، اس کی سیرت غلاموں کی سی کیسے ہو سکتی ہے، وہ نفع و ضرر کی توقع غیر اللہ سے کب رکھ سکتا ہے، اور اپنی عزت اس وہمی نفع و نقصان کی خاطر کیسے بیچ سکتا ہے، مجاہدا اسی یقین اساسی کو پختہ کرتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ خواطر کی نگہبانی کی جائے، سلبی اور اضلالی علم کو ایجابی و ہدایتی علم سے بدلا جائے قانونِ تقطیبِ افکار (Law of the Polarisation of thought) نفسیات کا ایک مسلّمہ قانون ہے، اسی قانون کے استعمال سے اضلالی علم ہدایتی علم میں مبدل کیا جاتا ہے، نہ صرف یہ بلکہ ایجابی خیالات ہدایتی افکار کو ذہن میں ہمیشہ جمانے کی کوشش کرنی چاہیے، اور سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے، جب یہ قلب پر چھا جاتا ہے، تو قلب تمام ظلمتوں سے پاک ہو جاتا ہے، نورانی ہو جاتا ہے، نور ہو جاتا ہے، اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ نُوْرًا کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ سرور و طمانیت ہے، مسرت و سعادت ہے جو پاک سیرت کی لازمی خصوصیت ہے، نیک سیرت شخص مسرور و مطمئن ہوتا ہے، اس کی جان، اس کا تن راحت میں ہوتا ہے، وہ قطرۂ نور ہوتا ہے، یہ روحانی مسرت ہے، جو طبعی غم و حزن میں باقی رہ سکتی ہے۔ اَلَا اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَکَانُوْا

Marfat.com

یَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمَاتِ اللّٰہِ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ۔ (پ ۱۱ ع ۱۱)

قوتِ ایمانیہ وظہورِ غیب

چشم بگذشتہ ازیں محسوسہا | یافتہ از غیب بینی بوسہا
خود نمی یابم یکے گوشے کہ من | نکتہ گویم ازاں چشمِ حسن

مدتوں ہم اس خیال میں رہتے ہیں کہ ہمیں "صداقت" کا علم ہے، لیکن یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا، کہ کیوں صداقت کے وہ آثار ہماری زندگی میں نمایاں نہیں ہوتے جن کو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے الفوز فی القضا امورِ تکوینی میں کامیابی وکامرانی نزل الشہداء، ایسی اعلیٰ قسم کی میزبانی جیسی کہ شہیدوں کی جنت میں ہوگی، عیش السعداء، سعیدوں کا سا عیش، النصر علی الاعداء، دشمنوں پر فتح کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے؟ کیوں رحمت کے وہ آثار ظاہر نہیں آتے، جن سے ہمارے دل کو ہدایت ہو (تھدی بھا قلبی) ہمارے کاموں میں جمعیت ہو (تجمع بھا امری) ہماری ابتری دور ہو، اور ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائیں (تلم بھا شعثی) ہمارا دین سنور جائے (تصلح بھا دینی) ہمارا قرض ادا ہو جائے (تقضی بھا دینی) ہماری نظر سے غائب چیزوں کی نگہبانی ہو (تحفظ بھا غائبی) ہمارے پیشِ نظر چیزوں کو بلندی عطا ہو (ترفع بھا شاھدی) ہمارا چہرہ نورانی ہو جائے (تبیض بھا وجھی) ہمارا عمل پاکیزہ ہو جائے (تزکی بھا عملی) رشد وہدایت کا ہمارے قلب میں الہام ہو (تلھمنی بھا رشدی) حق تعالیٰ کے ساتھ ہمارے فطری جذباتِ الفت از سرِ نو پیدا ہو جائیں (ترد بھا الفتی) اور ہر برائی سے بچے رہیں (تعصمنی بھا من کل سوء)

شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا علم یقینِ صادق کے درجہ کا نہیں، یا پختہ یقین نہیں، اور وہ ایمان ہمیں حاصل نہیں جو ہمارے دل میں پیوست ہو گیا ہو، جس کے مانگنے کی ہدایت ان الفاظ میں

Marfat.com

کی گئی ہے :-

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ اِيْمَانًا يُبَاشِرُ قَلْبِيْ وَيَقِيْنًا صَادِقًا الخ — اے اللہ میں تجھ سے وہ ایمان مانگتا ہوں جو میرے دل میں پیوست ہو جائے اور پختہ یقین الخ

ہمیں علم ویقین کی وہ کیفیت حاصل نہیں جس کے پیدا ہو جانے کے بعد حضرت مسیح کے الفاظ میں حریتِ تامہ حاصل ہو جاتی ہے!

ہم میں سے اکثر ایک ایسے سادہ طریقہ کی تلاش میں اپنی مختصر زندگی کے دن گزار دیتے ہیں، جس کا حصول اور جس پر مداومت ہمیں ایمان کے ان آثار و برکات سے مالا مال کر دے، جن کا اوپر ذکر ہوا، ہمیں ایک ایسی چیز کی تمنا ہے، جو ایمان کو ہمارے قلوب میں پیوست کر دے، وہ پختہ یقین عطا کرے جس سے ایک بڑی تعداد محروم ہے، اور جس کے حاصل ہو جانے کے بعد ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائیں، ہمارا چہرہ نورانی ہو جائے اور ہمارا عمل پاکیزہ ہو جائے، اور تمام امور میں کامرانی و کامیابی نصیب ہو!

یقیناً ایک ایسا سادہ طریقہ موجود ہے، اور وہ اتنا سادہ اور سیدھا طریقہ ہے کہ اکثر تو اس کو جان کر بھی اس پر عمل کرنا نہیں چاہتے! بعض کا تو یہ عقیدہ ہے کہ زندگی میں پریشانیوں سے نجات اور جمعیتِ خاطر کا حصول ناممکن ہے! ان کا خیال ہے کہ :-

'آدم' از کثرتِ پریشانی — می کند جستجوئے جمعیت
آدم آمد سہ حرف وہر سہ جدا — نشود جمع تا دمِ میت

بعض کا خیال ہے کہ یہ طریقہ پایا تو جاتا ہے، لیکن وہ ایک رازِ نہفتہ ہے، اس تک ان کی رسائی ممکن نہیں، وہ رازِ سینہ ہے، سفینہ پر نہیں ملتا، اور اس راز کے جاننے والے کالمعدوم ہیں! بعض سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ سخت مشکل ہے، اس پر عمل ناممکن ہے! یہ ہر شخص کے بس کی چیز نہیں الفاظ یا تعبیرات کی کثرت نے اس کو چھپا رکھا ہے اور دلائل کی کثرت نے اس کا ادراک مشکل کر دیا ہے۔

از دلائل می شود مشکل بما ادراکِ حق!! — ایں رہ از بسیاریِ سنگِ نشاں ہموار نیست!

حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ موجود ہے اور وہ اتنا سادہ ہے کہ بچے بھی اس کو سمجھ سکتے ہیں، بوڑھی خواتین بھی سمجھ سکتی ہیں! الہامی صداقتوں کو سمجھنے کے لیے ہمیں بچوں کی طرح سلیم فطرت بن جانا چاہیے، اسی وقت ہم میں وہ شعور پیدا ہوتا ہے، جس کی بیداری کے بعد ہمیں کامل حریت نصیب ہوتی ہے! یہ طریقہ مختصر الفاظ میں یہ ہے:۔

۱۔ ہمیں حق تعالیٰ کی ان ظاہری و باطنی نعمتوں اور عنایتوں کو یاد کرنا چاہیے، جو ہماری پچھلی زندگی میں ہم پر کی گئیں، اور ان پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

۲۔ ہمیں حق تعالیٰ کی ان آئندہ نعمتوں اور عنایتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے!

اس اجمال کی تفصیل ضروری ہے:۔

۱۔ ایمان ان اشیاء کا جوہر ہے جن کی ہم حق تعالیٰ سے امید رکھتے ہیں، اور ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہے جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، حق تعالیٰ پر ایمان، ان سے حُسنِ ظن، ان سے اُنس و محبت مومن کا طرۂ امتیاز ہے: اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ اس ایمان حسن ظن، انس و محبت ہی سے وہ تمام نعمتیں جو ابھی پردۂ غیب میں ہیں، خارج میں ظاہر ہوتی ہیں، یہ وہ پل ہیں جن سے گزر کر حق تعالیٰ کی نعمتیں مومن تک پہنچتی ہیں، اس راز کو عارف رومی نے یوں فاش کیا ہے:۔

آں کرشمہ اُنسش بشاہِ فرد خویش   یافت در ماہہائے جملہ درد خویش

ایمان اور اُنس مسلسل شکر و حمد سے قوی ہوتا ہے، جب ہمارے قلب میں ان نعمتوں، راحتوں عنایتوں اور احسانوں کا احساس موجود ہوتا ہے، جو حق تعالیٰ نے ہم پر ہماری پچھلی زندگی میں کی ہیں، ہم اس احساس کو تازہ کرکے ان نعمتوں کی جزئیات و تفصیلات پر نظر کرکے چیخ اٹھتے ہیں:

بے لطفِ تو من قرار نتوانم کرد   احسان ترا شمار نتوانم کرد
گر برتنِ من زباں شود ہر موئے   یک شکرِ تو از ہزار نتوانم کرد

(ابو سعید صمنہ رح)

بجائے پچھلی زندگی کی مصیبتوں اور بلاؤں پر شعور کو مرکوز کرنے کے ہمیں یاد کرنا چاہیے کہ کس طرح حق تعالیٰ نے پچھلے زمانہ میں ہمیں خوف و حزن سے نجات بخشی، غم و مصیبت سے آزادی مرحمت فرمائی، مرض والم سے شفا عطا کی! ہمیں ان موقعوں کو یاد کرنا چاہیے، جن میں حق تعالیٰ کی کارسازی و بندہ نوازی نے ہماری جان کو آرام بخشا اور ضیق و پریشانی سے نجات دی، غم و مصیبت کی بے پناہ قوتوں نے ہمارے ضعیف جسم کو تباہ کرنا چاہا تھا، اور شر کی تباہ کن طاقتوں نے ہماری روح کے شیرازہ کو منتشر کرنا چاہا تھا، لیکن حق تعالیٰ کے کرم نے ہماری حفاظت کی، ان کے احسان نے ہمیں تباہی سے بچالیا!

کجا لبِ صدف و شکر ابر نیسان ست! کہ از شمار بروں قطرہ ہائے باراں ست! (حافظ)

ہاں ہم اپنے احسان مند قلب کی گہرائیوں سے حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ یہ سب کام اللہ تعالیٰ ہی کے تھے، ہماری حول و قوت کو اس میں کچھ دخل نہ تھا، لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ! جب ہم شکست خوردہ دل سوختہ تھے ان کی ربوبیت نے ہماری دستگیری فرمائی جب ہم برگشتہ و پریشان تھے ان کی رحمت نے ہمیں راہ دکھائی! جب ہم غلط راہ پر پڑ لیے تھے، ان کی حکمت نے ہدایت کی طرف ہماری رہبری کی، جب ہم غم و مصیبت، خوف و حزن میں مبتلا تھے، اُن کے فضلِ عمیم نے ہمیں سنبھالا!

اے خدا قربانِ احسانت شوم این چہ احسان است قربانت شوم!

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ کَمَا یَنْبَغِیْ لِجَلَالِ وَجْھِکَ وَعَظِیْمِ سُلْطَانِکَ!

ہر روز کچھ دیر کے لیے ہمیں اپنی گزشتہ زندگی کے ان تجربوں کو تازہ کرنا چاہیے، جب کہ حق تعالیٰ نے ہماری خاص طور پر مدد فرمائی، اور ہمارے لیے نجات کا سامان فراہم کیا ہم میں سے ہر ایک کی زندگی میں ایسے تجربات و واقعات ضرور گزرے ہیں جن کی یاد ہم تازہ کرسکتے ہیں، ہمیں انہیں یاد کرنا چاہیے ان پر حق تعالیٰ کا بہت بہت شکر ادا کرنا چاہیے! عارف حق شناس ہوتا ہے، غیر عارف ناسپاس!

عارف آں باشد کہ باشد حق شناس ہر کہ عارف نیست گردد ناسپاس (عطار)

Marfat.com

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کے احسانات کا یوں شکر ادا کیا ہے:-

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ بِمَا ھَدَیْتَنَا وَلَکَ الْحَمْدُ بِمَا اَکْرَمْتَنَا وَلَکَ الْحَمْدُ بِمَا سَتَرْتَنَا وَلَکَ الْحَمْدُ بِالْقُرْاٰنِ وَلَکَ الْحَمْدُ بِالْاَھْلِ وَالْمَالِ وَلَکَ الْحَمْدُ بِالْمُعَافَاۃِ وَلَکَ الْحَمْدُ حَتّٰی تَرْضٰی وَلَکَ الْحَمْدُ اِذَا رَضِیْتَ یَا اَھْلَ التَّقْوٰی وَاَھْلَ الْمَغْفِرَۃِ!

تیرے ہی لیے حمد ہے اس پر کہ تو نے ہمیں ہدایت دی اور تیرے ہی لیے حمد ہے، اس پر کہ تو نے ہمیں عزت دی اور تیرے ہی لیے حمد ہے کہ تو نے ہماری ستر پوشی کی، اور تیرے ہی لیے حمد ہے قرآن پر، اور تیرے ہی لیے حمد ہے اہل و مال پر اور تیرے ہی لیے حمد ہے درگزر کرنے پر، اور تیرے ہی لیے حمد ہے یہاں تک کہ تو خوش ہو جائے، اور تیرے ہی لیے حمد ہے جب کہ تو خوش ہو جائے اے وہ جس کی ذات سے ڈرنا چاہیے (ڈرنے کے قابل بس تیری ہی ایک ذات ہے) اے وہ کہ تو ہی مغفرت کر سکتا ہے۔

ان ہی انعامات پر جو ہماری پچھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ہم پر کیے ہیں ہمیں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

نحمد اللہ خالق الاشیاء نشکر اللہ رازق الاحیاء (مظہر الحق)

یاد رکھو ایسا کرنے سے ہمارا ایمان مضبوط ہوتا ہے، ہمارا قلب یقین کے نور سے لبریز ہو جاتا ہے اور ہم حق الیقین کے طور پر جاننے لگتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہر حال میں ہمارے لیے کافی ہیں، ہمارے قلب کی گہرائیوں سے یہ چیخ نکلتی ہے۔

اللہ الکافی، کافی! قصدت الکافی وجدت الکافی

لکل کافٍ کافی کفانی الکافی ونعم الکافی وللہ الحمد!

ہمارا خوف دور ہو [illegible] ہی امیدیں جاگ اٹھتی ہیں، نور یقین ہمارے قلب کی تاریکی کو دور کر دیتا ہے اور ہم حق تعالیٰ کے قرب و معیت کی روشنی میں داخل ہو جاتے ہیں، اور ہمیں وہ شاندار آزادی حاصل ہوتی ہے جو مقربینِ بارگاہِ الٰہی کا حصہ ہے، وہ فرحت و سرور نصیب ہوتا ہے جس کو عیش السعداء

Marfat.com

سے تعبیر کیا گیا ہے؛ اور اسی سرور کی حالت میں ہم بیدل کی زبان میں گنگنا نے لگتے ہیں؛

تا مزرعِ سبز آسماں خواہد بود　　تا خرمی باغِ جہاں خواہد بود

ہر تخم کہ ریشہ بروں خواہد بود　　شکرِ کرم ترا زباں خواہد بود

حق تعالیٰ کے ان گذشتہ احسانات کا حمد و شکر کے ساتھ یاد کرنا وہ طریقہ ہے جس کو ہر زمانہ کے صلحاء و صدیقین نے اپنے ایمان کی قوت کے ازدیاد کے لیے ہمیشہ استعمال کیا ہے، اور اس حد تک کیا ہے کہ ان سے عجیب و غریب کرامات و خوارق عادات کا ظہور ہوا ہے، ان کی کامیابی کا یہی ایک راز تھا، اسی طریقہ نے قوتِ الٰہیہ کے دروازوں کو ان پر کھول دیا تھا، ان کو حق تعالیٰ کے قریب کر دیا تھا، اور حق تعالیٰ کو ان سے قریب، اس کی وجہ سے ان کے لیے ایسی چیزیں ممکن ہو گئی تھیں جو عام طور پر انسان کے لیے ممکن نہیں ہوتیں۔

دیکھو جب حضرت دانیال علیہ السلام کو بخت نصر نے ایک اندھے کنویں میں دو شیروں کے ساتھ قید کر دیا تھا تو انہوں نے کہا جاتا ہے کہ یہ دعا کی تھی:۔

الحمدُ لِلّٰہِ الّذی لا یخیب من دعا	حمد اس خدا کی ہو جو اپنے مانگنے والے کو محروم نہیں
والحمدُ لِلّٰہِ الّذی لا یکل من توکل	کرتا، حمد اس خدا کی ہو جو اس شخص سے نہیں تھکتا
علیہ الحمد لِلّٰہ الّذی ہو ثقتنا حین	جو اس پر بھروسہ کرے، حمد اس خدا کی ہو جو ہمارا آسرا
تنقطع عنا الحیل الحمدُ لِلّٰہِ الّذی	ہو جب ہماری تدبیریں منقطع ہو جاتی ہیں، حمد اس خدا
ھو رجاؤنا حین یسوء ظنونا باعمالنا	کی ہو جو ہماری تکلیف کے وقت ہماری مصیبت کو دور
الحمدُ للّٰہ الّذی یکشف ضرنا عند	کرتا ہو، حمد اس خدا کی ہو جو احسان کا بدلہ احسان سے
کربتنا، الحمد للّٰہِ الّذی یجزی	دیتا ہو، حمد اس خدا کی ہو جو صبر کا بدلہ نجات و
بالاحسان احساناً، الحمد للّٰہ الّذی	رستگاری سے دیتا ہے!
یجزی بالصبر نجاتاً،	(رواہ ابن ابی الدنیا وسندہ حسن)

یہ ساری دعا حق تعالیٰ کی حمد و ثنا سے بھری ہوئی ہو، اس کا ہر جملہ ان تجربوں کو حافظہ میں تازہ کرتا ہے

Marfat.com

جب کہ حق تعالیٰ کی خاص تائید ہمیں ہوئی تھی اور طوفانِ حوادث سے ہماری کشتی نکل آئی تھی اور ہماری زبان سے بے اختیار یہ جملے نکلے تھے۔

اللّٰھم لک الحمد شکراً ولک — اے اللہ تیرے ہی لیے ہر تعریف ہے، شکر کے ساتھ اور تیرا ہی

المنّ فضلاً انت ربنا حقاً — حصہ ہے، فضل و کرم کے ساتھ، بیشک تو ہمارا رب ہے، پالن ہار

ونحن عبیدک رقاً۔ — ہے اور ہم تیرے بندے ہیں، ناتوان و محتاج۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے مقابلہ کو چلے اور جب حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حنین کی لڑائی کے لیے نکلے، تو ان کی زبان پر حق تعالیٰ کی حمد و ثنا ہی جاری تھی۔

کنت وتکون وانت حیٌ لا یموت — تو ہے اور رہیگا، تو ایسا زندہ ہے جس کو موت نہیں!

تنام العیونُ وتنکدر النجوم وانت — آنکھیں سوتی ہیں اور ستارے بدلتے ہیں، تو زندہ اور

حیٌّ قیوم لا تاخذک سنۃ ولا — زندہ رکھنے والا ہے، تجھ کو اونگھ اور نیند نہیں چھو سکتی!

نومٌ یاحیّ یاقیوم! — یاحیّ یاقیوم!

یاد رکھو کہ حق تعالیٰ کی رحمت و رافت جو ہماری پچھلی زندگی میں ہمارے ساتھ رہی، وہ اب بھی ہم پر محیط ہے، وہی قوت جو گزشتہ زمانہ میں ہماری دستگیری کرتی رہی ہے، اب بھی ہماری مدد کر رہی ہے، وہی فضل عمیم جس نے اب تک ہمیں سنبھالا ہے، اب بھی ہمیں سنبھال رہا ہے۔

حق تعالیٰ اب بھی وہی ہیں، ان میں تغیر نہیں، وہ تغیر سے منزہ و ماورا ہیں، یہ امر واقعی کہ انھوں نے ہمیں گزشتہ زندگی میں بلاو غم سے نجات دی ہے، اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ وہ اپنے ہی عدم تغیر و عدم تبغر کی وجہ سے ہمیں ہرگز فراموش نہ کرینگے!

سعدیؒ اسی طریقہ کو جو ہم یہاں پیش کر رہے ہیں، اصولاً استعمال کرتے ہوئے حق تعالیٰ کے گزشتہ احسانات کو یاد دلاتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

فراموشت نہ کرد ایزد در آں حال — کہ بودی نطفۂ مدفون و مدہوش

روانت داد و عقل و طبع و ادراک — جمال و حسن و رائے و فکرت و ہوش

Marfat.com

دہ انگشتت مرتب کرد بر کف　　　دو بازویت مرتب ساخت بر دوش!

کنوں پنداری اے ناچیز ہمت　　　کہ خواہد کردنت روزے فراموش!

خوب سمجھ لو کہ صداقت جس وقت تک کہ وہ محض ایک ذہنی تعقل بنی رہتی ہے ہماری مدد کرنے سے قاصر ہوتی ہے، لیکن جب ہمیں اس کا تحقق ہوتا ہے وہ ایک ہمہ تواں قوت بن جاتی ہے، اب اہم بات جاننے کی یہ رہ جاتی ہے کہ صداقت کا تحقق کس طرح ہوتا ہے؟ یاد رکھو کہ جب ہم یہ یاد کرتے ہیں کہ ہماری پچھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ہم پر کیا کیا احسانات کیے ہیں، تو ہم اس صداقت کے تحقق کے قابل ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے جو کچھ اس کے پہلے کیا ہے وہ اب بھی کر سکتے ہیں، معاذ اللہ حق تعالیٰ کے ہاتھ کمزور نہیں ہو گئے ہیں کہ وہ ہماری حفاظت نہ کر سکیں اور ہمیں بچا نہ سکیں، اور نہ معاذ اللہ وہ بہرے ہی ہیں کہ سن نہ سکیں، وہ سمیع و بصیر، وہ علیم و قدیر ہیں، وہ ہر طرح کافی ہیں: اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ، کَفٰی بِاللّٰہِ وَلِیًّا وَّ کَفٰی بِاللّٰہِ نَصِیْرًا

اگر ہم حق تعالیٰ کے ان احسانات کو یاد کرتے رہیں، جو پچھلی زندگی میں ہم پر بارش کی طرح نازل ہوتے رہے ہیں تو ہمیں شدت سے اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کریں ان کے جملہ احسانوں کا، جملہ عنایتوں اور کرموں کا، نعمتوں اور رحمتوں کا، اب ہمیں ایسا کرنا چاہیے، اور خوب خوب کرنا چاہیے! وحی غیر متلو کے الفاظ میں ہمیں کہنا چاہیے:

اللّٰھم لک الحمد کالذی نقول، و	حق تعالیٰ آپ کے لیے کل حمد ہے جیسی کہ آپ فرماتے ہیں
خیرا مما نقول، اللّٰھم لک الحمد	اور اس سے بڑھ کر کہ ہم کہتے ہیں: حق تعالیٰ آپ ہی کے لیے
کلہ ولک الشکر کلہ، ولک الملک	تعریف ہے سب کی اور آپ ہی کے لیے شکر ہے سب کا، اور
کلہ، ولک الخلق کلہ، بیدک	آپ ہی کے لیے حکومت ہے سب کی، اور آپ ہی کے لیے ہے
الخیر کلہ، الیک یرجع الامر	مخلوق سب کی، آپ ہی کے ہاتھ میں بھلائی ہے سب کی
کلہ!	اور آپ ہی کی طرف امور رجوع ہوتے ہیں سب کے سب۔
الحمد للہ الذی کفانی وآوانی و	سب تعریف اس اللہ کو، جو مجھ کو کافی ہوا اور جس نے

اطعمنی وَسَقانِی وَالّذِی مَنّ عَلَیّ — مجھ کو ٹھکانا دیا، اور کھلایا اور پلایا، اور مجھ پر احسان اور
وافضل وَالّذِی اعطانی فاجزل — فضل کیا، اور مجھ کو مال و دولت دی اور بہت دی،
الحمد للہِ علیٰ کلِّ حال۔ — ہر حال میں اللہ کا شکر ہے۔
اَللّٰھم لک الحمدُ کما ینبغی لجلال — اے اللہ تیرے لیے ایسی تعریف ہو جو تیری ذات کی
وجھک وعظیمِ سلطانک۔ — بزرگی اور تیری بڑی بادشاہت کے سزاوار ہو!

اس طرح حمد و شکر ادا کرنے سے، تسبیح و تقدیس سے ہم میں ایک اعلیٰ شعور پیدا ہوتا ہے، ایک پختہ یقین، باطنی وثوق، براہِ راست وِجدان پیدا ہوتا ہے، جو عقلی علم یا تعقل سے ماوراء ہوتا ہے، اس کی کیفیت کا الفاظ میں ادا کرنا ممکن نہیں، ہمیں اس امر کا تحقق ہو جاتا ہے کہ جو کچھ بھی حق تعالےٰ نے اب تک کیا ہے وہ اب بھی کر سکتے ہیں۔

"اِنّہٗ عَلیٰ کُلِّ شَیْءٍ قدیرٌ و بالاجابۃ جدیرٌ، نعم الولی و نعم النّصِیر!"

۲۔ اب ہمیں جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کا جو زمین و آسمان کے خالق ہیں، جن کے ہاتھ میں سب کی بھلائی ہے، اور جن کی طرف سب امور رجوع ہوتے ہیں، ان نعمتوں کے لیے شکر ادا کریں، جن کی ہمیں اب حاجت یا ضرورت ہے، ہمیں اس پر ایمان ہے، ہمیں اس امر کا تحقق حاصل ہے کہ حق تعالیٰ ہر دشوار کو آسان کر سکتے ہیں، اُن کے لیے ہر دشواری کو آسان کر دینا آسان ہے (ان تیسیر کل عسیر علیک یسیر) پچھلی زندگی میں حق تعالیٰ نے ایسا کیا ہے اور اب بھی وہ کر سکتے ہیں، قطعاً کر سکتے ہیں، اس لیے ہم اُن کا شکر ادا کر رہے ہیں کہ اُنھوں نے ہماری دعا سُن لی، اس نعمت کا ظہور جس کی ہمیں حاجت ہے پردہ غیب سے قطعاً ہو رہا ہے، اور غیب میں تو وہ ظاہر ہو چکی، ہماری مراد وہاں ہمیں مل چکی، ہمارا ایمان اس لامتناہی قوت پر ہے جس کے لیے ہر دشوار آسان ہے، جس کے لیے ہر ناممکن ممکن ہے؛ اور ہم ان چیزوں کا جو ظاہر نہیں ہوئیں اس طرح ذکر کرتے ہیں گویا کہ وہ ظاہر ہو چکیں؛ اسی کی تاکید ہے ہمارے محبوب و مطاع صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی۔

اُدعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابۃ — تم دعا مانگو، اور تم کو اُس کے قبول ہونے کا یقین ہو۔

Marfat.com

حق تعالیٰ کا ایک نام مجیب بھی تو ہے، یعنی دعا اور سوال قبول کرنے والے، ان کا ارشاد ہے:

ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ — مجھ کو پکارو میں تمہاری دعا قبول کرلونگا۔

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ — جب کوئی مجھے پکارتا ہے، تو میں پکارنے والے کی بات کا جواب دیتا ہوں۔

من یدعونی فاستجیب لہ — کوئی مجھ سے دعا کرتا ہے کہ میں اس کی دعا قبول کروں

ما من مسلم یدعوا بدعاءٍ الا استجیب لہ — جو مسلمان کوئی دعا کرتا ہے، تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے۔

یہ اور اس طرح کی اور یقین آفرینیوں کے بعد اور خود اپنے ذاتی تجربہ کے بعد ہم دعا کے ساتھ ہی اجابت کی قبولیت کے یقین کے ساتھ حق تعالیٰ کا اس نعمت پر شکر ادا کرتے ہیں جس کی ہمیں حاجت ہو اور یقین رکھتے ہیں کہ یہ نعمت ہمیں حاصل ہو چکی ہے، گو کہ ابھی پردۂ غیب سے اس کا ظہور نہیں ہوا ہے۔

بات یہ ہے کہ عام آدمی چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنے سے پہلے نعمت کا ظہور ہو چکا ہو وہ ظہورِ نعمت کے بعد شکر ادا کرتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اس کی دعا اکثر موثر نہیں ہوتی، جو شخص نعمِ الٰہی کے لیے ہمیشہ دعا کرتا رہتا ہے اور حق تعالیٰ کا محض اس وجہ سے شکر ادا نہیں کرنا چاہتا کہ ابھی اس کی دعا کی قبولیت کے آثار و نتائج نہیں پیدا ہوئے ہیں، وہ ایمانِ کامل کی دولت سے محروم ہے، شکر گزار (شاکر) ذاکر (ذکار) مطیع و فرمانبردار، روح حق تعالیٰ کی نعمتوں اور عنایتوں کو اپنی طرف جذب کرتی ہے، تحمید و تسبیح ہم میں وہی شعور پیدا کرتی ہے جو ہم میں اس وقت خود بخود پیدا ہوتا، جب ہماری دعا قبول ہو چکی ہوتی!

ہم اپنا رُخ اس ذات کی طرف کیے ہوئے ہیں، جو "فاطر سماوات و ارض" ہے، اس کے ثنا خواں ہیں، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کر رہے ہیں، عرض کر رہے ہیں کہ حق تعالیٰ آپ خیرِ محض ہیں، رحمتِ مطلق ہیں، فکرِ تام ہیں، کمالِ مطلق ہیں، محسن ہیں، کرم و منعم ہیں مفضل ہیں، وہاب ہیں، نافع، رحمٰن و رحیم ہیں، مجیب ہیں، آپ ہمارے حالات میں کامل الٰہی تطابق پیدا کر رہے ہیں، یہ تطابق ہمارے

Marfat.com

تخیل، ہمارے منصوبوں سے کہیں زیادہ کامل ہے، ہم نے اپنی جانیں آپ کے سپرد کردی ہیں اور اپنا منہ آپ کی طرف کیا ہے، اور اپنا کام آپ کو سونپ دیا ہے۔ لا ملجاء ولا منجاء الا الیک!

اس دعا و شکر کے نتیجہ کے طور پر ہمارے شعور میں ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے، تاریکی دور ہو جاتی ہے اور قلب کی فضا نورانی ہو جاتی ہے، قلب مسرت سے بھر جاتا ہے، اطمینان، سکینہ، وقار، سرور کا مبدأ فیاض کی جانب سے مسلسل فیضان ہونے لگتا ہے، باطن انوار و کیفیتِ محبت سے لبریز ہو جاتا ہے، ہم جان لیتے ہیں کہ اب ہم حصارِ سلامتی میں ہیں، اور ہماری دعائیں عالمِ قدس میں پہنچ چکی ہیں، اب جو کچھ ہوگا، وہ خیر ہوگا! گو ابھی خارج میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے، معاملات ویسے ہی نازک ہیں لیکن ہمارا باطن یقین و مسرت سے پُر ہو جاتا ہے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ ایمان ان اشیاء کے وجود پر گواہی ہے، جن کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے، ایمان ان اشیاء کی حقیقت یا جوہر ہے، جن کی ہم حق تعالیٰ سے توقع کرتے ہیں۔

اس یقین و مسرت و سکینت کی وجہ سے ہم پھر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، ان کی حمد و ثنا کرتے ہیں، تسبیح و تقدیس میں مصروف ہو جاتے ہیں، اس نعمت کے لیے اس بخشش و فضل کے لیے جس کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے اور جس کا وقوع ابھی قریب نظر نہیں آتا، ممکن ہے کہ اس کا کچھ عرصہ کے لیے ظہور نہ ہو، وقوع نہ ہو، لیکن یہی عدمِ ظہور و عدمِ وقوع ہمیں اپنی قوتِ ایمانیہ سے کام لینے کا موقع عطا کرتا ہے کہ ہم اس یارِ "پسندیدہ" کے حمد و ثنا میں مشغول و مصروف رہیں، جس کے ہاتھوں میں سب کی بھلائی ہے، اور ہر چیز کا پورا اختیار ہے، فَسُبْحَانَ الَّذِي بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ!

جامی از یارِ پسندیدہ مبرید حاشا
کاں پسندیدہ جز کارِ پسندی نکند!

ہم شکر ادا کرتے ہیں، حمد و ثنا کرتے ہیں، اس نعمت پر بھی جس کا ابھی ظہور نہیں ہوا ہے لیکن جس کے متعلق ہمارا ایمان ہمیں یقین دلاتا ہے کہ یہ نعمت حق تعالیٰ نے ہمیں عطا کر دی ہے اور وہ

ظاہر ہونے والی ہے، کہا جاتا ہے کہ جب بارش کی دعا کے لیے لوگ جمع ہونے لگے، تو ایک بچی اپنی چھتری ساتھ لیے دعا میں شریک ہونے پہنچی، اس کو یقین تھا کہ بارش اب قطعاً ہوگی، ہمارا ایمان بھی اس معصوم جان کی طرح ہونا چاہیے کہ مبداء فیاض کی جانب سے وہ نعمت ہمیں قطعاً عطا ہوگی جس کا سوال ہم نے کیا ہے: جس قدر ہماری قوتِ ایمانی قوی ہوگی اسی قدر ہمارے تمام امور میں کامیابی و کامرانی نصیب ہوگی، اور ہماری ساری پریشانیاں سلجھ جائینگی، مومن اپنی قوتِ ایمانی ہی سے ہمیشہ کام لیتا ہے، اور کامراں ہوتا ہے۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس نعمت کا خارجی ظہور نہیں ہوتا، جب ایسا ہو تو یقین رکھو کہ یہ ہمیں ایک بہتر حالت کی طرف منتقل کرنے کے لیے ہو رہا ہے اور ہمیں حق تعالیٰ کی حکمت و رحمت کا عمیق علم عطا کرنا مقصود ہے، اس لیے بجائے حزن و یاس کے ہمیں حق تعالیٰ کی حمد و ثنا میں مصروف رہنا چاہیے، یہ ہمارے ایمان کی بڑی آزمائش ہے، اس خاص وقت کی دعا یہ ہے:-

اللّٰھم لك الحمد حمداً دائماً مع	اے اللہ حمد تیرے ہی لیے ہے۔ ایسی حمد کہ تیری ہمیشگی کے
دوامك ولك الحمد خالداً مع	ساتھ وہ بھی ہمیشہ رہے، اور تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی
خلودك ولك الحمد حمداً لامنتھیٰ	حمد کہ تیرے دوام کے ساتھ وہ بھی دائم رہے، اور
لہٗ دون مشیتك ولك الحمد	تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی حمد کہ اس کی انتہا تیری مشیت
لایرید قائلہ الا رضاك ولك	کے ادھر نہیں اور تیرے ہی لیے حمد ہے ایسی حمد کہ اس
الحمد حمداً عند کل طرفۃ عین	کے قائل کا مقصود تیری ہی خوشنودی ہے، اور تیرے
وتنفس، اللّٰھم اقبل بقلبی الیٰ	ہی لیے حمد ہے ایسی حمد جو ہر پلک جھپکانے اور ہر سانس
دینك واحفظ من ورائنا	لینے کے ساتھ ہو، اے اللہ میرے دل کو اپنے دین کی
...... ثبتنی ان	طرف متوجہ کردے اور ہماری حفاظت ہمارے اوپر سے رکھ
اول واھدنی ان اضل	اپنی رحمت کے ساتھ، اے اللہ مجھے ثابت قدم رکھ کہ کہیں

ہم اس دعا میں مصروف رہتے ہیں حق تعالیٰ کی ثنا و حمد میں مشغول رہتے ہیں، یہاں تک کہ ہمیں اس کی پرواہ نہیں رہتی کہ مصیبت سے نجات کا سامان پردۂ غیب سے ظاہر ہوا ہے کہ نہیں اور بالآخر شعور کا وہ نکتہ نمایاں ہوتا ہے، جب اس نجات کا خیال ہی قلب میں خطور نہیں کرتا، اور ہم حق تعالیٰ کی حمد و ثنا میں صرف حق تعالیٰ ہی کی خاطر مشغول و مصروف ہو جاتے ہیں، رضا و موافقتِ مولیٰ کے مقام کی طرف ہمارا عروج ہوتا ہے، اب نہ ہم میں کوئی ارادہ باقی رہتا ہے، نہ کوئی خواہش، نہ فعل نہ اختیار، یہ سب ارادہ و فعلِ حق میں غائب و فانی ہو جاتے ہیں۔

آمد خبرے ز آمد او   من بعد خبر نماند مارا

یہی شیخ جیلی کے الفاظ میں الراحۃ الکبریٰ والجنۃ المعجلۃ فی الدنیا والآخرۃ" ہے، اسی کا نام اطمینانِ قلب ہے جس کی طرف اس آیۂ کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ	جو لوگ ایمان لائے، اور ان کے قلب اللہ تعالیٰ کے
بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ	ذکر سے مطمئن ہو گئے، ہاں اللہ ہی کے ذکر سے دل
الْقُلُوْبُ! (پ ۱۳ ع ۱۰)	کو سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

اطمینانِ قلب یا نفسِ مطمئنہ کے حصول کے بعد بندۂ مومن حق تعالیٰ سے راضی ہو کر جنتِ ذات میں داخل ہو جاتا ہے:-

یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ (پ ۳۰ ع ۱۴)

یہی حُریتِ تامّہ ہے، یعنی حق تعالیٰ کا پانا اور ان سے راضی و مسرور رہنا:-

یار با ماست چہ حاجت کہ زیادہ طلبیم

دولتِ صحبتِ آں مونسِ جاں مارا بس   (حافظ)

قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ!

ضمیمہ

شکر کے ذریعہ سلوک کے طے کرنے میں مندرجہ ذیل دعائیں اکسیر کا حکم رکھتی ہیں، سحر کے وقت ان کا ورد رقتِ قلبی کے ساتھ جاری رہنا چاہیے :-

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ اِلٰهِىْ اَنَا الصَّغِيْرُ الَّذِىْ رَبَّيْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الضَّعِيْفُ الَّذِىْ قَوَّيْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْعَارِىْ الَّذِىْ كَسَوْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْجَائِعُ الَّذِىْ اَشْبَعْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الظَّمْاٰنُ الَّذِىْ سَقَيْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْمَرِيْضُ الَّذِىْ عَافَيْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الدَّاعِىْ الَّذِىْ اَجَبْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْفَقِيْرُ الَّذِىْ اَغْنَيْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْجَاهِلُ الَّذِىْ عَلَّمْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْمُهَانُ الَّذِىْ كَرَّمْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا السَّائِلُ الَّذِىْ اَعْطَيْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الرَّاغِبُ الَّذِىْ اَرْضَيْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْخَائِفُ الَّذِىْ اٰمَنْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْغَائِبُ الْعَسِيْرُ الَّذِىْ اٰوَيْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْخَاطِئُ الَّذِىْ غَفَرْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الذَّلِيْلُ الَّذِىْ عَزَّزْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْمَجْهُوْلُ الَّذِىْ عَرَّفْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنَا الْعَوِرُ الَّذِىْ سَتَرْتَهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ غِيَاثِىْ فِىْ كُلِّ كُرْبَةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنْتَ رَجَائِىْ فِىْ كُلِّ شِدَّةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنْتَ خَيْرُ الْاٰلَاءِ عِنْدِىْ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَنْتَ قَدِيْمُ الْعَفْوِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَمْ تَبْلِنِىْ لِسُوْءِ عَمَلِىْ قَطُّ فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَمْ تُؤَاخِذْنِىْ بِخَطِيْئَتِىْ فَلَكَ الْحَمْدُ وَلَمْ تُشْمِتْ بِىْ عَدُوِّىْ فَلَكَ الْحَمْدُ وَمَا يَثْبُتُ فَضِيْحَتِىْ بِعَمَلٍ فَلَمْ تُعَذِّبْنِىْ وَلَمْ تَفْضَحْنِىْ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَرْجُوا الْخَيْرَ فَتُيَسِّرُهٗ وَاَخَافُ الشَّرَّ فَتَصْرِفُهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَتَلَطَّفْتَ بِىْ فِى الصِّغَرِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَهَدَيْتَنِىْ لِلْاِسْلَامِ فِى الْكِبَرِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَاَدَّيْتَنِى التَّنْيَاتِ فَلَكَ الْحَمْدُ وَعَلَّمْتَنِىْ مَا لَمْ اَكُنْ اَعْلَمُ فَلَكَ الْحَمْدُ وَرَزَقْتَنِىْ مَا لَمْ اَكُنْ اَحْتَسِبُهٗ فَلَكَ الْحَمْدُ وَسَخَّرْتَ لِىْ مَا لَمْ اَكُنْ مُقْرِنًا فَلَكَ الْحَمْدُ عَظُمْتَ وَكَبُرْتَ فَلَكَ الْحَمْدُ بِكَ اَصْبَحْتُ وَاَمْسَيْتُ فَلَكَ الْحَمْدُ بِيَدِكَ مَوْتِىْ وَحَيَاتِىْ فَلَكَ الْحَمْدُ رَبِّ اَرْحَمْنِىْ

Marfat.com

وَاَنَا اَسْئَلُكَ وَلَا تُعَذِّبنِي وَ اَنَا اَسْتَغْفِرُكَ ، رَبِّ لَا تَحْرِمْنِي لِقِلَّةِ شُكْرِيْ وَ لَا تُعَذِّبنِي لِكَثْرَةِ ذَنْبِي وَارْحَمْنِي مِنْ اَجْلِ ضُعْفِيْ وَاَعْطِنِي مِنْ اَجْلِ فَقْرِيْ وَارْحَمْنِي وَاعْفُ عَمَّا تَعْلَمُ مِنْ ذُنُوْبِي فَاِنْ تُعَذِّبْ فَاَنَا الظَّالِمُ وَاِنْ تَعْفُ فَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ

وَاِنْ تَعْفُ فَطَوْلٌ مِّنْكَ وَاِنْ تُعَذِّبْ

فَغَيْرُ ظَالِمٍ وَلَا مَسْئُوْلٍ

ماحول[1] پر قابو کس طرح حاصل کیا جائے؟

گرچہ دیوار افگند سایہ دراز　　　　بازگردد سوئے او آں سایہ باز

ایں جہاں کوہ است فعلِ ما ندا　　　　سوئے ما آید ندا ہا را صدا

قرآنِ عظیم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات میں ایک لامتناہی حکمت، رحمت و کرم کے ساتھ مصروفِ عمل ہے اور زندگی کے ہر قدم پر ہماری رہبری کرنے پر آمادہ ہے، اگر ہم اس پر بھروسہ کریں اور اعتصام کے طریقوں سے واقف ہو کر اس کے دامن میں چنگل ماریں، ہمیں کائنات میں بے یار و مددگار، بے ولی و نصیر نہیں چھوڑا گیا ہے، ساری زندگی لطفِ حق شاملِ حال رہتا ہے، زندگی حق تعالیٰ کی نعمت و فضل سے مملو ہو جاتی ہے، اطمینانِ قلب و جمعیتِ خاطر نصیب ہوتی ہے، اگر ہم رضائے حق کے تابع ہو جائیں اور حق تعالیٰ کو کافی سمجھ کر سارے کام ان کے سپرد کر دیں!

حق تعالیٰ ہمیں سلامتی و نجات کی طرف لے جانا چاہتے ہیں وَاللّٰهُ يَدْعُوٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ان تجربات میں کامیاب کرنا چاہتے ہیں جن سے ہم گزر رہے ہیں اور جن سے ہم خوفزدہ ہیں! اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ (بقرہ ۲۴۳) وہ ہمارے ضعف و کمزوری سے واقف ہیں، وہ ہمارا بوجھ ہلکا کرنا چاہتے ہیں۔ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا (النساء ۲۸) حق تعالیٰ ہمیں برترین مسرت عطا کرنا چاہتے ہیں اور اس سرور سے ہمارے قلب کو مملو کرنا چاہتے ہیں جس کا خود ہمیں اندازہ نہیں فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ. آنکھوں کی ٹھنڈک کا جو سامان خزانۂ غیب میں موجود ہے اس کی کسی کو خبر نہیں (السجدہ)

---

[1] یہ مقالہ پہلی مرتبہ برہان بابت جنوری ۱۹۵۲ء میں شائع ہوا

Marfat.com

دنیا میں ہر جگہ ایک کامل الٰہی نظم موجود ہے، جس میں توافق و ہم آہنگی بھی ہے اور سرور و سکینہ بھی!
حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی اس نظمِ الٰہی کے دائرہ میں بسر ہو اور زمین پر رہ کر ہم جنت کی خوشبو سونگھتے رہیں: هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ لِيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا (الاحزاب ۶) حق تعالیٰ اور اس کے فرشتے مومن پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں، حق تعالیٰ انہیں تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ مومن پر بہت مہربان ہیں۔

اسی زندگی میں ہمیں یہ نعمت مل سکتی ہے اور حق تعالیٰ ہی ہمیں اس کو عطا کر سکتے ہیں، وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ! اگر ہم حق تعالیٰ پر کامل بھروسہ کریں تو ہماری مثال اس درخت کی سی ہو جاتی ہے جو پانی کے چشمے کے بازو اُگا ہے، ہر وقت روحانی قوت و حیات کے سرمدی چشموں سے ہمیں تازگی پہنچتی رہتی ہے!

صد چو عالم در نظر پیدا کند   چونکہ چشمت را بخود بینا کند   (رومیؒ)

اگر ہماری آنکھیں حق تعالیٰ کے مشاہدہ کے لیے کھل جائیں اور ہم ہدایت و نظمِ الٰہی کے دائرہ میں اپنی زندگی بسر کریں تو ہماری ساری خارجی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں یا غائب ہو جاتی ہیں:

گر جہاں پُر برف گردد سر بسر   تاب خور بگدازدش از یک نظر   (رومیؒ)

اس عقیدہ یا ایمان کی مضبوط چٹان پر کھڑے ہو کر زندگی کے کچھ قدیم دستور و اصول ہم سے سنو اور زندگی کے تجربات، حالات یا ماحول میں ان سے کام لو، زندگی "گریہ پیہم" نہ رہیگی، "خندہ یکدم" ہو جائیگی!

یاد رکھو کہ خارجی زندگی باطنی زندگی کا عکس ہے۔ ہماری باطنی زندگی یا 'انفس' جیسا ہو گا ویسا ہی عکس ہمارے خارجی حالات ہونگے، ویسا ہی ہمارا 'آفاق' ہو گا۔ آفاق تابع انفس ہے۔ آفاق میں تغیر انفس کے تغیر کا تابع ہے۔ اس صداقت کو قرآن حکیم نے ایک سے زیادہ جگہ واضح کہا ہے، شک و شبہ سے نکالنے کے لیے ہم اس کا ذکر کر رہے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا   واقعی حق تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرتا

Marfat.com

مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد ۲۶) جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدلتے

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا یہ بات اسی سبب سے ہے کہ حق تعالیٰ کسی نعمت

نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا کو جو کسی قوم کو عطا فرمائی ہو نہیں بدلتے جب تک کہ

مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الانفال ۷۶) وہی لوگ اپنے نفس کو نہیں بدل ڈالتے۔

خارج کا تغیر، ماحول کا بدلنا، حالات پر قابو پانا ہو تو باطن کا تغیر، نفس کا بدلنا ضروری ہے اگر باطن میں کجی ہو، نفس خام و ناشائستہ ہو، تو خارج میں کجی، ناہمواری، عدم توافق یا دوسرے الفاظ میں درد و غم، قلت و افلاس، ضیق و پریشانی کا ہونا ضروری ہے۔

باطن یا نفس سے مراد ظاہر ہے کہ نفس اور اس کے صفات ہیں اور ان سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال ہیں۔ اب ماحول کی ناسازگاری ضیق و پریشانی، رنج و غم، غم و الم راست نتیجہ ہیں باطنی زندگی کا، یعنی رذائل اخلاق کا، اتباع ہوا کا، جرم و معصیت کا، بدکرداری و گناہ کا، قرآن مبین نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی

كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ ہاتھوں کے کیے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے

كَثِيْرٍ (شوریٰ ۵۶) تو درگذر ہی کر دیتا ہے۔

اسی اصول کو کسی اور جگہ اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا گیا ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی کہ تم اس سے

مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ دو چند پہنچا چکے ہو تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے

عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ آئی؟ آپ فرما دیجیے کہ یہ تکلیف تم کو تمہارے

شَيْءٍ قَدِيْرٌ (پ ۴ ع ۸) ہی طرف سے پہنچی۔

صاحبِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا:

انما ھی اعمالکم ترد علیکم یہ تمہارے اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں۔

Marfat.com

دوسری جگہ یوں فرمایا:

إنما هي أعمالكم أحصيها عليكم فمن وجد خيراً فليحمد الله ومن وجد غيرها فلا يلومن إلا نفسه۔

یہ تمہارے اعمال کا بدلہ ہے جن کو میں محفوظ رکھتا ہوں (تمہارے نامۂ اعمال میں لکھواتا جاتا ہوں) کہ ان کا پورا بدلہ تم کو ملے، اگر تم میں سے کوئی خیر پائے تو اللہ کا شکر کرے اور اگر اس کے خلاف پائے تو سوائے اپنے نفس کے کسی پر ملامت نہ کرے

اس اصول کی وضاحت میں صوفیۂ کرام نے جو مثال استعمال کی ہے وہ نہایت صحیح اور صاف ہے، وہ شخص اور اس کے سایہ سے اس اصول کو سمجھاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے۔ اگر کوئی شے ٹیڑھی ہو تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا اور اگر سیدھی تو سایہ بھی سیدھا ہوگا۔ نفس شخص کی مانند ہے اور ماحول اس کا سایہ ہے، یا صفات و اعمال شخص کی مثال ہے، حالات و واقعات ان کا عکس و سایہ ہیں۔ شیخ ابو النجاؒ اپنے احباب سے کہا کرتے تھے۔

اعلموا ان جميع الوجود يقابلكم بحسب ما برز منكم من الاعمال، فانظروا كيف تكونون، فان الظل تابع الشاخص في العوج والاستقامة

یعنی "جان لو کہ جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسے ہی تمہارے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے اسی لیے ذرا اپنے اعمال پر نظر رکھنا کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے کجی و راستی ہر دو میں۔

اس صداقت پر امام شعرانی کو اتنا یقین تھا کہ اگر اپنے دوستوں یا بیوی یا نوکروں سے کجروی یا نشوز و گریز اپنے معاملہ میں پاتے تو ذمہ دار اپنی ذات کو ٹھہراتے اور اپنے ہی پر ملامت کرتے۔ ان کا یہ قول مشہور ہے۔

انّ الوجود يعاملني على صورة عاملته به، فاللوم على لا عليهم في الاصل لانهم كظل الشاخص على حد سواء فان كان الشاخص مستقيما فالظل

یعنی "لوگ میرے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتے ہیں جیسا کہ میں ان کے ساتھ کرتا ہوں، پس ملامت میری ہی ذات پر ہو نہ کہ ان کی ذات پر کیونکہ ان کی مثال کسی شخص کے سایہ کی مانند ہے۔ اگر

Marfat.com

مستقیما اواعوج فالظل اعوج	شے سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہے اور اگر شے
ومن طلب لااستقامۃ الظل	ٹیڑھی ہو تو سایہ بھی ٹیڑھا۔ جس شخص نے اس بات
مع عوج الشاخص فقد رام	کی توقع کی کہ ٹیڑھی شے کا سایہ سیدھا ہوگا تو
المحال۔	اس نے محال کی تمنا کی"

قرآن عظیم نے کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ اور کُلُّ امْرِئٍ بِمَا کَسَبَ رَهِيْنٌ اور لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اکْتَسَبَتْ اور مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاۤءَ فَعَلَيْهَا کہہ کر اس صداقت کی توضیح کی ہے۔ اس اصول کو اچھی طرح ذہن نشین کرلو! یہ وہی اصول ہے جس کو امیر مینائی نے عاشقوں کی زبان میں اس طرح ادا کیا ہے۔

یہ رونا بیوفائی کا یہ شکوہ کج ادائی کا ۔۔۔ سزا ہی دل لگنے کی امزہ ہی آشنائی کا

فلسفۂ اخلاق کی زبان میں اس کو یوں بیان کرتے ہیں: الناس مجزیون باعمالھم ان خیراً فخیر وان شراً فشر۔ لوگوں کو اعمال کی جزا ملتی ہے اگر اعمال اچھے ہوں تو ان کی جزا بھی اچھی ہوتی ہے اور اگر اعمال بد ہوں تو ویسی ہی ان کی جزا ہوتی ہے!

بنیادی اصول کو سمجھ لینے کے بعد اب ماحول یا واقعاتِ زندگی کے سلسلہ میں تمہیں چند باتیں سمجھنی ضروری ہیں۔

اوپر بیان کیے ہوئے اصول پر غور کرنے سے تمہیں یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ زمین و آسمان کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور قرآن کریم نے صاف الفاظ میں اس کی وضاحت کردی ہے:۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ	حق تعالیٰ نے آسمان و زمین کو حکمت کے ساتھ
لِتُجْزٰى کُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا کَسَبَتْ وَهُمْ	پیدا کیا کہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے
لَا يُظْلَمُوْنَ ۔ (الجاثیہ ۲۲)	اور ان پر ذرا ظلم نہ کیا جائے۔

یاد رکھو کہ زندگی کا مقصد طفلِ شیرخوار کی طرح ہماری دایہ گری کرنا نہیں! یہ فرائض و واجبات کا

بار ہمارے کندھوں پر رکھتی ہے تاکہ ان کی ادائی میں ہم زیادہ سے زیادہ قوی ہوتے جائیں، ہمارے اخلاقی اعصاب و عضلات طاقتور ہوں اور ہم انسانِ کامل بن جائیں اور اس سرور و مستی سے بہرہ یاب ہوں جو کاملین کے لیے مقدر کی گئی ہے:

یا یوں کہو کہ ہماری زندگی ایک تربیت گاہ ہے حق تعالیٰ ہمارے معلم اور استاد ہیں، روزمرہ کے واقعات اور حادثات وہ آلات ہیں جن کے ذریعہ ہماری سیرت کی تکمیل کی جارہی ہے۔ دنیا کی مثال ایک "روح ساز وادی" سے دی جاتی ہے۔ یہاں کبھی غم کی مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے خفتہ نغمے بیدار کیے جاتے ہیں، راحت و غم، بلا و طرب، لذت و الم ہمیں اپنا سلوک طے کرنے میں مدد دے رہے ہیں، دونوں ہمارے لیے خیر ہیں، ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہیں دی جاسکتی ؎

بس زبونِ وسوسہ باشی دلا　　　گر طرب را باز دانی از بلا

موت و حیات کی تخلیق قرآنِ حکیم کے الفاظ میں اس لیے ہوئی ہے کہ اس امر کی آزمائش کی جائے کہ ہم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے:

خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (الملک ع ۱)

جب حقیقت یہ ہے تو عارف نہ زندگی کے تغیرات سے گھبراتا ہے نہ ان سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہے، یہ تو اس کی تادیب و تزکیہ کے لیے ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ان تغیرات و تحولات سے وہ اسی طرح سبق لیتا ہے جس طرح کہ ایک ذہین و محنتی طالب علم استاد کی تقریر و تعلیم سے استفادہ کرتا ہے، اپنے جہل کو دور کرتا ہے، اپنے نفس کا تزکیہ، قلب کا تصفیہ اور اپنے دماغ کا خیالاتِ فاسدہ سے تخلیہ کرتا ہے۔ ان واقعات و تغیرات کی حیثیت اس کی نگاہ میں ایک پردہ کی سی ہے اور اس پردہ کے پیچھے وہ حق تعالیٰ ہی کو مصروفِ عمل دیکھتا ہے اور شیخ جیلیؒ کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

رَبِّ اَشْهِدْنِیْ مُطْلَقَ فَاعِلِيَّتِكَ فِیْ　　اے پروردگار مجھے ہر شے میں اپنی فاعلیت کا

كُلِّ مَفْعُوْلٍ حَتّٰى لَا اَرٰى فَاعِلاً غَيْرَكَ — مشاہدہ نصیب کرتا کہ تیرے سوا کسی کو فاعل نہ دیکھوں کہ

لِاَكُوْنَ مُطْمَئِنًّا تَحْتَ جَرَيَانِ اَقْدَارِكَ — تیرے اقدار کے جاری ہونے سے مطمئن ہو جاؤں

مُنْقَادًا لِكُلِّ حُكْمِ! — اور تیرے ہر حکم کا مطیع و فرمانبردار بن جاؤں۔

اسی علم و عرفان کے ایک متوالے کی زبان سے یہ سریلے نغمے نکلے ہیں:۔

یار لیست مرا ورائے پردہ — حُسنِ رُخ او سزائے پردہ

عالم ہمہ پردۂ مصوّر — اشیاء ہمہ نقشہائے پردہ

ایں پردہ مرا ز تو جدا کرد — اینست خود اقتضائے پردہ

نے نے میانِ ما جدائی — ہرگز نکند غطائے پردہ (واللہ اعلم)

جاہل تغیرات کو پسند نہیں کرتا، ان سے کبیدہ خاطر ہوتا ہے، ان کا مقابلہ کرتا ہے، مزاحم ہوتا ہے؛ لیکن زندگی دائمی تغیر کا نام ہے "سکون محال ہے قدرت کے کارخانہ میں" اس لیے جاہل کا مقابلہ خود زندگی کے قانون اور اس کی قوتوں سے ہے، یہ قانون اور اس کی قوتیں مقصد و غایت کے لحاظ سے منصفانہ اور مہربان اور عمل کے لحاظ سے غیر جانبدارانہ اور ناقابلِ شکست ہوتی ہیں۔

ہمیں زندگی کے واقعات و تغیرات کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے ساتھ برضا و رغبت اشتراکِ عمل کرنا چاہیے؛ یعنی ہمیں اس سبق پر نگاہ رکھنی چاہیے جو ہمیں ان واقعات و تجربات کے ذریعہ دیا جا رہا ہے کیونکہ جب ہم اس سبق کو یاد کر لیتے ہیں اور اس کے مطابق اپنی سیرت و عمل میں تغیر پیدا کر لیتے ہیں تو پھر یہ تکلیف دہ، ناخوشگوار اور المناک واقعات و تجربات رفع ہو جاتے ہیں اور طمانیت و بردِ قلبی ہمیں نصیب ہوتی ہے حقیقی معنی میں کامیاب زندگی کا راز حق تعالیٰ کے ارادے اور مقصد کے ساتھ توافق و اتحاد ہے۔ اور اس مقصد و ارادہ کا اظہار ان ہی واقعات و تجربات و تغیرات میں ہو رہا ہے جس کے ساتھ توافق ضروری ہے جس کا شرع کی زبان میں "توافق بالقضاء" نام ہے، جس کو "رضا بالقضاء" و "حفظ حال" سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، اسی لیے واقفانِ راز نے کہا ہے کہ

بدیں سپاس کہ مجلس منورست بناز — گرت چو شمع جفائے رسد بسوز و بساز

ہمیں دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہے کہ تجربات کے ذریعہ سیرت کی تکمیل کریں، اپنی پوشیدہ و نہفتہ روحانی قوتوں کو ظاہر و نمایاں کریں جو الٰہی قوتیں ہم میں بالقویٰ ہیں انہیں بالفعل کریں اور ہم اسی صورت میں ارادۂ اللہ کے ساتھ توافق قائم کر سکتے ہیں جب ہم اپنی زندگی کے واقعات و تجربات کے ساتھ برضا و رغبت اشتراکِ عمل کریں، اور جو سبق وہ ہمیں سکھلانے کے لیے رونما ہو رہے ہیں انہیں سیکھیں نہ کہ ان سے تجاہل برتنے کی کوشش کریں:

دریاضِ بندگی رعنا ترازشاخِ گل ست گردنے کز بارِ تسلیم و رضا خم می شود!

تمام تجربات کا مقصد ہمیں اس راہ پر لے چلنا ہے جو خدا کی طرف لے جاتا ہے، ہم اپنے جہل کی وجہ سے اس راہ سے بھٹک جاتے ہیں، دور جا پڑتے ہیں! جذبات و شہوات ہمیں صراطِ مستقیم سے ہٹا لے جاتے ہیں، صراطِ مستقیم کی طرف ہمارے قدم اسی وقت اُٹھ سکتے ہیں جب ہماری سیرت کی تکمیل ہو اور ہمارا روحانی ارتقا عمل میں آئے، اب زندگی میں رونما ہونے والے سارے تجربات و واقعات ہماری سیرت کی تکمیل کرتے ہیں اور ہمارے روحانی ارتقا میں مدد دیتے ہیں تاکہ ہم اس صراطِ مستقیم پر چلیں جو حق تعالیٰ کی طرف ہمیں لے جاتی ہے۔ لہٰذا تجربات و حالات خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، مسرت بخش ہوں یا غمناک، بہر طور یہ ہمارے خیر برتر کے حصول کے لیے ضروری و لابدی ہیں، ان میں ہمارے لیے ہدایت کا ایک سبق پوشیدہ ہوتا ہے جس کو معلوم کرنے اور جس پر عمل پیرا ہونے کی ہمیں کوشش کرنی چاہیے اور جوں ہی ہم نے اس ہدایت پر عمل کرنا شروع کر دیا ہمیں شقاوت و گمراہی سے نجات مل جاتی، اور ان سے پیدا ہونے والے نتائجِ ضیق، خوف و حزن سے بھی!

فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ۝ وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (طٰہٰ ۱۷)

تو جو شخص میری اتباع کریگا تو وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ شقی اور جو شخص میری نصیحت سے اعراض کریگا تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا کر کے اُٹھائینگے۔

ہر تجربہ، ہر واقعہ زندگی کا خیرِ لامتناہی کی طرف لے جاتا ہے، تصادم کی بجائے اس سے توافق ہی سب سے بڑی عقلمندی ہے، رضا بالقضاء اسی کو کہا جاتا ہے، ہماری زندگی میں کوئی حادثہ نہیں نازل ہوتا مگر وہی جو حق تعالیٰ نے ہمارے لیے مقدر فرمایا ہے، وہ ہمارے مولیٰ ہیں، آقا ہیں ہمیں اپنے سب کام انہی کے سپرد کر دینے چاہئیں۔

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰىنَا وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ

شاد و خنداں پیش تیغش سر بنہ ہمچو اسمٰعیل پیشش سر بنہ (رومیؒ)

تمام تجربات و حادثات دوا و معالجہ کی غرض سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور جب ان کا مقصد پورا ہو جاتا ہے تو وہ غائب ہو جاتے ہیں، پھر ان دردناک حادثات کی تکرار عموماً نہیں ہوتی، پھر راحت و طمانیت ہی میں زندگی گزرتی ہے۔

بسرو د گرم جہاں خاطرت چو راضی شد تمام عمر ترا آب سرد و نانِ گرم است (دیلمؒ)

جب تک ہم حادثاتِ زمانہ سے سبق نہیں لیتے، کجروی و گمراہی میں مبتلا رہتے ہیں، اتباعِ شہوات میں گرفتار رہتے ہیں اور ان مصائب و آفات کو خود پیدا کرتے رہتے ہیں جن سے ہم نجات پانا چاہتے ہیں، جب ہم نے سبق ہدایت حاصل کیا، ہماری سیرت بدلتی ہے۔ ہم میں تقویٰ کے صفات پیدا ہوتے ہیں، ہمارا نقطۂ نگاہ بدلتا ہے، قانونِ الٰہی کے مطابق ہم فکر کرنے لگتے ہیں، حق تعالیٰ سے ربط قائم کرنے لگتے ہیں، ان کی ہدایت پر عمل پیرا ہونے لگتے ہیں۔ آفات و مصائب کا ورود جس غرض کی تکمیل کے لیے ہو رہا تھا اب وہ غرض چونکہ پوری ہو چکی ہوتی ہے، وہ بھی بتدریج غائب ہونے لگتے ہیں۔

دردناک تجربات و حادثات ہی سے ہمیں سبقِ ہدایت حاصل کرنا کافی نہیں بلکہ ان تجربات و حالات سے بھی جو خوشگوار اور راحت بخش ہوتے ہیں ہمیں سبق سیکھنا ضروری ہے۔ آسائش و نعمت کی حالت میں بھی ہمیں شکر کے ذریعہ حق تعالیٰ کی یاد میں رہنا چاہیے چنانچہ تاکید کے ساتھ حکم دیا گیا ہے

فلیکثر الدعاء عند الرخاء چین و آسائش کے وقت زیادہ دعا کرتے رہو۔

Marfat.com

چین کی حالت میں دعا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر نعمت کو حق تعالیٰ ہی کی طرف سے سمجھا جائے وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ کیونکہ درحقیقت منعم و قاسم نعمت حق تعالیٰ ہی ہیں، لہذا ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتوں کا استعمال ضروری ہے جب ہمیں نعمتیں عطا کی جاتی ہیں، جب ہم عافیت کی حالت میں ہوتے ہیں، جب ہمیں صحت و تندرستی ملتی ہے، امراض و آلام سے محفوظ ہوتے ہیں، فراخی و آسائش سے متمتع ہوتے ہیں تو یہ سب ہماری آزمائش و ابتلاء کے لیے ہوتا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ اس عافیت کے نتیجہ کے طور پر ہم میں کبر و عجب تو نہیں پیدا ہو گیا، ہم شہوتوں اور لذتوں کے درپے تو نہیں ہو گئے، موجودہ نعمتوں کو حقیر و خوار تو نہیں سمجھنے لگے اور ان نعمتوں میں عیب و نقصان تو نہیں نکالنے لگے؟ دیکھا جاتا ہے کہ کیا نعمتوں اور راحتوں کی وجہ سے ہم حق تعالیٰ کی اطاعت سے روگرداں ہو کر گناہوں اور معصیتوں میں منہمک تو نہیں ہو گئے! اسی لیے سمجھا جاتا ہے کہ نعمت کی آزمائش مصیبت کی آزمائش سے زیادہ سخت ہوتی ہے، خوشی کا فتنہ تکلیف کے فتنہ سے بہت بڑا ہوتا ہے! صاف بات ہے گناہوں پر قدرت ہونے کے باوجود ان سے رک جانا یا صبر کرنا بہت دشوار ہوتا ہے! عیش و آرام سے انسان کا جسم فربہ ہونے لگتا ہے عیش و آرام بغیر اس کو صبر نہیں آتا اور دوامِ عیش اسی وقت ممکن ہے جب اس کے حصول میں وہ لوگوں سے مدد چاہے اور ظالموں سے التجا کرے اور یہ امور نفاق، کذب، ریا، بغض، دشمنی کا سبب ہو جاتے ہیں اور ان سے تمام روحانی مہلکات پیدا ہوتے ہیں، قلب کے سارے امراض جنم لیتے ہیں، اسی لیے صادق مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے![1]"

جب انسان نعمت و عافیت کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ عموماً حق تعالیٰ کی یاد سے غافل ہو جاتا ہے، ازدیادِ دولت کی تدبیریں، اپنے بچاؤ کا خیال، مال کی حفاظت کا بندوبست، اس کے خرچ کرنے کا انتظام، یہ تمام امور اس کے قلب پر ہجوم کرتے ہیں، اور یہ سب اس کے

---

[1] حب الدنیا راس کل خطیئۃ (رواہ البیہقی فی الشعب وابن ابی الدنیا)

دل کو سیاہ کرتے اور حق تعالیٰ کی یاد سے غافل کرتے ہیں جیسا کہ حق تعالیٰ نے فرمایا:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ — غفلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص نے یہاں تک کہ تم قبرستانوں میں پہنچ جاتے ہو!

اسی لیے عیش سے بچنے کی ہدایت فرمائی گئی۔ حضور انور صلعم نے معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ "تم تنعم سے بچو، کیونکہ اللہ کے بندے عیش کرنے والے نہیں ہوتے (اِنَّ عِبَادَ اللّٰهِ لَيْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ)

سچ یہ کہ نعمت کا فتنہ مصیبت کے فتنہ سے بہت زیادہ سخت ہوتا ہے اور نعمت و مصیبت ہر دو ہمارے لیے ابتلاء یا آزمائش ہیں! اسی حقیقت کو قرآن حکیم میں حق تعالیٰ اس طرح ادا فرما رہے ہیں:

وَقَطَّعْنٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اُمَمًا مِنْهُمُ الصّٰلِحُوْنَ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَبَلَوْنٰهُمْ بِالْحَسَنٰتِ وَالسَّيِّاٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (پ ۹ ع ۱۱) — ہم نے دنیا میں ان کی مختلف جماعتیں کر دیں۔ ان میں سے بعض نیک تھے اور بعض اور طرح کے اور ہم ان کو خوش حالیوں اور بدحالیوں سے آزماتے رہے کہ شاید باز آجائیں۔

اسی طرح فرمایا:۔

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً (پ ۱۷ ع ۳) اور ہم تم کو بری بھلی حالتوں سے اچھی طرح آزماتے ہیں۔

نعمت و عافیت کی حالت میں مرد مومن مشکور ہوتا ہے، یہی اس حالت کا ادب ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ مَشْكُوْرٌ عِنْدَ الرَّخَاءِ — مومن چین کی حالت میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے

دل و زبان و اعضاء کے شکر ہی سے نعمتیں سلب و نقصان سے محفوظ ہوتی ہیں اور ان میں اضافہ ہوتا ہے،

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ — اگر تم شکر کرو تو یقیناً ہم نعمتوں میں اضافہ کرتے ہیں

خوب سمجھ لو کہ اجابتِ دعا، رزق و غنا، توبہ و مغفرت کا انحصار اپنی مرضی پر رکھا ہے کہ چاہا تو دیا، چاہا تو نہ دیا، لیکن شکر کے معاوضہ میں زیادتی نعمت بلا تخلف ہے! اسی لیے حضور انور صلعم

Marfat.com

نے فرمایا:

مَنْ نَزَلَتْ اِلَیْہِ نِعْمَۃٌ فَلْیَشْکُرْھَا جس کو نعمت ملے وہ اس کا شکرادا کرے!

نیز فلیکثر الدعاء عند الرخاء چین و آسائش کی حالت میں زیادہ دعا کرتے رہو

زندگی کے تجربے، حادثے، تغیر و تحول ہماری آزمائش، ہماری سیرت کی تعمیر و تکمیل، ہماری صلاحیتوں کو بیدار کرنے، بالقوی کو بالفعل کرنے ہی کی غرض سے رونما ہو رہے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں ملائم و ناملائم اور انسان کے نفس کی بھی دو حالتیں ہیں، تیسری حالت نہیں۔ ایک عافیت دوسری بلا، ناملائم یا دردناک حادثات کا ورود اس لیے ہوتا ہے کہ ہم کجروی سے باز آجائیں، شہوتوں کے اتباع سے رک جائیں، سیرت کی اصلاح کرلیں! سوہانِ قضا ہمارے پیکرِ خاکی کو پختہ و ہموار بناتا ہے، اس کی کمی و خامی کو غم والم کے انگارہ سے دور کرتا ہے۔ بقول اقبال:

جہانِ ما کہ جز انگارہ نیست — اسیرِ انقلابِ صبح و شام است
ز سوہانِ قضا ہموار گردد — ہنوز ایں پیکرِ گل ناتمام است

نفس کی اس حالت کو بلا و مصیبت کی حالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ملائم یا نعمت و عافیت کے حالات سے بھی ہماری آزمائش ہوتی ہے، اگر ہم ان حالات میں یادِ حق سے غافل نہ ہو جائیں، اپنا رخ حق تعالیٰ ہی کی جانب رکھیں، ان کی نعمتوں کو ان کی مرضی کے مطابق استعمال کریں تو ہم اپنے باطن میں یہ ندا سنتے ہیں:۔

اُرْکُضْ بِرِجْلِكَ ھٰذَا مُغْتَسَلٌ — اپنا پاؤں مارو یہ نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے
بَارِدٌ وَّشَرَابٌ (پ ۲۳ ع ۱۳) — اور پینے کا۔

یعنی ہم حق تعالیٰ کی رحمت و رافت، لطف و منت کے دریا سے سیراب ہوتے ہیں، ہم پر ان کی نعمت و ناز و محبت کے دروازے کھل جاتے ہیں، ظاہر و باطن کی نعمتیں ہم پر تمام کردی جاتی ہیں اور حق تعالیٰ اپنے لطف و کرم سے ہماری پرورش و پرداخت کرتے ہیں اور یہ حالت موت کے وقت تک باقی رہتی ہے اور موت کے بعد وہ اپنے فضل و کرم سے ایسی نعمت عطا

کرتے ہیں جس کو کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کان نے سُنا اور نہ کسی کے دل پر اس کا خطرہ گزرا۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (السجدہ ۲۶)

ناملائم یا دردناک واقعات و حادثات پر غالب آنے کا طریقہ تعطل، عجز، کسل، جبن، بزدلی، ماتم وسینہ کوبی نہیں، نہ مزاحمت و مقابلہ، سرکشی و سب وشتم ہی ہے بلکہ جیسا کہ اوپر وضاحت کی گئی ان حادثات کے سبق ہدایت سے مستفید ہونا، صبر واستقامت، حکمت وعقلمندی سے اپنی سیرت واخلاق میں تغیر پیدا کرنا ہے! ہم میں سے اکثر کے لیے اس امر کا اعتراف سخت مشکل ہو کہ ہماری زندگی میں جو کچھ بھی درد و غم، اندوہ والم کی صورت میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اس کی اصلی علت خود ہمارے انفس میں پوشیدہ سرگرم عمل ہوتی ہو، شیخ محی الدین اکبرؒ کی یہ تھدید کہ "یداك کسبتا وفوك نفخ" یہ تیرے دونوں ہاتھوں کی کمائی ہے اور تیرے مُنہ کی مانگ ہو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتی اور ہم الزام زندگی پر رکھتے ہیں، حق تعالیٰ پر تہمت لگاتے ہیں یا اپنے ہم جنسوں کو متہم ٹھہراتے ہیں، اور اس سبق کو سیکھنے سے انکار کرتے ہیں جو حادثات والمناک واقعات کے ذریعہ حق تعالیٰ کی لامتناہی حکمت ہمیں سکھلانا چاہتی ہو۔ ہم ٹوٹے ہوئے دل لے کر چیخ اُٹھتے ہیں کہ "لوگو! دیکھو، میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جا رہا ہو! ایک مصیبت ختم نہیں ہونے پاتی کہ دوسری اس سے زیادہ آفت مجھ پر نازل ہوتی ہے! بتلاؤ میرا کیا قصور ہو؟ یہ سب میری تقدیر کا نوشتہ ہے! ہائے تقدیر!

طالعے دارم آنکہ از پے آب — گر روم سوئے بحر بر گردد
در بدوزخ روم پے آتش — آتش از بخ فسردہ تر گردد
ور زکوہ التماس سنگ کنم — سنگ نایاب چوں گہر گردد
گر سلامے برم بہ نزد کسے — ہر دو گوشم بحکم کر گردد
در بصحرا روم بجستن خاک — خاک حالی بہ نرخ زر گردد
ایں چنیں حالہا بہ پیش آید — ہر کرا روزگار بر گردد

مولانا لطف اللہ خاں نعمانی

لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ ہمارے روحانی ارتقا کے لیے جن حالات کی ضرورت ہے ہم خود انہیں اپنی طرف جذب کرتے ہیں، ان تمام بلاؤں اور آفتوں کا باعث خود ہم ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جامع و مانع الفاظ میں ہماری ھوی متبع و شحِ مطاع (خواہشاتِ نفسانی جن کا اتباع کیا گیا اور وہ مرض جس کی پیروی کی گئی ہے) جب ہماری آنکھوں سے غفلت کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور ہماری سمجھ میں آجاتا ہے کہ "از ماست کہ بر ماست" "از ما خیزد بر ما ریزد" اور زندگی میں کامل انصاف ہے تو پھر ہم چیخ اٹھتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ النَّاسَ شَیْئًا وَّلٰکِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ (یونس ۴۴) — بے شک حق تعالیٰ لوگوں پر ظلم نہیں کرتے لیکن لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔

جب ہم اپنا رخ حق تعالیٰ کی طرف کر لیتے ہیں "انصار اللہ" بن جاتے ہیں، حق تعالیٰ کی مخالفت ترک کر دیتے ہیں، ان کے قائم کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرتے، ان کے قوانین کی پابندی کرنے لگتے ہیں، اسی میں ہماری عظیم الشان کامیابی ہے!

ماحول پر غالب آنے کا بس یہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے قلب کا جائزہ لیں اور خارجی مشکلات و آفات کے اسباب و علل کی تلاش "انفس" میں کریں۔ اگر ہم دیکھیں کہ حق تعالیٰ کی محبت سے ہمارا قلب عاری یا خالی ہے، دنیوی لذتوں اور شہوتوں سے ملو ہے، اس کے کر و فر پر گرویدہ ہے، اس کے رنگ و بو پر فدا، اس کے خندۂ گریہ آمیز پر قربان، تو ہمیں اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہنا چاہیے کہ

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (پ ۲۲ع ۱۴) — سو تم کو دنیوی زندگی دھوکہ میں نہ ڈالے اور تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں نہ ڈالے۔

اور نفس کے تغیر کی طرف فوراً متوجہ ہونا چاہیے اور اس وقت کے انتظار میں نہ رہنا چاہیے جب آفات کا نزول ہونے لگے اور ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑے۔ عموماً یہی ہوتا ہے کہ ہماری سیہ کاری کی سبب ہمارے قلب کی محبوب ترین چیز ہم سے چھین لی جاتی ہے، اور اس وقت ہم شدتِ حزن و

فرطِ غم سے ہر چیز سے ٹوٹ کر حق تعالیٰ کے قدموں پر گر جاتے ہیں اور ہمارے قلب سے یہ چیخ نکلتی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَسْمَعُ كَلَامِيْ وَتَرٰى	اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا
مَكَانِيْ وَتَعْلَمُ سِرِّيْ وَعَلَانِيَتِيْ	ہے اور میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے؛ تجھ سے میری
لَا يَخْفٰى عَلَيْكَ شَيْءٌ مِّنْ اَمْرِيْ	کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی، میں مصیبت زدہ ہوں
وَاَنَا الْبَائِسُ الْفَقِيْرُ المستغيث	محتاج ہوں، فریادی ہوں، پناہ جو ہوں ترساں
المستجير الوجل المشفق المقر	ہوں، ہراساں ہوں اپنے گناہوں کا اقرار کرنے
المعترف بِذَنْبِيْ! اَسْئَلُكَ	والا ہوں، اعتراف کرنے والا ہوں، ترے آگے
مسألة المسكين وابتهل اليك	سوال کرتا ہوں جیسے بیکس سوال کرتے ہیں، تیرے
ابتهال المذنب الذليل وادعوك	آگے گڑگڑاتا ہوں جیسے گنہگار ذلیل و خوار گڑگڑاتا
دعاء الخائف الضرير ودعاء	ہے اور تجھ سے طلب کرتا ہوں جیسے خوف زدہ آفت
من خضعت لك رقبته و	رسیدہ طلب کرتا ہے اور جیسے وہ شخص طلب کرتا ہے جس
فاضت لك عبرته وذل لك	کی گردن تیرے سامنے جھکی ہوئی ہو اور اس کے آنسو
جسمه ورغم لك انفه اللّٰهم	بہہ رہے ہوں اور تن بدن سے وہ ترے آگے فروتنی
لا تجعلني بدعائك شقيا وكن	کیے ہوئے ہو اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑ رہا ہو۔ اے
لي رؤفا رحيما يا خير المسئولين	اللہ تو مجھے اپنے سے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے
ويا خير المعطين!	حق میں بڑا مہربان نہایت رحیم ہو جا، اے سب مانگے

ذکرہ الکمال عن ابن عباسؓ و عبد اللہ بن جعفرؓ جانے والوں سے بہتر اے سب دینے والوں سے بہتر! بلا کے نزول کے بعد ہم وہی کرتے ہیں جو نزول سے پہلے بھی رضا و رغبت کے ساتھ کر سکتے تھے غم و الم کے انگارے سے جھلسنے کے پہلے اگر ہماری عبدیت کی یہی کیفیت ہوتی تو ہم پر یہ عذاب ہی نازل نہ ہوتا:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ اللہ تعالیٰ تم کو عذاب دے کر کیا کریگا اگر تم شکر کرو

وَاٰمَنۡتُمۡ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا	اور ایمان لے آؤ اور اللہ تعالیٰ بڑی قدر کرنے والا
عَلِیۡمًا. (پ ۸۶)	اور خوب جاننے والا ہے!

عذاب یا دردناک تجربوں اور مصیبتوں سے بچنے کا طریقہ "ایمان و شکر" ہے، عقیدہ و عمل ہے ایمان باللہ اور عمل صالح ہے، یعنی "نفس" کا تغیر ہے، نقطۂ نظر کا بدلنا ہے، سیرت کی اصلاح ہے، تقویٰ کا پیدا کرنا ہے، حق تعالیٰ کا دامن پکڑنا ہے، ان کی ہدایتوں پر عمل کرنا ہے، ان کے بتلائے ہوئے طریقوں پر چلنا ہے، ہم خود اپنے ہاتھوں اپنی عافیت کے خرمن میں آگ لگاتے ہیں، ہم خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں، ہم خود اپنی جانوں کے دشمن ہیں، ہمارے سوا ہمارا کوئی دشمن نہیں، شیخ ابو سعید ابوالخیرؒ نے اس حقیقت کو خوب لکھا ہے:

آتش بدو دستِ خویش در خرمنِ خویش	چوں خود زدہ ام چہ نالم از دشمنِ خویش
کس دشمنِ من نیست منم دشمنِ خویش	اے وائے من و دستِ من و دامنِ خویش

اسی لیے حق تعالیٰ نے جو ہمارے مولیٰ ہیں اور سب سے زیادہ خیر خواہ ہیں، ہم سبھوں کو اگلوں اور پچھلوں کو ایک ہی وصیت فرمائی ہے اور وہ یہی ہے کہ ہم تقویٰ کی زندگی بسر کریں۔

وَلَقَدۡ وَصَّیۡنَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا	واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا جن کو تم سے پہلے
الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَاِیَّاكُمۡ	کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ حکم خداوندی کی اطاعت کرو اور
اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ (پ ۱۶۶)	اس کی مخالفت سے بچو یعنی تقویٰ کی زندگی اختیار کرو

کامیاب زندگی کا قرآنی تصوّر

؎ تقصیر مکن دانۂ خود را شجرے کن (صائب)

کامیاب زندگی! کتنا پاکیزہ، کتنا بلند نصب العین ہے، زندہ دلوں کا مقصود ہے، مطلوب ہے، محبوب ہے، اس کے چہرۂ زیبا سے ذرا نقاب تو اٹھا دو، دن کی پوری روشنی میں اس محبوب کے خدوخال نظر آئیں اور ہم چیخ اٹھیں ؎

دستے کہ پیکر تو بدیں آب و تاب ریخت گرد رہت بر آئینۂ آفتاب ریخت (بیدل دہلوی)

ورنہ بقول عرفی "خوابِ نادیدہ" کی تعبیر تو کچھ بے معنی چیز ہوگی۔

کامیابی کا لفظ آپ اپنا مفسر ہے، مقصود کا پانا کامیابی ہے، زندگی وہ کامیاب ہے جو اپنے مقصود سے ہم آغوش ہے، اب زندگی کا مقصود کیا ہے؟ بچوں کو سادہ زبان میں سمجھا کر اس سوال کا جواب پوچھو، تو وہ کھیل کود، تماشا، لہو و لعب ہی کو مقصودِ زندگی قرار دینگے۔

لیکن جب یہ بچپن کی منزل سے گزر کر جوانی کی دلفریب وادی میں قدم زن ہوتے ہیں، تو اب ان کا مقصود نئی صورت میں جلوہ افروز ہوتا ہے، اب وہ زیب و زینت و آرائش و زیبائش اور تفاخر کو غایتِ حیات قرار دیتے ہیں، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت کو تمام "اقدار" سے بالاتر! التباس کا یہ زمانہ بھی گریز پا ہوتا ہے، اور وہ بہت جلد زینت و تفاخر کو بچپن کی بے معنی خواہش سمجھنے لگتے ہیں، جب ان کی عقلوں میں پختگی پیدا ہونے لگتی ہے تو پلٹ کر اپنی حالت پر نظر ڈالتے ہیں، اور کہہ اٹھتے ہیں

اے آنکہ تمام آرزو ہوسی طفلی مستی مخبلی خود چہ کسی! (ربیع واعظ)

اب زینت و آرائش سے زیادہ ٹھوس قیمتوں کی طرف ان کی نگاہیں اٹھنے لگتی ہیں، وہ مال و دولت کے تکاثر، جاہ و مرتبت کے ترفع کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دیتے ہیں، اور بچپن اور نوجوانی کی خام آرزوؤں کو خطا او رستی سے تعبیر کرتے ہیں، پختہ عقل کی پسند کی ہوئی یہ قیمتیں اب ان کا نصب العین ہوتی ہیں، انہی کے حصول میں وہ شب و روز سرگرم عمل رہتے ہیں، سمجھتے ہیں کہ بس ان کو پا کر وہ سارے عالم سے غنی ہو جائینگے، طمانیت قلب ان کو میسر ہوگی، اور راحت جان نصیب! اسی مغالطہ میں ان کی زندگی کے مختصر و معین دن گزرتے جاتے ہیں، رنج و راحت کی مقدر مقدار انہیں ملتی ضرور ہے لیکن امل کی درازی اور عمر کی کمی بالآخر ان کی زبان سے یہ کہلواتی ہے۔

شد عمر تمام و نا تمامیم ہنوز ۔۔۔ در دوزخ حسرتیم و خامیم ہنوز
عمریست کہ در راہ طلب گام زنیم ۔۔۔ دیں طرفہ کہ در نخست گامیم ہنوز (مومن یزدی)

پیری کی منزل میں قدم رکھ کر انسان کی بصیرت میں عموماً روشنی پیدا ہو جاتی ہے، اب وہ زندگی کے مختلف تجربات سے واقف ہو جاتا ہے، ان کے تمام التباسات کو جاننے لگتا ہے اور نظر کا دھوکا جس کا ہر قدم پر جوانی میں وہ شکار ہو رہا تھا، اب اس سراب کو آب، خوب کو خراب عطر کو شراب کہنے اور سمجھنے پر مجبور نہیں کرتا، اب وہ اشیاء کے حقائق کا کسی قدر عارف ہو جاتا ہے، زندگی کے گوناگوں تجربات کا ذخیرہ تصورات کی شکل میں اس کے حافظہ میں محفوظ ہوتا ہے، ان ہی سے کام لے کر وہ زندگی کی ماہیت سے واقف ہو جاتا ہے، اس کا تخیل زندگی کو ہری بھری کھیتی کے مشابہ پاتا ہے، جس کی چند روزہ رونق و بہار نظر فریب ہوتی ہے، دلکش ہوتی ہے ہوش ربا ہوتی ہے، فریب خوردہ عقل اس کو دائمی اور مستقل سمجھتی ہے، اس کی پرستش کرنے لگتی ہے، اس کو اپنا مطلوب بنا لیتی ہے، اور اس کی گرویدہ ہو جاتی ہے، یکایک اس کھیتی کا رنگ بدلنے لگتا ہے، یہ زرد پڑ جاتی ہے، آدمی اور جانور اس کو روند کر چورا کر دیتے ہیں۔ كَأَن لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ!

Marfat.com

احوالِ جہاں و اصلِ این عمر کہ ہست　　خوابے و خیالے و فریبے و دمے است (خیام)

قرآن کریم نے اس حقیقت کو چند پاکیزہ جملوں میں یوں ادا کیا ہے :-

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا (پ ۲۷ ع ۱۹)

تم خوب جان لو کہ دنیوی حیات محض لہو و لعب اور زینت اور باہم ایک دوسرے پر فخر کرنا اور اموال و اولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے جیسے مینہ کہ اسکی پیداوار کاشتکاروں کو اچھی معلوم ہوتی ہے پھر وہ خشک ہو جاتی ہے، تو اس کو زرد دیکھتا ہے، پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے (ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی)

بہتوں کے لیے زندگی کا مقصود یا تو لہو و لعب ہے یا زینت و تفاخر، یا تکاثرِ اموال و اولاد، فلسفیانہ و اصطلاحی زبان میں اس کی تحلیل کرو تو معلوم ہوگا کہ اہلِ دنیا برترین اقدار یا تو لذت کو قرار دیتے ہیں یا دولت کو یا شہرت کو، اور دولت و شہرت سے بھی ایک قسم کی لذت و راحت ہی مطلوب ہوتی ہے، اور ان کے نزدیک کامیاب زندگی سے مراد وہ زندگی ہے جو ان اقدار کی تحقیق میں کامیاب ہوتی ہے۔ ہمیں ذرا سنجیدگی سے یہاں زندگی کے ان اقدار یا غایات کا امتحان کرنا ہے ؎

ہشدار کہ راہ خود بخود گم نہ کنی

کیا لذت مقصودِ زندگی ہو سکتی ہے؟ کیا ہم لذت اندوزی اور دل خوشی کے لیے پیدا ہوئے ہیں؟ کچھ مفکرین کا یہ خیال ضرور رہا ہے، مسٹر وڈورس کا خیال تھا کہ ہر اچھی چیز کا تعلق شکم سے ہوتا ہے اور فرائڈ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری کائنات کا محور و مرکز آلۂ تناسل ہے۔ سائرینی مذہب کا بانی ارس تپوس لذت ہی کو مقصودِ حیات قرار دیتا ہے۔ اپنے پیروؤں کو اس

---

[1] اور انسان کی حالت مکھی سے بہتر نہیں جو ہمیشہ حلوے ہی کی شیفتہ ہوتی ہے۔

ہر جا کہ مگس پرے بہ بالا و بہ پست　　جز شیفتۂ دو بودۂ حلوا نیست　　(سحابی استرآبادی)

اس کی تلقین تھی ؎

ہمچو سنت اعتقاد باید کردن   می خوردن و اندہ جہاں ناخوردن

اپیکورس خوش باشوں کا بادشاہ اپنی اخلاقیات کا اولین محرک جلبِ لذت اور دفع الم قرار دیتا ہے، لیکن اتنی بات مسلم ہے کہ لذت کو خیر برتر قرار دینے سے پیکورس کی مراد کسی عیاش کی لذتوں سے تھی نہ شہوانی تعیشات سے بلکہ بدن کا درد والم سے اور روح کا پریشانی وغم سے نجات دلانا اس کے پیشِ نظر تھا، فرصت کی زندگی ہو، آلام وافکار سے نجات ہو، دوستی ومحبت کا لطف ہو، فلسفے کا مطالعہ ہو، یہ تھے لذت کے تضمنات پیکورس کے خیال میں، خیام کی زبان میں ان کو اس طرح ادا کیا جاسکتا ہے ؎

تنگے مئے لعل خواہم و دیوانے   سدِ رمقے باید و نصفِ نانے

وانگہ من و تو نشستہ بہ ویرانے   خوشتر بود از مملکتِ سلطانے

خود خیام نے جہانِ بیوفا کا حاصل لذت کے سوا کچھ نہ پایا، صاحبِ نظر جب عالم پر غور کرتا ہے، ہر شے کا جائزہ لیتا ہے، تو اس کو خیام کی رائے میں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ؎

درعالمِ خاک از کراں تا بکراں   چندانکہ نظر کنند صاحب نظراں

حاصل زجہانِ بیوفا چیزے نیست   اِلّا مئے لعل وعارضِ خوش پسراں

ایک روز مرنا ضرور ہے "بے مونس وبے حریف وبے ہمدم وجفت" قبر کے گوشے میں سونا ضرور ہے، اور یہ بھی صحیح ہے کو ایک راز نہفتہ کہ ؎

ہر لالۂ پژمردہ نخواہد بشگفت!

تو پھر جلبِ لذت و دفع الم کے سوا زندگی کا مقصود ہو کیا سکتا ہے؟ 'لذتیت' کے اسی بنیادی اصول کو خیام قوت کے ساتھ پیش کرتا ہے ؎

کم خور غمِ روزگار ناساز شدہ (دفع الم)   مے خور زکفِ ساقی دمساز شدہ (جلب لذت)

کاں کز کس مادر آمد امروز بروں   فردا بینی بکون زن باز شدہ

Marfat.com

کسی راستہ چلنے والے عامی کو روک کر پوچھو کہ وہ دنیا سے کیا چاہتا ہے؟ الفاظ کوئی استعمال کرے اس کا مدلول ومفہوم ہوگا وہی جو جلبِ لذت ودفع الم سے تم سمجھتے ہو! وہ درد وغم سے نجات چاہتا ہے، اور لذت وخوشی کا طلبگار ہے، اشیار کا اچھا یا بُرا ہونا اس کے نزدیک لذت بخش یا الم رساں ہونا ہے، وہ الم رساں وتکلیف دہ شے کو بُری سمجھتا ہے، اور لذت بخش اور فائدہ رساں چیز کو اچھی! اس کی خواہش کا انتہائی مطلوب کسی نہ کسی صورت میں لذت ہی ہوتی ہے! یہ ہے "نفسیاتی لذتیت" کے حامیوں کی تحقیق اور ادعا، اس نفسیاتی تحقیق سے قطع نظر کرکے کہ انسان ہمیشہ لذت ہی ڈھونڈھتا ہے، لذت ہی پر جان دیتا ہے، لذت ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے، یہ دعویٰ کہ انسان کو لذت ہی ڈھونڈھنی چاہئے لذت ہی کو اپنا مقصودِ حیات قرار دینا چاہیے، "اخلاقیاتی لذتیت" کے قائل پیش کرتے ہیں۔

ذرا غور تو کرو کہ کیا یہ بات صحیح ہے کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے لذت ہی کی تلاش میں اس کے روز وشب بسر ہوتے ہیں؟ یا اس کو صرف لذت ہی کی تلاش کرنی چاہئے لذت ہی کو اپنی غایتِ قصویٰ قرار دینی چاہیے! کیا یہ صحیح ہے کہ

جہاں از پئے شادی ودل خوشی است نہ از بہر بیداد ومحنت کشی است؟

یا سچی بات دراصل یہ ہے کہ

نہ ایم آمدہ از پئے حصل خوشی مگر از پئے رنج ومحنت کشی؟

متفکر ہوا دلا نکو نفاس المستعجلین:

لذتیت کی نفسیاتی شکل کا بطلان تو تم پر تھوڑے سے نفسیاتی غور وفکر سے خود ظاہر ہو جائیگا دیکھو بات یہ ہے کہ ہماری خواہشات کا مبدأ دراصل ہماری احتیاجات ہیں، اشتہائات ہیں، ہماری خالص انسانی اغراض ہیں جب ان احتیاجات وغیرہ کی تشفی ہوتی ہے، تو لذت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، لہٰذا کم از کم بعض مثالوں میں تم کو یہ ماننا ہی پڑیگا کہ ہماری خواہشات کا مطلوب اصل میں وہ اشیار ہیں جن سے ان خواہشات کی تکمیل ہوتی ہے، نہ کہ مجرد لذت، دیکھو ہمیں پہلے

Marfat.com

بھوک لگتی ہے، اور پھر کھانے کی لذت حاصل ہوتی ہے، یعنی اوّل احتیاج، پھر اس کی تشفی اور نتیجہ کے طور پر لذت، یہی بات تمام لذتوں کے متعلق صحیح ہے، لذت ہماری احتیاجات کی تشفی کے نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے اور احتیاجات کا وجود تشفی سے مقدم ہوتا ہے، اس میں شک نہیں کہ جب اس طرح ہم لذت کی چاشنی سے واقف ہو جاتے ہیں تو بعض دفعہ لذت کی لذت ہی کی خاطر خواہش کرنے لگتے ہیں، مثلاً بھوک کی تشفی سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، اس کو جان لینے کے بعد ممکن ہے کہ بغیر بھوک کے لذت ہی کی خاطر نگلنے لگیں، اور اس طرح دانتوں سے اپنی قبر اپنے ہی پیٹ کے اندر کھودنے لگیں، اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہر حالت میں ہماری خواہشات کا مطلوب لذت نہیں ہوتا، احتیاج کی تشفی، درد کی دوا، اشتہا کی تسکین ہر فرد چاہتا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر اُس کو لذت و فرحت محسوس ہوتی ہے، تو لذت بریڈلے کے الفاظ میں نام ہے تحققِ ذات یا تکمیلِ نفس کے احساس کا، کیونکہ فطری احتیاجات و اشتہا کی تشفی ہی سے ہماری ذات کی بڑی حد تک تکمیل ہوتی ہے، ان احتیاجات میں بدن و ذہن یا روح دونوں کی ضروریات شامل ہیں۔ انہی ضروریات کی تکمیل سے لذت پیدا ہوتی ہے، لہٰذا خواہش براہِ راست لذت سے متعلق نہیں ہوتی لذت براہِ راست معروض خواہش نہیں، اور نہ بذاتِ خود ہمارے لیے قیمت رکھتی ہے ہاں اس کو مقیاس قیمت قرار دیا جا سکتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کہ تھرما میٹر کا درجہ حرارت خود حرارت نہیں ہوتا، بلکہ مقیاس الحرارت ہوتا ہے، لذت ہر جسمانی و روحانی اقتضا کی تکمیل کے بعد لاحقہ کے طور پر نمودار ہوتی ہے لیکن خود کبھی مقصود بالذات نہیں ہوتی، اس لیے لذتیہ کا یہ کہنا کہ انسان صرف لذت ہی کی خواہش کرتا ہے، نفسیات کی رو سے صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اگر ہماری یہ سیدھی سادھی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے، تو خود تجربہ کر کے دیکھو، لذت کو مقصود بالذات قرار دو، اور اس کے حصول کی کوشش کرو بہت جلد تم کو معلوم ہو جائیگا کہ اس طرح لذت کا پانا اپنے سایہ کے پکڑنے سے زیادہ دشوار ہے، یہ عجیب بات ہے، اور ہر تجربہ کار لذت پرست کو شاید اس کا اقرار ہے، فلاسفہ اس کو "استبعادِ لذتیت" کے نام سے موسوم

Marfat.com

کرتے ہیں کہ لذت کی جتنی تلاش کرو اتنی ہی وہ بچ نکلتی ہے، جتنی زیادہ اس کی خواہش کرو اتنی ہی وہ کم ملتی ہے، اور جس قدر بے پروا اس کی طرف سے ہو جاؤ، اسی قدر ... پیچھے دوڑتی ہے، پروفیسر ڈیوے کے یہ الفاظ حکیمانہ صداقت کے حامل ہیں :-

جب جذبہ کا رجحان باطن کی طرف ہوتا ہے، تو وہ اپنی فنا کا آپ باعث ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ کے طور پر انسان یا تو کلبیت اختیار کرلیتا ہے اور سرد ذوقی میں مبتلا ہو جاتا ہے یا پھر ہر لحظہ نئی چیز کی تلاش میں رہتا ہے، جدید ترین احساس کا خواہشمند ہوتا ہے، جو اس کی پست اور درماندہ جذباتی فطرت کو اکسائے، اور اس میں نئے سرے سے جان ڈالے، اگر کوئی شخص محض حسی زندگی بسر کر کے اپنے وجود کے قوانین کو توڑتا ہے، اور ان اشیاء سے بے نیاز ہونا چاہتا ہے جن کے ساتھ یہ احساسات طبعاً پلٹ جاتے ہیں تو اس کی قوتِ احساس رفتہ رفتہ مضمحل ہو جاتی ہے، اور وہ اپنے مقصد کی شکست کا آپ باعث ہوتا ہے، وہ جذباتی خودکشی کا مرتکب ہوتا ہے[1]۔

اسی صداقت کا علم ہونے کے بعد سیرینیا اور اتباعِ ابیکورس نے یہ مان لیا کہ ایجابی لذت کا حصول انسان کے لیے ناممکن ہے، ان کی لذتیت میں قنوطیت کی جھلک پیدا ہو گئی اب وہ بجائے حصولِ لذت کے دفعِ الم کو مقصدِ حیات قرار دینے لگے، ابیکورس کا یہ قول مشہور ہے :-

جو چیزیں زندگی کو مسرور بناتی ہیں، وہ نہ پیہم شرب مدام ہے اور نہ صنفِ نازک کی صحبت اور نہ مرغ وماہی اور قیمتی ماکولات سے آراستہ کیے ہوئے دسترخوان بلکہ سنجیدہ و متین غور و فکر جو ہر عمل انتخاب و اجتناب کے اسباب و وجوہ کا امتحان کرتا ہے، اور ان بیہودہ خیالات و اوہام کو دور کرتا ہے، جو روح کی پریشانی اور اختلال کا باعث ہوتے ہیں[2]۔

سچ ہے :-

[1] نفسیات ص ۲۹۹ [2] دیکھو بیک ول کی کتاب The Source Book of Ancient Philosophy ص ۳۰۰ مقابلہ کرو راقم کی کتاب فلسفہ یاس ۔ ص ۸۹ ۔

اصلاحِ مزاج از مزدِ حیات است   یک تنقیۂ دماغ می باید کرد! (واقف)

ارس تی پوس کا مشہور پیرو ہگے سی پس (Hagasius) لذت کو مقصودِ حیات قرار دیتا ہے، اور اس کی طلب میں کوشاں ہوتا ہے، بہت جلد تجربہ اس کو سکھلاتا ہے کہ باغِ جہاں میں غم ہی کا تو میوہ ہر شخص کو نصیب ہوتا ہے، اور اگر کوئی بے غم ہے تو وہ بنی آدم نہیں، طرفہ جانور ہے!

عالم ہمہ در دست فسطا میخواہد   از خوانِ کرم برگ و نوا میخواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن   درویش غذا، شہ اشتہا میخواہد
(سحابی استرآبادی)

جب لذت مقصودِ حیات اور وہ ناقابلِ حصول تو پھر زندگی کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی، دنیا استخوانِ بے مغز ہے، عاقل اس استخواں کو کتوں کے آگے پھینک دیتا ہے، موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے، موت ہی میں راحتِ جان پاتا ہے، موت ہی سے سارے درد والم رفع ہو جاتے ہیں، اور غم وہم دور! ایجابی لذت ناقابلِ حصول لیکن سلبی لذت ممکن اور وہ موت کے ذریعہ، لہذا

با چرخِ ستیزہ کار مستیز و برو   با گردشِ دہر در میامیز و برو!
یک کاسۂ زہر است کہ مرگش خوانند   خوش درکش و جرعہ در جہاں ریز و برو!
(امیرالبی طلق)

یہ تھا استدلال ہگے سی پس کا، اور اس قوت واثر کے ساتھ یہ پیش کیا گیا، کہ لوگوں نے خودکشی شروع کر دی، اور اس کو "داعی الی الموت" کا خطاب دیا، جو لوگ زندگی کا مقصدِ وحید لذت اندوزی اور ذواقیت کو قرار دیتے ہیں، انہیں اسی طرح استدلال کرنا پڑیگا۔

لذتیت سے قنوطیت ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے، جب لذت پرستوں کا تجربہ یہ ہے کہ تو بتاؤ کہ

با قحبہ مستورہ لذت چہ کند کس؟

اخلاقیاتی لذتیت کے حامیوں کا یہ دعویٰ کہ لذت ہی کو زندگی کی غایتِ قصویٰ

Marfat.com

قرار دینا چاہیے، دیوانگی نہیں تو کیا ہے؟ نہیں لذت زندگی کی غایت نہیں، عقلمند لذت کی ماہیت و مقام سے واقف ہوتا ہے، طیباتِ حیات کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا لیکن وہ زندگی کا مقصود لذت اندوزی نہیں قرار دیتا، مجرد لذت کا کبھی تعاقب نہیں کرتا اس کو موجِ سراب اور جوشِ حباب سمجھتا ہے، اور اس کے دھوکے میں نہیں آتا۔

اِنَّ اللبیب بمثلہا لا یخدع

وہ اپنے مقصود کے حصول میں سرگرم عمل ہوتا ہے اور مسرت خود سایہ کی طرح اس کا پیچھا کرتی ہے، مقصود کے حصول میں اس کا ہر عمل لطف انگیز، ہر حرکت فرحت بخش ہوتی ہی، جانتے ہو کہ یہ مقصود کیا ہے؟ رضائے حق! حق تعالیٰ ہی سے اس کو آرامِ جاں اور بردِ قلبی نصیب ہوتی ہے اور عارفِ روم کے ساتھ مل کر وہ لذتیہ سے کہتا ہے ؎

گر گریزی بر امیدِ راحتے　　ہم از آنجا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست　　جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

جب لذت مقصودِ زندگی نہیں تو کیا شہرت یا اشتہارِ خلق، جاہ و مرتبت نام و نمود وہ اعلیٰ اقدار ہیں جن کا حصول زندگی کی غایت قرار دیا جا سکتا ہے؟ ہم میں سے بہت سارے ایسے ہیں جنہیں زبان کی لذت سے کان کی لذت زیادہ مرغوب معلوم ہوتی ہے، وہ اس لطیف لذت کے لیے اپنی تمام کثیف لذتوں کو قربان کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں، مصائب میں گرفتار ہونے سے نہیں گھبراتے، درد و غم برداشت کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، آفتوں اور خطروں کا مقابلہ کرتے ہیں، جب ان سے کہا جاتا ہے کہ شہرت کی قیمت بلا و مصیبت ہے تو بھی ان کی ہمت پست نہیں ہوتی، ان کے لیے شہرت غایت الغایات ہے، خیر برترین ہے، مطلق قیمت ہے، اضافی قیمت نہیں!

شہرت کی خواہش ہر انسان میں کسی قدر ضرور موجود ہوتی ہے، اس کا راز یہ ہے کہ انسان کا نفس تنقیص کو فطرۃً ناپسند کرتا ہے، اور علو و بلندی کو طبعًا پسند! بندہ ہونا اس کے

Marfat.com

نفس پرشاق ہوتا ہے، ربوبیت طبعًا محبوب ہے، ہر شخص کے باطن میں وہ جذبہ موجود ہے جس کی تصریح فرعون نے اپنے اس قول سے کی تھی "اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی" اس کی رفعت کا جب لوگ اقرار کرتے ہیں، تو وہ خوش ہوتا ہے، بقولِ عارفِ روم، فربہ ہوتا ہے:-

جانور فربہ شود از راہِ نوش   آدمی فربہ شود از راہِ گوش

شہرت کا طالب دراصل لذت ہی کا پجاری ہے، اس کا معبود بھی ایک قسم کی لذت ہی ہے، وہ اپنے نفس کی کبریائی کا اعلان چاہتا ہے، تشہیر چاہتا ہے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے ہر قیمت کو ادا کرنے پر تیار ہوتا ہے۔

اب غور کرو وہ اپنی مسرت، اپنی بردِ قلبی کی عمارت کس بنیاد پر قائم کر رہا ہے، ہوا پر تعریف جو خلق کی زبان سے نکل رہی ہے، وہ آخر ہوا ہی تو ہے، جس کا خفیف سا جھونکا بھی ہمارے بیمار شہرت کے دل کے غنچہ کو شگفتہ کر دیتا ہے، مگر کیا کوئی عقلمند اپنی مسرت کے قلعہ کو اس قدر کمزور بنیادوں پر قائم کریگا! کیا ہوا پر اس کا اقتدار ہے؟ کون جانتا ہے کہ آج ہوا کا رُخ کس طرف ہوگا؟ عوام کالانعام آج اپنے ہیرو کو اوجِ آسمان پر جگہ دیتے ہیں اور کل بغیر کسی وجہ کے خاکِ مذلت پر پٹک دیتے ہیں، آج تحسین و تصفیق ہو اور کل زجر و توبیخ، اور کچھ دن بعد مطلق ذہول اور فراموشی، یہ ہے المناک تجربہ تقریبًا ان تمام پرستارانِ شہرت کا جنہیں عوام نے کچھ دن کے لیے بت بنا کر پوجا تھا، ولنگٹن واٹرلو کا فاتح اعظم نپولین کو شکست دیتا ہے، اپنے زمانہ کی تہذیب و تمدن کو غارت و برباد ہونے سے بچا لیتا ہے، عوام اس کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں، بطلِ اعظم کا خطاب دیتے ہیں، اور کچھ ہی دن بعد لندن کی گلیوں میں یہی مشتعل و غضب آلود مجمع پتھروں سے اس کے خود کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ بس کو ولنگٹن اپنی موت کے دن تک محفوظ رکھتا ہے۔ جولیس سیزر ایک دن دنیا پر حکومت کرتا ہے اور دوسرے دن احسان فراموش دوستوں کے ہاتھ موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا ہے۔ سکندرِ اعظم کی لاش تیس دن تک بے گور و کفن پڑی رہتی ہے، اس کو عزت کے ساتھ خاک کے سپرد کرنے کو

بھی کوئی نہیں ملتا، یہ ہے انجام ہر شہرت و رفعت کا!

گیرم پسرا کہ رستم و شام شدی — یا خسروئے نیمروز یا شام شدی

نہ زور بگور می تواں برد نہ زر — افسوس کہ کیمیائے اوہام شدی

شہرت کا اثر سیرت پر کیا ہوتا ہے؟ شہرت سے عجب و پندار پیدا ہوتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان اپنی ہی ذات کو کبیر اور سارے عالم کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھتا ہے! مقید ہو کر مطلق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، بندہ ہو کر خدا بنتا ہے، جب اس کو خدا سے ڈرایا جاتا ہے تو اپنے تکبر اور عزت کے گھمنڈ میں حدود اللہ سے تجاوز کرتا ہے۔ وَاِذَا قِیْلَ لَہُ اتَّقِ اللّٰہَ اَخَذَتْہُ الْعِزَّۃُ بِالْاِثْمِ (پ ۲ ع ۹) جس شخص کا دماغ اس قدر الٹ جائے اس کو مسرت و طمانیتِ قلبی کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟ اس کو ہر قدم پر خلاف طبیعت عناصر سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے، کوئی اس پر طعن کرتا ہے اور کوئی حسد، کوئی اس کو "قطرۂ آبِ گندہ" کہتا ہے، اور کوئی "ظرفہ جانور" اس کا ہر عیب دنیا کے سامنے نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے، اس کی کوئی غلطی لوگوں کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکتی شہرت کی وجہ سے گویا وہ آفتاب کے نیچے کھڑا ہوتا ہے، اور اس کا ہر نقص اب نمایاں ہے، اور بقول عارفِ روم اس کی حالت یہ ہوتی ہے۔

خشمہا و چشمہا و اشکہا! — بر سرت ریزد چو آب از مشکہا!

ایک آرزوئے شہرت، تمنائے رفعت، خواہشِ علو اس کو ہزاروں غموں اور آفتوں میں مبتلا کرتی ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ حق سے کٹ کر خلق سے اپنا رشتہ جوڑتا ہے، اور خلق سے سوائے غم و اندوہ کے اور کیا ہاتھ آسکتا ہے، وہ خلق کے قلوب کو ہمیشہ مسخر رکھنا چاہتا ہے، اور [illegible] اعتماد کرتا ہے، سمندر کی موجوں پر گھر بنا رہا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا اساس پائدار اور مستقل ہے، فیا للعجب! خلق کے وعدہ [illegible] سے وہ خوش ہوتا ہے، لیکن اس کی خوشی کی مدت ایک رات سے زیادہ نہیں۔

وعدۂ اربابِ دنیا ہمچو خوابِ احتلام — شب ہمہ شب عیش و عشرت باشد و فردا دماغ

Marfat.com

ایسے احمق پر ترس آتا ہے، مگر اس کے مقصودِ حیات کو کوئی عاقل اپنی زندگی کا مقصود بنانا پسند نہیں کرتا۔

نہیں، ہم محض حصولِ جاہ کو زندگی کی غایت نہیں قرار دے سکتے۔ اس میں گو کسی قدر لذت ضرور ہے، لیکن یہ غیر مخلوط لذت نہیں، درد و آفت، رنج و مصیبت کا عنصر اس مرکب میں بہت زیادہ ہے، یہ انسان میں کبر و غرور پیدا کرتا ہے، اور متکبر نہ دنیا میں راحت و طمانیت پا سکتا ہے، اور نہ آخرت میں فوز و کامیابی، وہ دل کا اندھا ہوتا ہے، حق تعالیٰ کی نشانیوں کی پہچان سے محروم رہتا ہے، حق بات اس کو نظر نہیں آتی، حق کی طرف سے اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں، جب دیدِ حق نہ رہے تو پھر اس میں پوست کے سوا رہ کیا جاتا ہے؟

آدمی دیدست وباقی پوست ست ۔ دید آں باشد کہ دیدِ دوست است (رومی)

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ	میں ایسے لوگوں کو اپنی نشانیوں سے برگشتہ ہی
یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ	رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں، جس کا ان کو کوئی
الْحَقِّ (پ ۹ ع ۶)	حق حاصل نہیں۔

اسی کی طرف اشارہ ہے، اور اسی وجہ سے وہ حق تعالیٰ کا مبغوض ہو جاتا ہے۔ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْتَکْبِرِیْنَ! جب دیدِ حق کھو چکا، حق تعالیٰ کا مبغوض قرار پا چکا، تو پھر اس کے ہلاک ہونے میں باقی کیا رہا، انانیت، اپنی ذات سے محبت اپنے ہی ذکر کے انتشار کی خواہش، اپنی ہی تعریف کی محبت اور اس سے پیدا ہونے والی لذت، یہی تو ہیں اجزا اس کی ہلاکت اور بربادی کے! اسی لیے نفسِ انسانی کے امراض سے پوری طرح واقفیت رکھنے والے حکیم نے فرمایا تھا کہ

اِنَّمَا هَلَاكُ النَّاسِ بِاتِّبَاعِ	ہویٰ و ہوس کی پیروی اور اپنی تعریف و توصیف
الْهَوٰی وَحُبِّ الثَّنَاءِ	کی محبت لوگوں کی ہلاکت کا باعث ہوتی ہے۔

ایک اور طریقے سے اسی صداقت کا اظہار شدت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔

ذئبان ضاربان ارسلا فی ذربة	دو بھیڑیے حملہ کرنے والے جو بھیڑیوں کے گلے
غنم لیسا باکثر فسادًا من حب	میں چھوڑ دیے جائیں اتنا نقصان نہیں کرتے
الشرف والمال فی دین الرجل	جتنا کہ شرف اور مال کی محبت مسلمان آدمی کے
(المسلم)	دین میں کرتی ہے۔

اسی حب الشرف سے ارادۂ رفعت یا ارادۂ علو پیدا ہوتا ہے، اور جب تک انسان اس سے خالی نہیں ہوتا، اپنی آخرت درست نہیں کر سکتا۔

• تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ	یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لیے خاص کرتے
لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا	ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا
فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ (پ۲۰ ع ۱۲)	اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت خلیفہ عمر بن عبدالعزیز اس آیت کو مرتے وقت پڑھتے تھے، یہاں تک کہ پڑھتے پڑھتے جان دی!

خوب سمجھ لو کہ ہم حصولِ کمال سے نہیں منع کر رہے ہیں، ہم علم میں منفرد با کمال ہونے کی آرزو کو جائز سمجھتے ہیں، ہم کمالِ حریت یعنی شہوات و جذبات سے آزادی، دنیوی ترددات سے نجات کو حقیقی کمال قرار دیتے ہیں، ہم حق تعالیٰ اور ان کے صفات و افعال، مالکیت و حاکمیت کے علم کو سب سے زیادہ اعلیٰ و حقیقی کمال سمجھتے ہیں، اور ہمارے عقیدے کی رو سے یہ علم یہ معرفت عارفین کے لیے مرنے کے بعد نور بنیگی[1]

نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ	ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا
يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا	ہوگا، یوں دعا کرتے ہونگے کہ اے ہمارے پروردگار
(پ۲۸ ع ۲۰)	ہمارے لیے ہمارے اس نور کو آخر تک رکھ۔

---

[1] دیکھو مذاق العارفین ترجمہ احیاء العلوم جلد سوم ص ۲۷۹۔

Marfat.com

اور جو اس نورِ معرفت سے بے بہرہ ہونگے ان کا حال اس شخص کا سا ہوگا، جو اندھیریوں میں پڑا ہے۔

کمن مثلہ فی الظلمات لیس بخارج منہا (پ ۸ ع ۲) — اس شخص کی طرح جس کی حالت یہ ہو کہ وہ تاریکیوں میں پڑا ان سے نکلنے ہی نہیں پاتا۔

ہم اس جذبہ کی مذمت کر رہے ہیں، جس کی وجہ سے کمال کے پیدا ہونے کے بعد ایک شخص اپنی ذات کو کبیر اور سارے جہان کو حقیر و صغیر سمجھتا ہے، یا پھر کمال اس لیے حاصل کرنا چاہتا ہے کہ لوگوں کے دلوں اور جسموں پر حکومت کرے، اور اس سے حاصل ہونے والی لذت و خوشی کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے، اس خصوص میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا کی صورت میں سیدھے راستے کی تعلیم فرما دی تھی۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ صَبُوْرًا وَّ شَکُوْرًا وَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَّ فِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا[1] — حق تعالیٰ مجھے صابر و شاکر بنا، مجھے اپنی آنکھوں میں صغیر رکھ اور لوگوں کی آنکھوں میں کبیر بنا۔

جب میں خود اپنی آنکھوں میں حقیر رہوں، اپنی بندگی و بیچارگی کو بھول نہ جاؤں، اپنی ظلمت و جہل سے باخبر رہوں، تو پھر مجھ میں نہ اپنی تعریف کی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور نہ کبر کا مذموم جذبہ، اب حق تعالیٰ اپنے اس متواضع بندہ کو رفعت عطا فرماتے ہیں، اور حقیقی کمال سے حصۂ وافر، یہ بزرگی اور کمال کا عطیہ ہے اور اس کا استعمال معطی کے احکام کے مطابق ہی کیا جا سکتا ہے۔

مقصودِ حیات اگر شہرت یا اشتہارِ خلق نہیں تو کیا مال و دولت کو زندگی کی انتہائی غایت قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس امر میں شاید کسی کو ہم سے اختلاف نہیں ہو گا کمال ہمیشہ ایک ذریعہ ہے کسی غایت کے حصول کا، خود غایت نہیں، ہم نے ان غایات میں سے بعض پر اوپر بحث کی ہے، اور ان کو

---

[1] یہ دعا حضرت بریدہؓ کی روایت سے مسند بزار میں ملتی ہے۔

زندگی کا مقصود نہیں قرار دیا، یعنی اگر مال سے جاہ طلبی یا لذت اندوزی مقصود ہو تو پھر مقصود کے بطلان سے ذریعہ کا باطل ہونا بھی لازم آئیگا، اور اگر جائز مقصدِ حیات کے حصول میں یہ استعمال ہو تو پھر یہ ایک زبردست قوت ہے اور عظیم الشان نعمت ہے

ال را گر بہر دیں باشی حمول   نعم مالٌ صالحٌ گفتش رسولؐ

اب ہمیں زندگی کے حقیقی مقصد کے تعین کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔ قرآن کریم کی ہدایت کی روشنی میں مقصودِ حیات کا تعین ضروری ہے، حق تعالیٰ کی معرفت اور ان کی عبادت جن و انس کی تخلیق کی غایت ہے، صریح ارشاد ہے، مَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ ؎

عبادت بغیر عرفانِ حق کے ممکن نہیں، لہٰذا وحدت ذاتیہ حق کی معرفت اور اس کی عبادت کے سوا جہان کا کوئی مقصود نہیں، ہر نبی اور ہر رسول کے پیغام کا خلاصہ بس یہی تھا۔

یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ (پ ۱۲ ع ۵)	اے میری قوم تم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود و رب نہیں۔

جامیؔ نے اس مقصود کو ان دل پذیر اشعار میں ادا کیا ہے:

از زندگیم بندگیِ تست ہوس   بر زندہ دلاں بے تو حرام ست نفس

خواہد ز تو مقصودِ دلِ خود ہر کس   جامیؔ ز تو ہمیں ترا میخواہد و بس

زندگی کا مقصود، برترین مقصود، غایت الغایات حق تعالیٰ ہیں، ان کی یافت ہے، ان کی عبادت و بندگی ہے، ان کا عشق و محبت ہے، یا یوں کہو کہ ہماری ساری عبادت ہمارا جینا اور ہمارا مرنا سب خالص حق تعالیٰ ہی کے لیے ہے:۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (پ ۸ ع ۷) (ترجمہ مولانا اشرف علی تھانوی)	کہو کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو مالک ہے سارے جہان کا اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا ہے اور میں سب ماننے والوں سے پہلا ہوں۔

؎ حضرت ابن عباس نے لیعبدون کی تفسیر لیعرفون سے کی ہے۔ ۱۲

حق تعالیٰ ہمارے مقصود ہیں، اسی لیے ہمارے محبوب و مطلوب بھی۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ　　اور جو مومن ہیں اُن کے ساتھ نہایت قوی محبت ہے۔ (پ ۲ ع ۴)

وہ ہماری جان و مال، فرزندوں سے زیادہ عزیز و محبوب ہیں۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم　　خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود منِ خستہ ز کونین توی　　از بہر تو میرم و برائے تو زیم

جب زندگی کا مقصود حق تعالیٰ ہیں، تو اب دیکھو کہ وہ ہماری اس زمینی زندگی کو کس طرح بسر کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ پہلے اجمال، پھر تفصیل۔

اجمالاً یوں سمجھو کہ جب حق تعالیٰ ہمارے معبود ہیں اور محبوب ہیں تو ہمارا کام ایسا ہونا چاہیے کہ وہ کسی نہ کسی طرح عبادت میں شامل ہو جائے، یعنی ان ہی کے امتثالِ امر میں ہو، ان ہی کی رضامندی و خوشنودی کے خاطر ہو، نفس و ہوا کی پیروی میں نہ ہو، یعنی لذت اندوزی کے لیے نہ ہو، عیش پرستی کے لیے نہ ہو، جاہ طلبی کے لیے نہ ہو، ہمارے قلوب پر مالکیت و حاکمیت اللہ کی ہو، غیر اللہ کی نہ ہو، اور ہمارے ہر فعل کا تعین امرِ حق سے ہو، نفس و شیطان کے حکم سے نہ ہو، ایسی زندگی قرآن کی اصطلاح میں تقویٰ کی زندگی ہے، اور یہی کامیاب زندگی ہے، اقبالؔ کے تمہیدی الفاظ کا اس جگہ ذکر کرنا ضروری ہے، یہ اپنے الفاظ میں تقویٰ کی زندگی اور کامیاب زندگی کا خلاصہ پیش کر رہے ہیں۔

وائے مائے وائے ایں دیرِ کہن　　تیغ لا در کف نہ تو داری و نہ من
دل ز غیر اللہ بہ پرداز اے جواں　　ایں جہانِ کہنہ در باز اے جواں
تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن　　اے مسلماں مردن ست ایں زیستن
مردِ حق باز آفریند خویش را　　جز بہ نورِ حق نہ بیند خویش را
بر عیارِ مصطفےٰ خود را زند　　تا جہانے دیگرے پیدا کند

Marfat.com

اب ذرا تفصیل میں جا کر تقویٰ کی ماہیت کو اچھی طرح سمجھ لو۔ قرآن میں متقیوں کی تعریف اجمالاً یوں کی گئی ہے۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ	جو سچی بات لے کر آیا، اور جس نے اس کو سچ مانا،
بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ (پ۲۴ ع۱)	وہی لوگ پرہیزگار یا متقی ہیں۔

جو سچی بات لے کر آیا وہ نبی اور جس نے سچ مانا وہ مومن و متقی، تقویٰ نبی کو سچ ماننا اور اس کی تصدیق کرنی ہے، حق تعالیٰ انبیاء ہی کے ذریعہ علم صحیح عطا فرماتے ہیں، انبیاء اللہ ہی کے علم کو پیش کرتے ہیں، اپنی طرف سے اس میں کسی قسم کی نہ زیادتی کرتے ہیں اور نہ کمی، جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں، وہی متقی کہلاتے ہیں۔

تقویٰ کی کچھ تفصیلات کو اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ	کچھ سارا کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ	کر لو یا مغرب کو، لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ پر یقین
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتب پر
وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى	اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں
حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَ	کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو، اور مسافروں کو اور
الْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ	سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں، اور نماز
وَفِى الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى	کی پابندی رکھتا ہو، اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو، اور
الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا	جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہوں جب
عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ	عہد کریں، اور وہ لوگ مستقل رہنے والے ہوں
وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ	تنگدستی میں اور بیماری میں اور قتال میں یہ لوگ ہیں
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ	جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔
الْمُتَّقُوْنَ (پ۲ ع۶)	(ترجمہ از مولانا اشرف علی تھانوی)

اس آیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ تقویٰ کا انحصار چند عقائد، اعمال اور اخلاق پر ہے، عقائد میں اللہ پر، آخرت پر، ملائکہ پر، کُتبِ منزلہ پر، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ و السلام پر ایمان لانا داخل ہے، یہ تقویٰ کے اساس ہیں، عمل کا صدور ایقان و ایمان سے ہوتا ہے، متقی کے ایقانات جن کا نتیجہ اعمالِ صالح ہیں، یہ ہونے چاہئیں جن کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اس کے بعد ان اعمال کی بھی کسی قدر تفصیل پیش کر دی گئی ہے۔ ان کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ انفاق، اقامتِ صلوٰۃ و ایتائے زکوٰۃ، انفاق رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں سوال کرنے والوں کے لیے ہو، اور قیدیوں کے چھڑانے میں کیا جائے، انفاق کی شرطِ مقدم حق تعالیٰ کی محبت ہے، یعنی جو کچھ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ ان ہی کی محبت میں خرچ کیا جا رہا ہے، ان ہی کی خوشنودی و رضا کی خاطر، اس لیے نہیں کہ نام ہو، شہرت ہو، لوگوں کی نگاہوں میں برتری حاصل ہو، اخلاق میں ایفائے عہد اور صبر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر ہے، صبر تنگدستی میں، بیماری میں اور کفار کے ساتھ جنگ میں

تقویٰ کے متعلق دوسری تمام قرآنی تصریحات کو پیشِ نظر رکھ کر حضرت امام غزالیؒ اس کی جامع و مانع تعریف یوں کرتے ہیں کہ تقویٰ بچنا ہے ہر اس شے سے جس سے دین میں ضرر کا خوف ہو، محاورۂ عرب سے بھی اس تعریف کی تائید ہوتی ہے، کیونکہ جو بیمار پرہیز کرتا ہے اس کو عرب "متقی" کہتے ہیں، اس لیے کہ وہ ہر مضر چیز سے خواہ کھانے کی ہو یا پینے کی بچتا ہے[1] اسی طرح دین کا تقویٰ نواہی سے اجتناب ہے حضرت غزالی کی اس تعریف میں امتثالِ مامور یا عبادت پر زور نہیں دیا جا رہا ہے، بلکہ صرف اجتنابِ محظور یا گناہوں سے پرہیز ہی کی تاکید کی جا رہی ہے۔ منہاج العابدین میں وہ کسی جگہ فرماتے ہیں، کہ عبادت کے دو بڑے حصے ہیں، ایک عبادت کرنا، دوسرا پرہیز کرنا، اور یہ آدھا حصہ یعنی گناہوں اور شبہات سے پرہیز انسان کے لیے پہلے آدھے حصہ یعنی عبادت سے زیادہ بہتر ہے، بتدی عبادت کے حصہ پر زیادہ زور

---

[1] دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص ۵، (مطبوعہ نولکشور)

دیتا ہے، اور کامل اہلِ بصیرت پرہیز کا حصہ اختیار کرتے ہیں، اور ان کو ہر وقت یہ دھیان رہتا ہے کہ دل کو غیر اللہ کی طرف مائل ہونے سے بچائیں لیکن اگر دونوں حصے حاصل ہو جائیں یعنی عبادت و پرہیز تو کمال حاصل ہوتا ہے، اور سلامتی اور غنیمت میسر ہوتی ہے[1]

عبادت کے دونوں حصوں کا خیال رکھ کر تقویٰ کی جامع و مانع تعریف اس طرح کی جا سکتی ہے، تقویٰ کفر و شرک نفاق و بدعت[2] سے احتراز ہے، امتثالِ مامور، اجتنابِ محظور اور رضا بمقدور ہے، متقی کا قلب ایمان و توحید و صدق سے آراستہ ہوتا ہے، سنت پر قائم ہوتا ہے، اور امر کا اتباع کرتا ہے، نواہی سے بچتا ہے، راضی برضائے حق رہتا ہے، اسی چیز کو حضرت غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ اس طرح ادا فرماتے ہیں[3]: لَا بُدَّ لِکُلِّ مومن فی سائر احوالہ من ثلثۃ اشیاء، امرٌ یمتثلہ ونھیٌ یجتنبہ وقدرٌ یرضی بہ۔ یعنی ہر مومن کے لیے تمام احوال میں تین چیزیں ضروری ہیں، امرِ الٰہی بجا لائے، نہی سے اجتناب کرے، اور تقدیر پر راضی رہے۔ اتنی بات یہاں سمجھ لینی ضروری ہے کہ امرِ الٰہی دو طرح پر ہوتا ہے، ایک تشریعی، یہاں وظیفۂ عبودیت یہ ہے کہ اس امر کو بجا لائے، اور امرِ منفی کی صورت میں ممنوعات سے بچے، دوسرا تکوینی، یہاں بندگی کا وظیفہ یہ ہے کہ اس کو تسلیم کرے، رضا بالقضاء کا اشارہ اسی طرف ہے۔ بالفاظ دیگر جو حق تعالیٰ کہیں وہ کرے اور جس طرح وہ رکھیں اس طرح رہے اول عبادت ہے، اور ثانی "عبودیت" ایسی ہی زندگی تقویٰ

---

[1] دیکھو سراج السالکین ترجمہ منہاج العابدین ص۱۱۸ و ۱۱۹

[2] احتراز کا ذریعہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے، ذات اللہ ہی کو الٰہ اقرار دینا یعنی معبود و مستعان اس کا زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کرنا توحید ہے، اس اقرار سے شرک کا خروج ہو جاتا ہے اور توحید داخل ہو جاتی ہے، جس ذات پاک نے یہ پیغام ہم تک پہنچایا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کی رسالت کے اقرار سے دل سے کفر کا خروج ہو جاتا ہے، اور ایمان جلوہ افروز ہوتا ہے، اس کا زبان سے اقرار اور دل سے انکار نفاق ہے۔ اس کی تصدیق کے؛ ارتداد ہے۔ بدعت دین میں کسی نئی بات کا پیدا کرنا یا جو دین کی بات نہیں، اس کو دین سمجھنا ہے۔ مجملاً شرک کے جانے سے توحید، کفر کے جانے سے ایمان و نفاق کے جانے کو صدق، بدعت کے چھوڑنے سے سنت حاصل ہوتی ہے (دیکھو باب اول 'عبادت و استعانت')

[3] فتوح الغیب مقالۂ اول۔

Marfat.com

کی زندگی ہے، اور ہر معنی میں کامیاب زندگی !

اب دیکھو، زندگی میں کامیابی و سُرخ روئی کے لیے کن صفات کی ضرورت ہے، جو متقی کی سیرت کا جزو ہیں، وہ حق تعالیٰ پر شدت سے ایمان رکھتا ہے، ان سے شدت سے محبت کرتا ہے، ان کو وہ خیرِ مطلق اور قدوس مانتا ہے، زندگی اور کائنات کا مبدٔ وہ حق تعالیٰ ہی کو جانتا ہے اور لازماً زندگی کو بھی خیر سمجھتا ہے، جب اس کے اعتقاد اور اذعان کی رو سے زندگی اچھی اور زندگی کے تجربات اچھے ہیں تو پھر وہ ان سے زندہ دلی اور جوش کے ساتھ تعاونِ عمل کرتا ہے، قنوطیت و یاس کا اثر اس کے قلب پر مطلق نہیں ہوتا، اس کی زندگی اور خارجی حالات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اس کو شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے۔

عارفِ رومی نے کہا تھا، انما اللہ بغیر تبدیل المزاج[1] آدمی میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ عملی چیز کائنات کے متعلق اس کا نقطۂ نظر ہے[2] مومن کا کائنات کے متعلق نقطۂ نظر تم نے اوپر دیکھا کہ کیا ہے، اس کے نزدیک کائنات ایک قدوس و قادر و علیم مطلق ذات کی تجلیات کا مظہر ہے، اسی یقین کی وجہ سے وہ زندگی میں کامیاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اپنے مزاج کی، اسی خوشگوار تبدیلی کی وجہ سے وہ جہان کے ناموافق عناصر کو اپنے موافق بنا لیتا ہے، چار سوئے کائنات اس کو بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اقبال کے اس گمان کو صحیح کر دکھاتا ہے ؎

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے

خالقِ کائنات و ربِّ کائنات سے حسنِ ظن رکھنے کی وجہ سے کائنات بھی اس کے ارادے کے مطابق بن جاتی ہے اور انا عند ظن عبدی کی بشارت صحیح ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ سے راضی ہوتا ہے، تو حق تعالیٰ اس سے راضی ہوتے ہیں۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ کا قول سچا ہوتا ہے، صادق مصدوق ؐ نے بھی تو اس کی خبر دی تھی۔ ان للہ رجالاً

---

[1] بجز اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ مزاج ہی بدل جائے۔

[2] یہ جی کے چسٹرٹن کا مقولہ ہے جو انگلستان کا ایک مشہور ادیب گزرا ہے۔

یرضی برضاھم و یغضب بغضبھم کما انھم یرضوا برضائہ و یغضبوا بغضبہ، بعض رجال اللہ ایسے بھی ہیں، جن کی رضا سے حق تعالیٰ بھی راضی ہوتے ہیں، اور جن کے غصہ سے وہ بھی غضب فرماتے ہیں جس طرح کہ خود یہ مردانِ حق اپنے مولیٰ کی رضا سے راضی اور اس کی ناراضی سے خود بھی ناخوش ہوتے ہیں، متقی کی اس شان کو دیکھ کر کسی عارف کے اس قول کی تصدیق ہوتی ہے۔ ؎

فارغ بنشین وغم مخور وشاد بزی — ایں معنی لا الٰہ الا اللہ است!

مومن متقی کے خمیر میں وہ سب عناصر موجود ہوتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک حقیقی معنی میں کامیاب زندگی بسر کرتا ہے، ان ہی کا خیال رکھ کر امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ "جس نے تقویٰ اختیار کیا اس کے سارے ترددات رفع ہوگئے، اب وہ آرام سے جدھر چاہے سو رہے" بات اصل یہی سو حاصل ہوگئی، اپنی تائید میں وہ قتادہ کا یہ قول نقل فرماتے ہیں کہ توریت میں لکھا ہے کہ "اے فرزند آدم تقویٰ اختیار کر، اور جدھر چاہ سو رہ!" مومن متقی مجاہد ہوتا ہے، سو نہیں رہتا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو اپنی ناکامیابی کا اندیشہ نہیں، بالفاظ غوث اعظمؒ ساکن الجوارح،[1] مطمئن الجنان، منشرح الصدر، منور الوجہ، عامر البطن، غنی عن الاشیاء بخالقہا ہوتا ہے۔ لوگ اشیاء کی ملکیت کی وجہ سے خود کو غنی سمجھتے ہیں، وہ غنی بالشئی ہوتے ہیں، مجاہد متقی اشیاء سے بے نیاز ہوتا ہے وہ خود خالقِ اشیاء کو رکھتا ہے، اس لیے وہ غنی عن الشئی ہوتا ہے، اس کے ذل و افتقار کی نسبت حق تعالیٰ سے ہے، وہ حق تعالیٰ کا فقیر ہے، اشیاء سے غنی ہے، اس کے ہاتھ میں لا الٰہ الا اللہ کی شمشیر ہے،[2] اسی لیے وہ فرمانروائے موجودات ہے، اسی فقیری ہی کی وجہ سے اس کو امانت ملی، اور اس امانت کی وجہ سے خلافت عطا ہوئی اب وہ خلیفۃ اللہ ہے، اسی لیے

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ — غالب وکار آفریں کارکشا وکارساز (اقبال)

---

[1] ساکن الجوارح (بلا حرکت اعضاء)، اور قلب مطمئن اور فراخ وکشادہ سینہ، روشن چہرہ، باطن آباد اور تعلق خالق کی وجہ سے تمام چیزوں سے بے پرواہ (فتوح الغیب مقالہ ۷)

[2] ہر کہ اندر دستِ او شمشیر لا است — جملہ موجودات را فرماں روا است (اقبال)

Marfat.com

تم دنیوی نقطۂ نظر سے کامیاب زندگی کس قسم کی زندگی کو قرار دیتے ہو؟ وہی نہ جو آسمان وزمین کے برکات سے مالا مال ہو؟ دیکھو اس کا حصول ایمان وتقویٰ پر منحصر ہے۔

وَلَوْ اَنَّ اَھْلَ الْقُرٰی اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَیْھِمْ بَرَکٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ (پ۹ ع۲)

اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لے آتے اور پرہیز کرتے تو ہم اُن پر آسمان وزمین کی برکتیں کھول دیتے۔

ان برکات کے ساتھ پھر نہ رنج وتعب ہوگا نہ حزن وخوف۔

فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ (پ۸ ع۱۱)

پس جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور درستی کرے سو ان لوگوں پر نہ کچھ خوف ہی، اور نہ حزن۔

کامیاب زندگی وہی ہے نا جس میں دشمنوں سے محفوظیت حاصل ہے؟ بشرط تقویٰ اس کا وعدہ کیا جا رہا ہے۔

اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا یَضُرُّکُمْ کَیْدُھُمْ شَیْئًا (پ۴ ع۳)

یعنی تم استقلال اور تقویٰ کے ساتھ رہو تو ان لوگوں کی تدبیر تم کو ذرا بھی ضرر نہ پہنچا سکیگی۔

حق تعالیٰ کی معیت اور اعانت کی وجہ سے متقی غالب ومنصور ہوتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ (پ۱۴ ع۲۲)

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو متقی ہوتے ہیں اور نیک کردار ہوتے ہیں۔

کامیاب زندگی وہی ہے نا، جس میں سختیوں سے نجات ہو، رزقِ حلال ہو، دیکھو اسی کا تو وعدہ متقیوں سے کیا گیا ہے۔ مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ متقی کی نجات کی شکل حق تعالیٰ نکال دیتے ہیں اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دیتے ہیں، جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا (پ۲۸ ع۱۷) اس کے ہر کام کو آسان کر دیتے ہیں وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا (پ۲۸ ع۱۷)

اخروی نقطۂ نظر سے بھی متقیوں ہی کی زندگی کامیاب ہوتی ہے، کیونکہ وہ حق تعالیٰ کے

Marfat.com

محبوب ہوتے ہیں اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ۔ ان ہی کی عبادت قبول ہوتی ہے ۔

اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الْمُتَّقِیْنَ ۔ حق تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں ۔

ان ہی کو حق تعالیٰ کے نزدیک بزرگی حاصل ہے :-

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اللہ کے نزدیک سب میں بڑا شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار یا متقی ہو ۔ (پ ۲۶ ع ۱۴)

ان ہی کے اعمال قبول ہوتے ہیں ، اور گناہ معاف ہوتے ہیں :-

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا یُّصْلِحْ لَکُمْ اَعْمَالَکُمْ وَ یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (پ ۲۲ ع ۲) اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور راستی کی بات کہو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو قبول کریگا اور تمہارے گناہ معاف کردیگا ۔

دوزخ کی آگ سے ان ہی کو نجات ملتی ہے ۔

وَیُنَجِّی اللّٰہُ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِھِمْ لَا یَمَسُّھُمُ السُّوْٓءُ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (پ ۲۴ ۳۶) اور جو لوگ متقی ہیں حق تعالیٰ ان کو کامیابی کے ساتھ نجات دینگے ، ان کو نہ تکلیف پہنچیگی اور نہ وہ غمگین ہونگے ۔

ان ہی کے لیے بالآخر جنت ہے اور سامانِ عیش و عشرت :-

اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ (پ ۲۷ ع ۳) متقی لوگ بلاشبہ باغوں اور سامانِ عیش میں ہونگے

بہرحال مومن متقی کے لیے دونوں جہان کی خوشخبری ہے ، دنیا کی خوشخبری ، آرام وآسائش اور برکتیں ، غم و خوف و حزن سے نجات ، دشمنوں سے حفاظت اور حق تعالیٰ کی معیت و نصرت اور آخرت کی بشارت معاملۂ قبر ، حساب و کتاب کا آسان ہونا ، یعنی حبس و حسابِ قیامت سے رستگاری اور بخشش خداوند غفار و ستار پھر رَوح و ریحان و جناتِ نعیم [1]

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ یاد رکھو کہ اللہ کے دوستوں پر نہ کوئی اندیشہ ہی

---

[1] راحت اور غذائیں ہیں اور آرام کی جنت (سورۂ واقعہ)

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ، اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ؕ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِى الْاٰخِرَةِ ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ؕ (پ ۱۱ ع ۱۲)

اور نہ وہ مغموم ہوتے ہیں، وہ وہ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کرتے ہیں، ان کے لیے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی خوشخبری ہے

دیکھو یہی راز ہے، جس کو پا لینے کے بعد تمہاری سمجھ میں آجائیگا کہ کیوں حق تعالیٰ جو ہمارے مولیٰ ہیں اور سب سے زیادہ خیرخواہ، سب اگلے پچھلوں کو ایک ہی وصیت فرماتے ہیں، اور وہ یہی ہے کہ ہم تقویٰ کی زندگی اختیار کریں اور بس، بتاؤ تم زیادہ جانتے ہو کہ اللہ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ؟ وصیت ان الفاظ میں ہوئی ہے وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ پ ۵ ع ۱۶) واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی اور تم کو بھی کہ تقویٰ اختیار کرو۔

مومن کی خصلت تقویٰ ہے اور یہ خصلت دنیا و آخرت دونوں کی جامع ہے اور سب کاموں کے لیے کافی! مومن جانتا ہے کہ ؏

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں!

اسی لیے وہ عشق و ایمان پر اعمال کی بنیاد رکھتا ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ حق تعالیٰ کی تقویٰ سے متعلق یہ وصیت ہمیں محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے پہنچی ہے ان کی بات کا انکار کفر، ان کی بات میں شبہہ نفاق، ان کی بات میں اپنی بات کا ملانا بدعت ہے اور ان کی بات کا جوں کا توں مان لینا ایمان ہے، اس لیے گو

تعلیمِ پیرِ فلسفۂ مغربی ہے یہ
ناداں ہیں جن کو ہستیِ غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا!

Marfat.com

ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش

محسوس پر بنا ہے علومِ جدید کی

اس دور میں ہے شیشۂ عقائد کا پاش پاش

مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنونِ خام

ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش

کہتا مگر ہے فلسفۂ زندگی کچھ اور

مجھ پر کیا یہ مرشدِ کامل نے راز فاش

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است

ہر چند عقلِ کل شدۂ بے جنوں مباش

(اقبال)

آیئے اسی جنون یا عشق کی اپنے مولا سے التجا کریں:-

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر | شریکِ زمرۂ لایحزنوں کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں | مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

(اقبال)

قرآن اور علاجِ خوف[1]

اس مختصر مقالہ میں میں نے ایک خونخوار جذبہ سے نجات کے چند نفسیاتی اصول پر روشنی ڈالی ہے، جو اول سے آخر تک قرآن کریم سے ماخوذ ہیں۔ خوف سے میری مراد ماسوائے اللہ کا خوف ہے۔ میں خشیۃ اللہ کو کوئی قابلِ علاج چیز نہیں سمجھتا، معاذ اللہ، یہ تو عین مقصود ہے۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ اصول کو میں نے اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے، اور تفصیلات کو ترک کر دیا ہے۔

دو روزہ عمر پُر ز خوف و خطر است | از غصہ غذائے خلق خونِ جگر است
آسودہ دلی ز بعد مردن ہم نیست | زیرا کہ خطرہ دراں طرف بیار تر است

انسان کی دو روزہ زندگی خوف و خطرے بھری نظر آتی ہے، اس کے قلب پر اس خونخوار جذبہ کا پورا تسلط دکھائی دیتا ہے، جب وہ بستر سے اُٹھتا ہے تو لرزاں و ترساں اُٹھتا ہے، اور تمام دن کے غم و غصہ کے بعد جب وہ پھر بستر کی طرف لوٹتا ہے، تو بھی خائف و ہراساں ہوتا ہے، وہ ڈرتا کس چیز سے ہے؛ کسی کو تو بیماری کا خوف ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بیمار ہو جائے اور دنیوی کامیابی کی ساری توقعات مٹی میں ملجائیں، جب کسی عزیز یا دوست کی بیماری کی خبر سن لیتا ہے تو بےچین و پریشان ہو جاتا ہے، ڈرتا ہے کہ کہیں مر نہ جائے! کسی کو خوف ہے کہ وہ ساری دولت کھو کر فقر و فاقہ میں مبتلا نہ ہو جائے، ضعف و ذلت کا شکار نہ ہو جائے کسی کو اپنی ملازمت کی طرف سے خطرہ ہے، وہ حالات کو تشفی بخش نہیں پاتا، ڈرتا ہے کہ کہیں بہت جلد اس کو بے روزگاروں کی صف میں شریک ہونا نہ پڑے، ٹکڑوں کو

---

[1] یہ مقالہ موتمر علوم اسلامیہ جامعہ عثمانیہ میں پڑھا گیا، اور پہلی مرتبہ معارف نومبر ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔

محتاج نہ ہو جائے، رزق کا دروازہ بند نہ ہو جائے، کوئی اپنی ذمہ داریوں سے گھبرا رہا ہے، یہ ناقابل برداشت نظر آ رہی ہیں، اور وہ محسوس کر رہا ہے کہ اس کی قوتیں زائل ہو رہی ہیں، اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے، اور وہ اپنے بلند مقام سے گر رہا ہے، کوئی ہے کہ اپنے ہم جنسوں سے ملنے سے گھبرا رہا ہے، وہ ان سے گفتگو نہیں کر سکتا، خوف سے اس کی زبان سوکھی جا رہی ہے، اور پسینوں میں ڈوب رہا ہے، کوئی خوف زدہ ہے لیکن نہیں جانتا کہ کس چیز سے خوف زدہ ہے، اس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آ رہا ہے، خطرہ کا وہ تعین نہیں کر سکتا، لیکن خوف کی لہریں اس کے قلب میں اٹھ رہی ہیں اور وہ بزدلی کی موت مر رہا ہے، غرض خوف کا جذبہ عالمگیر ہے، ہر شخص اس کا شکار ہے، کون ہے جس کو فکر نہیں، غم نہیں، خوف نہیں، شیخ عماد الدین فضل اللہ نے جو بات غم کے متعلق کہی ہے، وہ خوف کے متعلق بھی صحیح معلوم ہوتی ہے، اور نفسیاتی طور پر غم نتیجہ ہے خوف کا۔

غم رازِ من و مرا گریز از غم نیست　　یارانِ قدیم را شکست از ہم نیست
غم خوی بمن کرد و من خوے بغم　　ہمچوں من و غم دو یار در عالم نیست

کیا خوف سے نجات بھی ممکن ہے؟ کیا اس ظالم جذبہ کی مردافگن قوت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے اور اس پر فتح حاصل کی جا سکتی ہے؟ کیا زندگی کے چند روز طمانیتِ خاطر اور بردِ قلبی کے ساتھ بسر کیے جا سکتے ہیں؟ علمائے نفسیات نے اس کا کیا علاج تجویز کیا ہے؟ حکماء نے کائنات کی کنہ وحقیقت پر غور کرنے کے بعد کیا اس کو خوفناک اور بے درد و بے رحم قوتوں کا نتیجہ قرار دیا ہے؟ کیا کائنات انسان کے لیے ایک صلیب کے مانند ہے، جس پر بالآخر اس کو جان دینا ہے، خواہ پامردی اور ہمت کے ساتھ، یا نامردی اور بزدلی کے ساتھ، لرزاں و ترساں؟ قرآن کریم خوف سے کس حد تک نجات دیتا ہے؟

لَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (پ ۴ ع ۹) کے کیا معنی ہیں؟ کیا کوئی مخلوق دمر بوب شے حقیقت میں نافع و ضار ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں تو پھر خوف کیوں؟ کیا یہ وہم کا نتیجہ

نہیں، باطل علم کی پیداوار نہیں؟ کیا اس سے نجات علم کی تصحیح سے ہو سکتی ہے، اختصار کے ساتھ بعض انہی اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے۔

قرآنِ کریم کی تعلیم کی رو سے خوف سے نجات اور زنجیروں سے رہائی جن سے خوف نے ہماری گردنیں باندھ رکھی ہیں، دو طریقوں سے ہو سکتی ہے، ایک طریقہ ذہنی ہے اور دوسرا خارجی، پہلا طریقہ علم کی تصحیح پر مشتمل ہے اور دوسرا علم صحیح کے استعمال پر۔

(۱) **علم کی تصحیح**:۔ خوف سے رستگاری حاصل کرنے کے لیے تمہیں سب سے پہلے اپنے مابعد الطبیعاتی مسلمات کا جائزہ لینا چاہیے، مذہب کی زبان میں یہ "عقائد" کہلاتے ہیں ان کو عقل سے ثابت کرنے کی فلسفہ میں کوشش کی جاتی ہے، اور مذہب میں ان پر محض "ایمان" لایا جاتا ہے، اور وراء طور عقل سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ خلافِ تجربہ اور خلافِ وجدان نہیں ہوتے یہ مذہبی زندگی کے وہبی جذباتی اور حسی میلانات کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جمائے ہوئے ہوتے ہیں، تجربہ ان کی تائید کرتا ہے، وجدان ان کو اپنے ذوق کے مطابق پاتا ہے عقل ان کی تردید نہیں کر سکتی۔

ایسا پہلا عقیدہ جس کو مان لینے کے بعد خوف سے قطعاً رہائی مل جاتی ہے، حق تعالیٰ کا رحیم اور حکیم ہونا ہے، فلسفیانہ الفاظ میں یوں سمجھو کہ کائنات تمہاری دشمن نہیں دوست ہے، تم روحانی کائنات میں زندگی بسر کر رہے ہو روحانی قوانین کی تم پر حکمرانی ہے، یہ قوانین کورانہ نہیں، ان کی ایک غایت اور مقصد ہے، اگر تم ان کی نوعیت کو سمجھ کر ان کے ساتھ توافق پیدا کرو گے تو تم ان کو اپنا رفیق کار پاؤ گے اور نتیجہ طمانیت اور تسکین قلبی ہو گا، اگر تم نادانی اور جہل سے ان کی خلاف ورزی کرو گے، تو نقصان تمہارا ہی ہو گا، خوف وغم میں مبتلا ہو گے، حزن و یاس سے نجات نہیں ملیگی، اور اس کا باعث خود تمہارا جہل ہو گا، اور جہل سے پیدا شدہ غلط عمل، یقین وایمان کی شاہانہ قوت سے قطعی طور پر مان لو کہ دنیا اچھی چیز ہے، کیونکہ اس کا مبدءُ خیر ہے، یہ مبدء حق تعالیٰ ہیں جو حکیم بھی ہیں اور رحیم بھی؛ حق تعالیٰ خالقِ کائنات ہیں، جان کر

Marfat.com

کائنات کو پیدا کیا ہے، وہ جو کچھ کرتے ہیں، حق ہے، بجا ہے، سراسر حکمت سے مملو ہے، باطل کا وہاں کوئی شائبہ نہیں۔ مَا صَنَعَ اللّٰہُ فَھُوَ خَیْرٌ۔

زنیکو ہرچہ صادر گشت نیکو است!

جب تمہارا یہ عقیدہ راسخ ہو جائیگا تو جہتِ خیر تم پر مبرہن ہو جائیگی، خیر کا جلوہ تمہیں ہر طرف نظر آنے لگیگا، کمالات پر تمہاری نظر جائیگی، دل میں اور نظر میں، بصر میں اور بصیرت میں حق جلوہ افروز ہوگا، یعنی تمہاری طبیعت اور تمہاری فطرت بدل جائیگی، وہ عیب جو اور عیب بیں نظر باقی نہ رہیگی، وہ ذہنیت باقی نہیں رہیگی، جو ہر جگہ نقص کی تلاش کرتی ہے، اور اس پر اعتراض کرتی ہے، مستقبل کو خوف کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور واقعات کے وقوع کے پہلے ہی ان پر شر ہونے کا حکم لگاتی ہے، اور وہمی بھوتوں سے لرزتی اور کانپتی ہے!

ایمان کی آنکھ سے دیکھو اور یقین کرنے والے قلب کی باتوں پر غور کرو کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا ان کا قول ہے، وہ مومن پر رحیم ہیں، وہ اس کے دوست ہیں، مددگار ہیں، مولیٰ ہیں، نصیر ہیں۔ وَاللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (پ ۲) جب حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں اس پر رحیم ہیں تو پھر اس کو کس چیز سے خوف ہو سکتا ہے؟ حق تعالیٰ کو اپنا 'ولی' جان کر وہ کس چیز سے ڈر سکتا ہے؟ وہ تو حق تعالیٰ کے زیر پرورش ہو جاتا ہے، اور حق تعالیٰ اس کے ساتھ بشانِ رحمت پیش آتے ہیں، اس کے تمام معاملات کے کفیل ہوتے ہیں، وکیل ہوتے ہیں، جب یہ ادراک مومن کے قلب میں قوی ہو جاتا ہے، تو اب وہ بہ یک جست خوف و حزن سے آزاد ہو جاتا ہے، اور لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ کا مصداق بن جاتا ہے!

خوف کے وقت حق تعالیٰ کے 'رحیم و حکیم' ہونے پر غور کرو، مضطرب قلب کو، پریشان دماغ کو، معطل حواس کو، کچھ دیر کے لیے اس نقطہ پر مرکوز کرو، یہی وہ نقطہ ہے جو انوار کا منبع ہے، قوتوں کا مرکز ہے، توانائیوں کا مبدء ہے، اسی پر نظر جما کر تم خوف سے نجات حاصل کرو گے، تمہارا ضعف دور ہوگا حزن رفع ہوگا، سکون حاصل ہوگا، سرور حاصل ہوگا، طمانیت و تسکینِ قلبی نصیب ہوگی۔

Marfat.com

جب حق تعالیٰ حکیم و رحیم ہیں اور وہی جہاں دار ہیں تو ظاہر ہے کہ ؎

جہاندار داند جہاں داشتن!

اب مجھے کسی تجربہ سے خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود!

ہر واقعہ کی تخلیق اس ہمہ خیر قوت سے ہو رہی ہے، جو حکیم مطلق بھی ہے، اور رحیم و کریم مطلق بھی! اب زندگی کا کوئی واقعہ میرے لیے مضر نہیں ہو سکتا، وہ بحیثیت مجموعی میرے لیے مفید ہے، خیر برتر کے حصول کا ذریعہ ہے، یہ میرا جہل ہے کہ باوجود حق تعالیٰ کو رحیم اور ولی مان کر پھر یہ خیال کرتا ہوں کہ وہ مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، در پے آزار ہیں، جب تھوڑے سے غور و فکر کے بعد میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ حق تعالیٰ رحیم ہیں، اور میرے حال کے علیم، تو جمعیت تامہ مجھے نصیب ہوتی ہے اور خوف بالکل رفع ہو جاتا ہے!

دوسرا اصول جس کے مان لینے کے بعد خوف قطعی طور پر دور ہو جاتا ہے حق تعالیٰ کی معیت کا عقیدہ ہے۔ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، جہاں کہیں ہم ہوں وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (پ ۲۷ ع ۱۶) جب مجھے اس امر کا تحقق ہو جاتا ہے کہ حق تعالیٰ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، مجھ سے بہت قریب ہیں "اقرب" ہیں، میری حفاظت فرما رہے ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے میں تمام شر و گزند سے محفوظ ہوں، ان کے حفظ و امان میں ہوں، تو پھر خوف میرے قلب سے بالکل دور ہو جاتا ہے اور سرور و اطمینان بلکہ ایک ذوق و مستی پیدا ہو جاتی ہے؛

در ہجر تو بودہ اندوہ و آزارم — از وصل تو رفت ہستی و پندارم

شادی آمد و نصیب جانم شد — اکنوں جان و تن خویش را بر احت دارم

جب بھی خوف کے حالات پیدا ہوں، واقعات خطرناک نظر آئیں، غم کے بادل قلب پر چھانے لگیں تو ہمیں اس امر کا احساس کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، وہ رحیم ہیں، قادر مطلق ہیں، ان کی معیت کی وجہ سے مجھے علو و تمکین حاصل ہے أَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ

وَاللہُ مَعَکُمْ کا مصداق ہوں، ان کو رکھ کر مجھے کس چیز سے نقصان پہنچ سکتا ہے، ان کی معیت کی وجہ سے میں ہر شے سے بلند ہوں ان کو رکھ کر مجھے کسی شے کی نہ خواہش ہے، اور نہ اس کے نہ ملنے کا غم جب مجھے کسی چیز کی خواہش ہی نہ ہو، تو پھر شکستِ خواہش کا بھی احتمال نہیں، اور اس کے نتیجہ غم وخوف سے بھی آزاد ہوں!

لیکن غم ومصیبت وخوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا احساس اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جب ہم راحت اور آسودگی، فراغت واطمینان کی حالت میں بھی حق تعالیٰ کی یافت وشہود سے غافل نہ رہے ہوں، ان کی یاد سے ذہول نہ رہا ہو، اور کسی عارف کے یہ الفاظ ہمارے پیش نظر رہے ہوں۔

تشنۂ او میر گر تو زندۂ — خاکِ آن در باش گر تو بندۂ

ذرۂ دردِ خدا در دل ترا — بہتر از ہر دو جہاں حاصل ترا

جب ہمارے دل میں حق تعالیٰ کا درد ہو، ان کی معبودیت وربوبیت کا اقرار ہو، ذلت کا اظہار ان ہی کے سامنے ہو، ذل وافتقار کی نسبت ان ہی کے ساتھ وابستہ ہو تو پھر خوف اور پریشانی کے وقت ہمیں ان کی معیت کا شدید احساس ہوتا ہے، ہم محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ہی تو ہیں، مونس ہیں غمخوار ہیں، نصیر ہیں، وکیل ہیں، اسی طرح ہمارے قلب کی حفاظت ہو جاتی ہے، سکینت وطمانیت پیدا ہوتی ہے، اور خارجی حالات میں بھی خوشگوار تغیر پیدا ہو جاتا ہے اور ہم تمام مصائب سے محفوظ ہو جاتے ہیں، اور حزن سے خوف سے رہائی مل جاتی ہے!

اگر تم خوف سے بالکلیہ رہائی کے خواہاں ہو، اس کی بیخ وبنیاد کو صحن دل سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے ہو، "جمعیت تامہ" کے حصول کے خواہشمند ہو تو خود شناس بنو، عرفانِ نفس حاصل کرو، اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ، اس عرفان کا آلہ محض عقلِ نظری نہیں، اس کے لیے اس عقل کی ضرورت ہے، جو بقول اقبال "ادب خوردۂ دل" ہے، عقلِ نظری (قیاسات عقل یونانی) تمہیں خود شناسی میں زیادہ مدد نہیں دے سکتی، یہ زیادہ تر اوہام باطل کا نقشہ تمہاری نگاہوں کے سامنے پیش کرتی اور

Marfat.com

پھر اس کو بگاڑتی رہتی ہے، یہی اس کا محبوب مشغلہ ہے، یہ تمہیں لذتِ حضور سے محروم رکھتی ہے، کیونکہ خود اس کی تقدیر میں حضور نہیں۔

انجامِ خرد ہے بے حضوری　　　ہے فلسفہ زندگی سے دوری

تمہیں اس جگہ اقبال کی نصیحت پر عمل کرنا چاہیے جو پیر روم کی ہدایت کے مطابق تم سے کہہ رہے ہیں

عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

یہ عقل تمہیں اس وقت حاصل ہوگی جب شیخ بو علی سینا کی تحقیقات سے صرف نظر کر کے "سخن محمدی" سے دل بستگی پیدا کرو۔

دل در سخنِ محمدی بند　　　اے پورِ علی زبو علی چند (حکیم خاقانی در تحفۃ العراقین)

اب تمہیں اس عقل کے ذریعہ جو نورِ وحی کی ہدایت و رہبری میں قدم اٹھا رہی ہے، اپنی ذات کی معرفت حاصل کرنی چاہیے، اس معرفت کے حصول کے بعد تم کو اپنی "عبدیت" کا علم ہو جائیگا کہ تم ذات و ماہیت کے لحاظ سے معلوم ہو خارجاً مخلوق ہو، غیر ذاتِ حق ہو، حق تعالیٰ تمہارے ظاہر و باطن ہیں، اول و آخر ہیں، تم کو محیط ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، تم سے قریب و اقرب ہیں تم حق تعالیٰ ہی کے وجود سے موجود ہو، ان ہی کی حیات سے زندہ ہو، ان ہی کے علم سے جانتے ہو، ان ہی کی قدرت و ارادے سے قوت و ارادہ کا استعمال کرتے ہو، وجود اور تمام صفاتِ وجودیہ تمہارے پاس امانت ہیں، یہ تمہارے لیے اصالۃً نہیں امانۃً ہیں، تم فقیر ہو اور امین، امانت کا استعمال جب کائنات کے مقابلہ میں کرتے ہو تو خلیفۃ اللہ کہلاتے ہو، اور جب امانت کا استعمال حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کرتے ہو ولی اللہ کہلاتے ہو۔ یہی چار اعتبارات ہیں، عبداللہ کے فقر، امانت، خلافت، ولایت، عبداللہ کے پاس اللہ ہیں، ان کی ہویت و انیت ہے، صفات و افعال ہیں ملک و حکومت ہیں، عبداللہ کا قیام ذات اللہ میں ہوتا ہے، ذات اللہ میں خوف کا کیا اعتبار ہو سکتا ہے، وہ تو سرورِ محض ہے، اس لیے عبد بھی اللہ کی جہت سے اپنے اندر ناقابلِ بیان سرور

ؔ توضیح کے لیے دیکھو مصنف کی کتاب "قرآن اور تصوف"

Marfat.com

محسوس کرتا ہے، طمانیتِ محض و ذوقِ خالص کا مخزن بن جاتا ہے، کیا خوب کہا ہے کسی عارف تام المعرفت نے ؎

چوں بدانستی کہ ظلِ کیستی — فارغی گر مردی و گر زیستی

قطرۂ نوری سراپا نور باش — بگذر از غم دائما مسرور باش

انسان اپنی اس حقیقی جہت کو فراموش کر کے خوف و حزن میں مبتلا ہوتا ہے، یا پھر خوف و حزن اس کے قلب پر محیط اس لیے ہیں کہ وہ سرے سے اپنی حقیقت سے آگاہ ہی نہیں اس کے ہر درد و غم، ہر خوف و ہراس کا علاج خود اس کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس سے جاہل، اس سے زیادہ محرومی کیا ہو سکتی!

یک سبد پُر نان ترا فرقِ سر — تو ہمی جوئی لبِ ناں در بدر

تا بزانوئے میانِ قعرِ آب — وز عطش وز جوع گشت ہستی خراب

(۲) **علم صحیح کا استعمال**:- جب تم کو اپنی حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا، جب تم نے یہ جان لیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ساتھ ہیں، اس سے قریب اور اقرب ہیں، اس کے ظاہر و باطن ہیں، جب تم کو یہ یقین ہو گیا کہ حق تعالیٰ مومن کے ولی ہیں، مولیٰ و نصیر ہیں، اس پر رحیم ہیں، تو اب خوف کے وقت اپنے ایمان کی قوت سے کام لو، جرأت کے ساتھ کہو کہ کائنات کی کوئی چیز تم کو خوف زدہ نہیں کر سکتی، اپنے خوف زدہ نفس کو مخاطب کر کے کہو۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ۚ وَ یُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ (پ ۲۴) — کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں؟ کیا تجھ کو یہ ان سے ڈراتے ہیں جو خدا کے ماسوا ہیں؟ (ڈرمت)

ہمیں اپنے تحت الشعور نفس کے ساتھ بچوں کا سا برتاؤ کرنا چاہیے، دیکھو بچہ اندھیری رات میں جاگ پڑتا ہے، اور ڈر کر رونے لگتا ہے، تم اس سے کہتے ہو، ڈرومت، یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جس سے تم کو ڈر ہو، خوف کی چیزیں صرف تمہارے خیال میں ہیں، کمرے میں نہیں، اس طرح خوف کی نفی کرنے کے بعد تمہیں ان چیزوں کا اثبات کرنا چاہیے جو سچ ہیں۔ مثلاً تم کہو گے

Marfat.com

میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہارے بازو ہی میں تو ہوں، کیا مجال کہ کوئی چیز تم کو چھو سکے، اس طرح اطمینان دلانے کے بعد کہ تم پاس ہی ہو، اور اس کو تمہاری قوت پر یقین ہونے کی وجہ سے کہ تم اس کی حفاظت کرنے کے قابل ہو، بچہ پھر بے فکری کی نیند سو رہتا ہے؛

یہی طریقہ تم کو اپنے تحت الشعوری نفس کے ساتھ استعمال کرنا چاہیے، پہلے خوف کے اسباب کی نفی کرنی چاہیے، جرأت و ہمت کے ساتھ اس کو یقین دلانا چاہیے کہ ساری دنیا میں خدا کے سوا تمہیں کوئی چیز ڈرا نہیں سکتی! تم جانتے ہو کہ یہ شیخی نہیں، واقعہ ہے، حقیقت کے عین مطابق ہے، مومن جس پر حق تعالیٰ رحیم ہیں، جس کے ساتھ وہ ہیں، جس کی نصرت کا وہ اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں، حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ جس پر وہ ستر ماؤں سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، ایسا مومن کائنات میں سوائے حق تعالیٰ کے کس چیز سے ڈر سکتا ہے اور ڈر کر مومن رہ کیسے سکتا ہے؟ دیکھو ساری اشیاء مخلوق ہیں، مربوب ہیں، محکوم ہیں، مملوک ہیں جب تک خالق و حاکم مالک و رب نہ چاہے، یہ ہمیں نقصان کیسے پہنچا سکتی ہیں؟ حکم اللہ ہی کا چلتا ہے الحکم للہ متصرف فی الامور حق تعالیٰ ہی ہیں، ان ہی کے قبضۂ قدرت میں تمام جانداروں کی پیشانی کے بال ہیں مَا مِنْ دَابَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا، ڈرنا ہمیں ان ہی کے جلال سے چاہیے، نافع وہ ہیں اور ضار وہ، معزوہ ہیں، اور مذل وہ، اور سارا عالم فقیر اور محتاج، نہ نفع کی قوت رکھتا ہے اور نہ ضرر کی، اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ولو جهد العباد ان ينفعوك بشيء لم يقضه الله لك لم يقدروا عليه ولو جهد العباد ان يضروك بشيء لم يقضه الله عليك لم يقدروا[1]

"اگر سب بندے مل کر کوشش کریں کہ تجھے اس چیز سے نفع پہنچائیں، جو اللہ نے تیرے لیے

---

[1] یہ اس حدیث کا ایک حصہ ہے، جو حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے، اور جس کو حضرت غوث الاعظم شیخ عبدالقادر جیلانی فتوح الغیب مقالہ ۴۲ میں پیش فرماتے ہیں، اور تاکید کرتے ہیں کہ ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیث کی اپنے دل سے تکرار کرتا رہے تاکہ دنیا و آخرت میں تمام آفات سے محفوظ رہے اور اللہ کی رحمت سے دونوں جہان میں عزت پائے۔

مقدر نہیں کی، تو وہ ایسا کرنے کی قدرت نہ پائیں گے اور اگر سب بندے مل کر تجھے کسی چیز سے ضرر پہنچانے کی کوشش کریں، جو اللہ نے تیرے لیے مقدر نہیں کی، تو وہ اس پر قدرت نہ پائینگے

اس صداقت پر پورا یقین رکھ کر اپنے نفس سے کہو کہ تجھے قطعاً کسی چیز سے ڈرنا نہیں چاہیے! اور زندگی کا یہ عجیب قانون ہے کہ جوں ہی خوف قلب سے دور ہوا، اب دنیا کی کوئی چیز ہمیں گزند نہیں پہنچا سکتی، حضرت دانیال ؑ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں شیروں کے غار میں ڈال دیا گیا لیکن شیروں نے انہیں چھوا تک نہیں، اس کی نفسیاتی توجیہ یہی ہوسکتی ہے کہ حضرت دانیال ؑ کا حق تعالیٰ پر اتنا اعتماد تھا کہ خوف ان کے سینہ میں مطلق نہ تھا، اور اسی وجہ سے شیر انہیں چھو نہ سکے۔ یہ تو ہم سبھی جانتے ہیں کہ کتا جو خوف زدہ شخص پر حملہ کر دیتا ہے، اس شخص کے قریب بھی نہیں آتا جو بالکل بے خوف ہوتا ہے، یہ جو سنیاسی جنگلوں میں جا بیٹھتے ہیں جہاں ہر قسم کے موذی اور درندہ جانور بھی موجود ہوتے ہیں، کیسے محفوظ رہتے ہیں؟ ان کی بے خوفی ان کے لیے سب سے بڑی حفاظت کا کام دیتی ہے، جو شخص حق تعالیٰ کو محافظ سمجھتا ہے، وہ بے خوف ہوتا ہے۔ کامل بے خوفی نتیجہ ہے ایمان راسخ کا۔

نفی کے بعد اثبات: یعنی نفس کو یہ یقین دلانے کے بعد کہ خوف کی کوئی وجہ نہیں، اب ہمیں حق تعالیٰ کی معیت، احاطت، قرب و اقربیت کا ادراک کرنا چاہیے، جس طرح کہ چھوٹے بچے کو ہم نے اپنی موجودگی کا یقین دلایا تھا، اسی طرح نفس کو حق تعالیٰ کے حضور و معیت کا یقین دلانا ضروری ہے۔ جب وہ یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کا قیام حق تعالیٰ کی ذات میں ہے، وہ حق تعالیٰ کے نور میں منکشف ہے، اس کے داہنے بائیں اوپر نیچے آگے پیچھے حق تعالیٰ کا نور ہے، وہ نور کے قلعہ میں محصون ہے، محفوظ ہے، تو پھر خوف کا سایہ اس کے قلب سے اٹھ جاتا ہے، (ظلمت نور کی موجودگی میں کیسے ٹھہر سکتی ہے؟) سرور و طمانیتِ حقیقی کا نفوذ اس کی رگ و پے میں ہونے لگتا ہے، وہ قطرۂ نور بن جاتا ہے سراپا نور ہو جاتا ہے، اور مسرتِ دائمی سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

اس مقصود کے حصول کے لیے تمہیں بعض ازلی وابدی صداقتوں کا دہرانا بڑی مدد دیگا، جب خوف دہراس کی لہریں تمہارے قلب میں قیامت خیزی کر رہی ہوں، اور وہ بیٹھا جا رہا ہو، اور تمہاری نظر میں دنیا تاریک ہو رہی ہو تو تمہیں بیٹھ جانا چاہیے، اور آہستہ سے لیکن استقلال وثابت قدمی کے ساتھ معیتِ حق کا ادراک کرتے ہوئے، ان صداقت بھرے الفاظ کی تکرار کرنی چاہیے۔

حَسْبِیَ اللّٰہُ نِعْمَ الْوَکِیْل نِعْمَ الْمَوْلیٰ وَ — مجھے اللہ کافی ہے، اور وہ کیا خوب کارساز ہے،

نِعْمَ النَّصِیْر۔ — کیا خوب مولیٰ ہے، اور کیا خوب مددگار ہے۔

ان کی تکرار سے ہماری بصیرت کی آنکھیں کھلتی ہیں، ہمیں حق تعالیٰ کی کفایت کا یقین ہوتا ہے، اور اسی یقین کی وجہ سے ہمیں خوف سے نجات ملتی ہے، آزادی نصیب ہوتی ہے۔

جامع ترمذی میں ہے کہ جب حضور انور صلعم کو کوئی مشکل پیش آتی، فکر کا بار قلبِ انور پر پڑتا ہے تو حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرماتے :-

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ

درد بھرے دل سے الغیاث کی یہ پکار نکلی کہ حی القیوم کی رحمت نے قلب کو سنبھالا دیا، اور اس کی حفاظت کے سامان فراہم کر دیے!

یاد رکھو کہ خوف طاری ہوتا ہے خوف پیدا کرنے والے خیال کو قبول کر لینے کی وجہ سے، اس خیال کا مقابلہ ذہن کی اس سطح پر رہ کر نا ممکن ہے جس سطح پر خوف کی موجیں اٹھ رہی ہیں، کوشش اس بات کی کرنی چاہیے کہ قلب اس سطح سے بلند ہو جائے، اور بالاتر سطح پر قدم جمائے، دیکھو سمندر کا طوفان اسی وقت فنا کا باعث ہوتا ہے، جب ہم اس کی تباہ کن موجوں میں گھر جاتے ہیں۔ لیکن اگر ہم کسی بلند پہاڑی پر چڑھ جائیں، تو پھر ان بلاخیز موجوں کے شر و شور سے ہمیں نجات مل جاتی ہے، کیونکہ اب ہم ان کے پہنچے سے باہر ہیں! بالکل اسی طرح جب ہم خوف کی حالت میں حق تعالیٰ کی طرف متوجہ جاتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو جاتا ہے، اور

Marfat.com

اس مقام پر پہنچ جاتا ہے، جہاں سکون ہی سکون ہے، شانتی ہی شانتی، سکھ ہی سکھ!

یاد رکھو قرآن کریم کی تعلیم کی رو سے ہمارے سارے دردوں کی دوا حق تعالیٰ ہیں، خوف و حزن کا علاج حق تعالیٰ کی محبت ہے، غیر اللہ سے بیزاری ہے، درد و الم خوف و ہراس کے وقت اپنے رُخ کو حق تعالیٰ کی طرف اخلاص کے ساتھ پھیر دو، اور عجز کے ساتھ ان کے قدموں پر پڑ جاؤ، اور پھر تمہارا کام بن نہ جائے تو شکایت کرنا۔

در حضرتِ ما دوستی یکدلہ کن
ہر چیز کہ غیر ماست آنرا یلہ کن
یک صبح با اخلاص بیا بر درِ من
گر کارِ تو بر نیاید آنگہ گلہ کن! (ابو سعید مہنہ)

Marfat.com

بے خوف زندگی

جائے روحِ پاک علیین بود　　کرم باشد کش، وطن سرگیں بود! (رومی)

آئیے آپ کو بے خوف زندگی بسر کرنے کے وہ گر بتلائیں جنہیں صوفیۂ کرام نے اپنے ذوق و وجدان سے دریافت کئے ہیں، اگر آپ انہیں سمجھ لیں اور ان پر عمل کریں تو آپ اپنی زندگی کو لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ کا مصداق بنا سکتے ہیں اور خوف و حزن سے نجات حاصل کر کے بے خوف و مطمئن زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

زیں شہد یک انگشت سا ئم بلبت　　از لذت اگر محو نگردی تف کن

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ صوفیۂ کرام کی زندگی حق تعالیٰ ہی کے قرب میں بسر ہوتی ہے، وہ حق تعالیٰ ہی کے لیے جیتے ہیں، اور انہی کے لیے مرتے ہیں، جیسا کہ عارف رومی نے کہا ہے:۔

بہر یزداں می زید نے بہر گنج　　بہر یزداں می مرد نز خوف و رنج

آنچناں خندد کہ او بیند رضا　　ہمچو حلوائے شکر او را قضا

ظاہر ہے کہ بے خوف زندگی کے حصول کا اُن کے ہاں صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے، اور وہ یہ کہ قرب حق میں زندگی بسر کی جائے، اور اس امر کا یقین پیدا کیا جائے کہ ہماری زندگی میں حق تعالیٰ ہی کی مُراد اسان ہی کی منشا، کی تکمیل ہو رہی ہے، اور یہ منشا، یا مراد خیر برتریں ہے۔

عمر خوش در قرب جاں پروردن است　　عمر زاغ از بہر سرگیں خوردن است (رومی)

اس مضمون میں ہم اسی اجمال کی تفصیل بیان کرینگے۔

صوفیہ کا یہ یقین قرآنی تصور پر مبنی ہے کہ حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں، اقرب ہیں، ہم پر محیط ہیں، ہمارے ساتھ ہیں، وہ ہم سب سے غائب نہیں، بعید نہیں، اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ "میرا رب

Marfat.com

مجھ سے قریب ہے، میری دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے اِنَّہٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ بیشک وہ مجھ سے قریب ہے، اور میری سنتا ہے۔ جب کسی اعرابی نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا ہمارا رب نزدیک ہے کہ ہم اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے جو ہم اس کو پکاریں تو جواب میں یہ آیت نازل ہوئی

وَاِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ۔ جب میرے بندے تجھ سے میرے متعلق سوال کریں تو ان سے کہہ میں قریب ہی تو ہوں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم ایک سفر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، لوگ بلند آواز سے تکبیر کہنے لگے، تو آپ نے فرمایا۔

یا ایھا الناس اربعوا علی انفسکم انکم لا تدعون اصما ولا غائبا انکم تدعون سمیعا بصیرا وھو معکم والذین تدعونہ اقرب الی احدکم من عنق راحلۃ۔

یعنی اے لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو (یعنی آہستہ کہو) تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو تم پکار رہے ہو سننے اور دیکھنے والے کو جو تمہارے ساتھ ہے اور تم جس کو پکار رہے ہو، وہ تمہارے اونٹ کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔

یہ حدیث وما کنا غائبین کی تفسیر ہے، اور فانی قریب کی تشریح، سچ ہے ؎

خواب جہل از حرم قرب مرا دور فگند ورنہ نزدیک تر از دوست کسے ہیچ ندید

اس معرفت کے حصول کے بعد جو وراء طور عقل و نظر ہے، جس کی سند نصِ قطعی و کشفِ صحیح ہے[۱]، اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ قربِ حق بغیر اختلاط و حلول و اتحاد ہمیں حاصل ہے، صوفیۂ کرام نے قرب حق کے دو پہلوؤں پر فکر کرنے ان کا تحقق حاصل کرنے اور ان پر قلب کی قوتوں کو مرکوز کرنے کی ہدایت کی ہے جس کی وجہ سے روح کو چین اور قلب کو طمانیت حاصل ہوتی ہے اور خوف و حزن سے قطعی طور پر نجات مل جاتی ہے، اور وہ دو پہلو رحمت و حکمت کے ہیں۔

(۱) قربِ حق رحمت ہے، رحمت حق ہمیں کوئی گزند یا نقصان نہیں پہنچا سکتی، نقصان پہنچانا ہرگز

۱؎ مکتوبات امام ربانی مجدد الف ثانی جلد اول مکتوب ۳۵ ۲؎ شیخ علی المہائمی در تفسیر القرآن المسمیٰ تبصیر الرحمٰن ج۱ ص۲۱۹

نہیں چاہتی، اور نہ غیر کو نقصان پہنچانے دیتی ہے، حق تعالیٰ تو حلیم ورحیم ہیں، غفور وکریم ہیں اِنَّ اللّٰہَ بِکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ وہ تو ہمیں سلامتی امن ورحمت ہی کی طرف بلاتے ہیں، اللّٰہُ یَدْعُوْا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ ان کا فضل وکرم عظیم ہے، واللہ ذو الفضل العظیم وہ ہمارے سچے دوست ہیں اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا! اگر ہم اس بنیادی واقعہ کو یاد رکھیں، فراموش نہ کریں، بھلا نہ دیں، ان کے سایۂ رحمت میں زندگی بسر کریں اور ان کی یاد میں رہیں تو کوئی چیز ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتی، کیونکہ رحمتِ حق کا مقابلہ کوئی چیز نہیں کرسکتی. حق کے مقابلہ میں کونسی قوت آسکتی ہے!

لیکن ہماری زندگی ذہول وغفلت میں گزرتی ہے، معصیت ونافرمانی میں بسر ہوتی ہے، حق تعالیٰ یارِ مہربان کی طرح ہمارے جویا ہوتے ہیں، اور ہم گدھوں کی طرح ان سے بھاگتے ہیں، اور بلاؤں اور آفتوں کا شکار ہوتے ہیں۔

تو مرا جویا چو یارِ مہرباں   من گریزاں از تو مانندِ خراں   (رومی)

جب خوف وحزن آفات وبلیات کا سامنا ہو اور ہم قربِ حق کا ارادہ قائم کرسکیں، قلب کو اس واقعہ کا یقین دلاسکیں، کہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں، اپنی رحمتِ کاملہ کے ساتھ ہمارے قریب ہیں، مونس ورفیق ہیں، یارِ مہرباں ہیں، ہماری قوتِ بازو اور ہماری پناہ گاہ ہیں، سہارا ہیں، وہی حق تعالیٰ جن کے حضور میں رات کی سیاہی اور دن کی روشنی آفتاب کی شعاع اور چاند کا نور درخت کے جاندار وپانی کے حیوان سجدہ ریز ہیں، جو محسن ومکرم ومنعم ہیں جو حرزِ ضعفا و کنزِ فقرا ہیں تو بھلا بتلاؤ کہ اس ادراک کے بعد قلب میں خوف باقی بھی رہ سکتا ہے، حاشا وکلا! قرآن کریم نے ببانگ دہل اعلان کیا ہے کہ اس ادراک یا ذکر کے بعد قلب کا اطمینان قطعی ویقینی ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُھُمْ	جو لوگ ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے
بِذِکْرِ اللّٰہِ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ	دلوں کو اطمینان ہوتا ہے، خوب سمجھ لو کہ اللہ کے
الْقُلُوْبُ	ذکر سے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے۔

"ذکر" توجہ قلبی ہی کا تو نام ہے، حق تعالیٰ کی طرف، ان کی رحمت ومحبت کی طرف قلب نے توجہ کی،

Marfat.com

اس امر کا ادراک کیا، کہ یہ رحمت ہم پر ہر جانب سے محیط ہے کہ خوف دور ہوا اور طمانیت نصیب ہوئی اور زندگی کے میدان میں قدم اعتماد و اطمینان کے ساتھ بڑھنے لگے، کیونکہ اب ہمیں یقین ہو گیا، اور ہم نے محسوس کر لیا کہ رحمتِ حق ہمارے سامنے ہے، کانَ بالمؤمنین رحیما!

لیکن خوف و خطرے کے وقت رحمت کا ادراک اور اس کا تحضر و تحقق کوئی ایسی چیز ہی نہیں جو سہولت کے ساتھ حاصل ہو سکے، اگر ہم نے راحت و آسودگی کے وقت فراغت و طمانیت کی حالت میں حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم نہ رکھا ہو تو خوف و مصیبت کے وقت ہم اس معیت کا ادراک نہیں قائم کر سکتے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں نہایت بے رحمی کے ساتھ دشمن کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی توجہ ہر حالت میں خواہ وہ نعمت و راحت کی ہو یا بلا و مصیبت کی حق تعالیٰ کی جانب لگائے رکھیں، ان کی یاد میں زندگی بسر کریں، ان کی معیت کا ادراک کرتے رہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عباسؓ کو اس بنا پر نصیحت فرمائی تھی کہ

اُذْكُرِ اللهَ فِي الرَّخَاءِ يَذْكُرْكَ فِي الشِّدَّةِ۔ — اللہ کی یاد چین کی حالت میں کر وہ تجھ کو سختی کی حالت میں یاد کریگا۔ یعنی تیری مصیبت دور کریگا۔

جب انسان آسائش اور چین کی حالت میں حق تعالیٰ کی یاد نہیں بھولتا، تو حق تعالیٰ بھی اس کو خوف و مصیبت کی حالت میں نہیں بھولتے، اس لیے تاکید کے ساتھ حکم ہوا ہے۔

فَلْيُكْثِرِ الدُّعَاءَ عِنْدَ الرَّخَاءِ — چین اور آسایش کے وقت زیادہ دعا کرتے رہو۔

جانتے ہو کہ چین کی حالت میں دعا کا کیا مطلب ہے، صرف یہ ادراک کہ ہر نعمت دراصل حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطا کی جاتی ہے۔ وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ حقیقت میں منعم، قاسم، فاعل، مسبب، موجد حق تعالیٰ ہی ہیں ان ہی کی مرضی کے مطابق نعمتوں کا استعمال ضروری ہے، اس کو دوسرے الفاظ میں "شکر" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور مومن کی شان میں فرمایا گیا ہے:

لِلْمُؤْمِنِ شُكْرٌ عِنْدَ الرَّخَاءِ — مومن چین کی حالت میں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے۔

اگر ہم آسائش و نعمت کی حالت میں حق تعالیٰ کو یاد نہ رکھیں، نعمتوں کو ان ہی کی جانب سے

نہ سمجھیں، اور اس طرح اپنا رُخ اُن ہی کی جانب نہ رکھیں، تو مصیبت و خوف کے وقت ہم حق تعالیٰ کی رحمت و رافت کا ادراک نہیں قائم کر سکتے، جو ہماری نجات کا واحد ذریعہ ہے، چین و آسائش کے وقت حق تعالیٰ کی یاد ہمیں اس قابل بناتی ہے، کہ خوف و مصیبت کے وقت ہم ان کی معیت کا ادراک کر سکیں ان کی رحمتِ کاملہ کو اپنا مونس و رفیق پا سکیں، اس لیے حضور انور ؐ نے ابن عباس سے فرمایا تھا، کہ اے لڑکے :-

احفظ الله يحفظك الله، احفظ — خدا کی نگہداشت کرو، خدا تمہاری نگہداشت کریگا۔

الله تجده امامك۔ — خدا کو حاضر جانو تو اس کو اپنے سامنے پاؤ گے۔

اگر ہم حق تعالیٰ پر نگاہ رکھیں، یعنی ان کی معیت کے ادراک میں رہیں، تو حق تعالیٰ ہمیں اپنی نگاہ میں رکھتے ہیں (اپنی رحمت و نصرت سے) اگر ہم حق تعالیٰ کی معیت کا ادراک قائم رکھیں، تو ہم انہیں اپنے سامنے ہی پاتے ہیں :-

خوف کے وقت حقیقی دعا تو یہ ہے کہ ہم کہیں "حق تعالیٰ میں آپ کا شکر گذار ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، میں آپ کی نظروں میں ہوں" پھر کوشش اس امر کے ادراک کی کی جائے کہ ہم حق تعالیٰ کی آنکھوں کے سامنے ہیں، اور ان کی رحمتِ کاملہ بادل کی طرح ہم پر سایہ فگن ہے، یا نور کی طرح ہر جانب سے ہم پر محیط۔

خوف اور بلا کے ورود کے وقت قرآن شاہد ہے، کہ پیغمبر اسلام (فداہ روحی) کو حکم ہوا کہ

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا — اپنے رب کے حکم پر صبر کرو کہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے ہو

بعض عارفین کی جیب میں یہ آیت لکھی رہتی تھی، خوف و مصیبت کے وقت اس پر نظر ڈالتے، حضور و معیتِ حق کا ادراک کرتے، اور محض اس ادراک سے کہ حق تعالیٰ ہماری اس مصیبت کو جانتے ہیں، اس تجربہ میں شریک ہیں، دیکھ رہے ہیں، جھومتے رقص کرتے، خود حضور انور ؐ پر اس آیت سے وجد طاری ہوا تھا، اور ام المومنین عائشہ صدیقہؓ آپ کے پاؤں پر گر گئی تھیں، جامیؔ نے شاید اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے،

بادرد بساز چوں دوائے تو منم | در کس منگر کہ آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشقِ ما کشتہ شوی | شکرانہ بدہ کہ خونبہائے تو منم

(۲) ثانیاً قربِ حق یا حضورِ حق حکمت و نظم کا نام ہے، حضورِ حق عالم لاہوت ہی، عالمِ لاہوت میں کامل الٰہی نظم پایا جاتا ہے، بے نظمی یا اختلال نہیں، عالمِ لاہوت میں شر نہیں فساد نہیں بلکہ کامل نظم و ترتیب ہی۔

نظمِ کائنات پر غور کرو، یہاں پر قانون اپنا عمل کر رہا ہے، اس کی شکست یا ناکامی ناممکن ہے مثلاً کوئی برقیہ (Electron) تک اپنے کام میں قصور نہیں کرتا، دوسرے برقیے نہیں ٹکراتا اُن کے درمیان تصادم ممکن نہیں، یا قرآنی الفاظ میں یوں کہو کہ صنعِ الٰہی میں کوئی خلل نظر نہیں آتا یار بار نگاہ ڈالنے پر بھی نگاہ درماندہ ہو کر لوٹتی ہی، اور کوئی عیب یا خلل نظر نہیں پڑتا

مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ | تو خدا کی صنعت میں کوئی خلل نہ دیکھیگا، تو پھر نگاہ
فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ۝ ثُمَّ | ڈال کر دیکھ لے، کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہی
ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ | پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ، نگاہ ذلیل اور درماندہ
الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ (پ ۲۹) | ہو کر تیری طرف لوٹ آئیگی۔

عالمِ لاہوت میں اس سے کہیں زیادہ کامل نظم و توافق کی حکمرانی ہی، یا یوں کہو کہ نظمِ الٰہی میں کامل توافق یا ہم آہنگی پائی جاتی ہی نغمۂ موسیقی جن تاروں سے پیدا ہوتا ہی، ان میں سے ہر تار اپنی مقررہ شرح ہی سے مرتعش ہوتا ہے، اس رفتار میں کمی یا زیادتی نہیں ہوتی، نظمِ الٰہی کا بھی یہی حال ہی، یہاں بھی ہر شے ٹھیک ٹھیک ہوتی ہی، اپنے صحیح مقام پر ہوتی ہی، اپنا مفوضہ کام انجام دیتی ہی، اس کو کامل طور پر انجام دیتی، اور اپنے صحیح وقت پر انجام دیتی ہے۔

حضورِ حق یا قربِ حق کے مفہوم میں نظمِ الٰہی بھی شامل ہے، اور چونکہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے قریب ہیں، اقرب ہیں، ساتھ ہیں، نظمِ الٰہی، حکمتِ حق بھی اس کے ساتھ موجود ہے، اگر ہم اس پر بھروسہ کریں تو اس کا ظہور بھی قطعاً ہو کر رہیگا۔

Marfat.com

جب ہم اپنی دعا میں کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ ہیں آپ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہیں، تو ہمیں اس امر کا تحقق ہوتا ہے کہ معیتِ حق نہ صرف رحمت ہے، بلکہ حکمت بھی ہے نظم بھی ہے، لہٰذا ہر شے ٹھیک ٹھیک ہو گی، اور اپنے ٹھیک وقت اور ٹھیک مقام پر ہو گی، اور اگر ہم اس یقینِ صادق کو قلب سے ہٹنے نہ دیں، تو پھر سب کچھ ٹھیک ہی ہو گا۔

عارف رومی نے اس حقیقت کو یوں ادا فرمایا ہے:

رو دیدہ بپوش تا دلت دیدہ شود — زاں دیدہ جہانِ دگرت دیدہ شود

گر تو ز پسند خویش بیروں آئی — کارت ہمہ سر بسر پسندیدہ شود

اگر دیدۂ دل" سے حکمتِ الٰہی نظر آنے لگے، اگر دل نظم الٰہی کا مشاہدہ کرنے لگے، اس یافت و شہود میں وہ جما بھی رہے، تو پھر عارف کا ہر کام پسندیدہ ہی ہو گا، اپنے وقت پر ہو گا، اپنے مقام پر ہو گا، اور ہر وقت وہ یہی کہیگا کہ "الخیر فیما وقع" جو ہوا وہ ٹھیک ہوا،

ہر چیز کہ ہست آنچناں می باید — واں چیز کہ آنچناں نمی باید نیست:

نہ صرف یہ کہ حق تعالیٰ ہمیشہ ہمارے ساتھ ہیں، اللّٰہُ مَعَنَا۔ بلکہ ہر زندگی میں منشائے الٰہی ہی کی تکمیل ہو رہی ہے، ہمارے دل، ہمارے اعضاء اور ہم خود سرتاپا حق تعالیٰ ہی کے قبضہ میں ہیں، اس منشائے الٰہی کی بنیاد نامتناہی حکمت و رحمت پر قائم ہے، یہ سرتاپا حکمت ہی، رحمت ہی، یہی خیر برتر ہی کی طرف لیجا رہی ہے، اس کو ارادۃُ اللّٰہ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے، مرضیِ مولیٰ بھی کہا گیا ہے، حق تعالیٰ کے ارادے سے توافق ان کی رضا سے راضی ہو"، رضا از و، رضا بدو، رضا در و، اعراض عن الاعتراض، حفظِ حال، "قیام فی ما اقام اللّٰہ" اس کی تعلیم تو ہمارے رہبرِ اعظم صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے ہمیں دی ہے، حق تعالیٰ کے ارادے، منشاء، مرضی سے زیادہ بہتر، زیادہ نفیس، زیادہ حسین و جمیل، زیادہ شاندار کوئی چیز نہیں ہو سکتی، نیک انجام و شادکام ہے، وہ شخص جس نے اپنے ارادے سے حق تعالیٰ کے ارادے کے خلاف کام نہ لینے کا ارادہ کر لیا اور بآوازِ بلند کہا:

اُرِیْدُ اَنْ لَا اُرِیْدُ — میں نے ارادہ نہ کرنے کا ارادہ کیا۔

Marfat.com

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں حق تعالیٰ سے معروضہ کیا ہو۔

اللّٰھم ان قلوبنا ونواصینا و جوارحنا بیدك لم تملکنا منھا شیئا فاذا فعلت ذلك فکن انت ولینا واھدنا الی سواء السّبیل [1]

حق تعالیٰ! ہمارے دل ہم خود سرتاپا اور ہمارے اعضاء آپ ہی کے قبضہ میں ہیں! آپ نے ہمیں ان میں سے کسی چیز پر بھی اختیار (کامل) نہیں دیا ہے، پس جب آپ نے یہ کیا ہے تو آپ ہی ہمارے مددگار رہیے اور ہمیں سیدھی راہ دکھاتے رہیے۔

جس کی شب و روز یہ دعا ہو کہ

اللّٰھم انی ضعیف فقو فی رضاك ضعفی وخذ الی الخیر بناصیتی واجعل الاسلام منتھی رضائی

حق تعالیٰ میں کمزور ہوں پس اپنی مرضیات میں میرا ضعف اپنی قوت سے بدل دیجیے، اور کشاں کشاں مجھے خیر کی طرف لے جائیے، اور اسلام کو (یعنی ہر امر میں آپ کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی خو کو) میری پسند کا منتہا بنا دیجیے

جب ہم حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں اپنے آپ کو دیدیتے ہیں، نرم اور ملائم اور لچکیلے ہو جاتے ہیں، ان کے ارادے کے آگے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں، ان کی رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہو جاتے ہیں تو پھر حق تعالیٰ بھی ہماری رضا سے راضی اور غضب سے غضبناک ہوتے ہیں، زبان وحی نے اس کی توثیق کی ہے: اِنّ للہ رجالا یرضی برضاھم و یغضب بغضبھم کانھم یرضوا برضائہ و یغضبوا بغضبہ

ہر چہ خواہی آں کند گر ہر چہ خواہی آں کنی
آنچہ گوئی بشنود گر ہر چہ گفت او بشنوی

جب مقام رضا کی تکمیل ہو جاتی ہے تو پھر ہمیں پروا نہیں رہتی کہ زندگی میں ہم پر کیا گزر رہی ہے، یا گزرنے والی ہے، کیونکہ ہم جاننے لگتے ہیں کہ انجام ہر چیز کا خیر ہے، خیر اب بھی اور ہمیشہ کے لیے بھی، اسی لیے شیخ جیلی نے جان کر کہا تھا کہ

---

[1] ترمذی عن ابی ہریرہ وکنز العمال عن جابر۔ [2] فتوح الغیب

Marfat.com

الرضا بالقضا هو الراحة الکبریٰ و الجنۃ العالیۃ المنفردۃ فی الدنیا وعلۃ محبۃ اللہ بعبد المؤمن فمن احبہ اللہ لم یعذبہ فی الدنیا والاخرۃ ؎	قضائے الٰہی سے راضی رہنا دُنیا میں بڑی راحت کا سبب ہے گویا جنتِ عالیہ ہے۔ اور علیہ مومن کے ساتھ حق تعالیٰ کی محبت کا باعث ہے۔ اور جس سے حق تعالیٰ محبت کرتے ہیں اس کو نہ دنیا میں تکلیف دیتے ہیں اور نہ آخرت میں۔

قربِ حق میں زندگی بسر کرنے اور اس پر یقینِ صادق حاصل کرنے کا کہ ہماری زندگی میں مرادِ الٰہی کی تکمیل ہو رہی ہے، نتیجہ خوف، پریشانی، فکر اور بے شمار خرابیوں کا کامل دفعیہ ہے۔ ہم کو اس سے اس عارفِ کامل کا نقطۂ نظر حاصل ہو جاتا ہے جو زندگی اور اس کے ہموم و غموم، افکار و پریشانیوں پر ہنستے ہوئے نظر ڈالتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ پسِ پردہ حکمتِ مطلقہ و رحمتِ مطلقہ کام کر رہی ہے۔ اور اپنے شاندار منشاء و مراد کی تکمیل کر رہی ہے اور ہمیں خیرِ برترین کی طرف لے جا رہی ہے۔ سارے جہان کو بھی وُہ اگر برف سے ڈھکا ہوا دیکھتا ہے تو گھبراتا نہیں کیونکہ وُہ جانتا ہے کہ خورشید کی ایک نظر سے یہ بھاری برف پگھل جائے گی۔

گر جہاں پُر برف گردد سر بسر   تابِ خور بگدازدش از یک نظر   (رومی)

اس لئے وُہ اپنے ساتھیوں سے عجیب امید افزا لہجہ میں کہتا ہے۔

سوئے نومیدی مرو کامید ہاست   سوئے تاریکی مرو خورشید ہاست

بے خوف زندگی بسر کرنے کا راز تم نے دیکھا بس یہی ہے کہ

(۱) قربِ حق میں زندگی بسر کرو کیونکہ

عمر خوش در قربِ جاں پروردن است   عمرِ زاغ از بہرِ سرگیں خوردن است

(۲) حق تعالیٰ کے ہاتھوں میں نرم اور ملائم بن جاؤ، تاکہ ارادۃ اللہ جاری ہو جائے۔ رضائے حق تمہارا مقام ہو، "قیام فی ما اقام اللہ" حق تعالیٰ نے جہاں تمہیں کھڑا کیا ہے وہیں کھڑے رہو، رضا بالعطا، حفظِ حال تمہارا شیوہ ہو، ہر حالت میں خوش رہو، تصادم بالقضا سے بچو۔

؎ فتوح الغیب

جن تجربات سے گذر رہے ہو، اُن پر خدا کا شکر کرتے رہو کہ ان کا تمہیں موقع دیا گیا۔ ان ہی سے سیرت کی تکمیل ہوتی ہے، دُنیا کو "رُوح ساز" وادی کہا گیا ہے، یہاں کبھی غم کے مِضراب سے اَور کبھی خوشی کے تاروں سے سیرت کے خفتہ نغمے بیدار کئے جاتے ہیں۔ ان پر ہر حال میں شکر واجب ہے۔ کرب وبلا دونوں کی ایک سی قیمت ہے۔

بہ الفاظِ دیگر جن چیزوں سے تمہیں خوف ہو، اُن ہی سے پیار کرو، تو خوف سے تمہیں ہمیشہ کے لئے نجات مِل جائے گی۔

بس زبونِ وسوسہ باشی دِلا
گر طرب را باز دانی از بلا

Marfat.com

داروئے جان

"باز گشت دم بطبیبی دکاں		مرہم دل دارم و داروئے جان"

آفت وبلا، غم و حزن، اندوہ و درد کے دفع کرنے کا طریقہ جس کی تعلیم خاص طور پر صوفیائے کرام نے دی ہے، جو سراپا دین قرآن سے ماخوذ ہے، یہ ہے کہ بلا کے نزول کے وقت نظر مُبتلی یعنی مبتلا کرنے والے پر لگی جائے، اور وہ حق تعالیٰ ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ (سورہ تغابن ۲) اللہ کے حکم کے بغیر کوئی مصیبت نہیں پہنچتی۔

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا (سورہ توبہ ۔ ۶) کہہ دے ہم کو ہرگز نہ پہنچے گا مگر وہی جو لکھ دیا اللہ نے ہمارے لئے۔

اور یہ ایمان و اذعان تو حاصل ہے کہ "فعل جمیل حقیقی ہمہ از جمال است" اَللّٰہُ جَمِیْلٌ وَّیُحِبُّ الْجَمَالَ،

ہاں فرق صرف اس قدر ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ جمالِ جلال کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے اور دوسری جگہ جمالِ جمال ہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ بس ایک عاشق کے الفاظ میں

"بجز اضمحلال در دید نعم و گم شدن و حیراں ماندن در التذاذِ آنہا کارے نباشد"

یعنی حق تعالیٰ کی نعمتوں کے مشاہدہ میں مضمحل ہو جانے اور اس کی لذت میں گم اور حیران ہو جانے کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں!

دوسرے الفاظ میں نزول بلا کے وقت قلب کو بلا پر مرکوز کرنے کے بجائے اسکو "جمیع ملک و قوی" کے ساتھ مُبتلی یعنی حق تعالیٰ پر مرکوز کرنا چاہیئے اور اس کے جلال کو جمال ہی کی ایک شان اور ایک طور جان کر اس کی یاد، اس کے شکر سے اس قدر بھر دینا چاہیئے کہ لذتِ دید کے سوا کسی اور چیز کا خیال ہی قلب میں نہ آسکے! کسی پختہ کار نے اس کیفیت کو یوں ادا کیا ہے:

وصل تو چوں دست داد ملک جہاں گو مباش		لعل تو چوں حاصل است جوہر جاں گو مباش

Marfat.com

عاشقِ روئے تو نیست طالبِ دُنیا و دین | آرزوئے جاں توئی، کون و مکاں گو مباش
گردشِ گردوں اگر قطع شود گو بشو | حاصلِ فطرت توئی، دورِ زماں گو مباش
بے تو نیرزد جوے ہر چہ بود در جہاں | مایۂ جاں ہا توئی، سود و زیاں گو مباش

اس دید کا نتیجہ وہی ہے جو قرآنِ عظیم میں یوں بیان کیا گیا ہے:

ھوالذی انزل السکینۃ فی قلوب المؤمنین لیزدادوا ایمانا مع ایمانھم (سورہ فتح - ۱)

وہی ہے جس نے قلوبِ مومنین میں اطمینان پیدا کیا تاکہ اور بڑھ جائے ان کا ایمان اپنے ایمان کے ساتھ۔

کیا یہ طریقہ آسان ہے؟ قابلِ عمل ہے؟ جب مصیبت نازل ہوتی ہے تو ہمیں تو یہ معلوم ہوتا ہے، کہ جوفِ معدہ میں اعصاب کی جو گتھی ہے اُس پر ہتھوڑے کی ایک ضرب پڑی، حواس میں اختلال پیدا ہو گیا۔ تلخیٔ بلا سے دل خون آلود ہو گیا۔ خوف و حزن کا تسلط قلب و دماغ پر ایسا ہو گیا، کہ کچھ بھی سوجھے نہ لگا۔ اس رنج رواں کے طوفان میں نفس و قلب و رُوح سب غرق ہو گئے۔

ہاں یہ سب کچھ صحیح ہے، لیکن کامل علاج صرف ایک ہے اور وہ فَفِرُّوا اِلَی اللّٰہ اور تَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا پر عمل کرنا! نزولِ بلا کے وقت قلب کی توجہ کا حق تعالیٰ کی طرف ہو جانا ہے۔ جو بلا میں مبتلا کرنے والے ہیں۔ اور خود مصیبت و بلا کی طرف سے ہٹ جاتا ہے۔ صوفیہ کے الفاظ میں "مستانہ وار ایک حملہ کرنا ہے اور علم سے نکل کر معلوم تک جا پہنچنا ہے"[ل]، یا عاشقِ وارفتہ کے الفاظ میں معاملہ کی صورت کا یہ ہو جانا ہے:

قبلہ و محرابِ من ابروئے دلدار ست و بس! | ایں دلِ شوریدہ را بایں چہ و باآں چہ کار (حافظ)

عمل کے لئے علم ضروری ہے۔ علم قائدِ عمل ہے۔ یہاں تمہارے لئے کس علم کی ضرورت ہے۔ مُبتلی کے تمام صفات کے معرفت کی ضرورت ہے۔ مُبتلی حق تعالیٰ ہیں۔ ہر بلا کا ظہور حق تعالیٰ ہی کے علم و حکم سے ہو رہا ہے اور حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، رحیم و کریم ہیں، لطیف و رؤف ہیں، محسن و منعم ہیں، حق تعالیٰ کی ان صفات کی وجہ سے اُن کی رحمت کی اُمید کا ہمارے دل میں پیدا ہونا ضروری ہے اور حسنِ ظن کا قائم

ل یک حملۂ مستانہ مردانہ بکردیم | از علم گزشتیم و بہ معلوم رسیدیم

Marfat.com

ہو نالازمی، اور یہ عین ظن شیخ جبلی رح کے الفاظ میں "حوالہ کردن مقاصد خویش برسابقہ امر عنایت جناب الٰہی ست، و نظر قلب است بسوئے حق بے تطمیع فواد و بے تمنیہ ارواح و نفوس" یعنی اپنے تمام مقاصد کو حق تعالیٰ کی عنایتِ سابقہ کے حوالے کرنا ہے اور قلب کی نگاہ کا ان پر جم جانا ہے۔ ایسی حالت میں قلب سے طمع اور روح و نفس سے تمام تمنائیں نکل جاتی ہیں اور ہم چیخ اٹھتے ہیں۔

تو در دلی! بغم این و آں کہ پردازد؟ بجائے جاں کہ تو باشی بجاں کہ پردازد؟

ز ناز نیست ترا فرصت و مرا ز نیاز کنوں بحال دلِ ناتواں کہ پردازد؟

صوفیۂ کرام کی اصطلاح میں یہ "جذبۂ خواص" ہے یعنی "توجہ قلب بسوئے حق مع انقطاع عما سواہ" قلب کا حق کی طرف متوجہ ہو جانا اور غیر حق سے کٹ جانا، غیر حق سے خالی ہو جانا ہے۔

دل یافت دیدہ کہ مقیم ہوائے تست (شمس تبریز)

یعنی "لَا مُرَادَ وَلَا اِرَادَۃَ" کا مقام کہلاتا ہے۔ اِس مقام کا انسان "جلال محبوب کو جمالِ محبوب سے بہتر خیال کرتا ہے، درد و الم کو انعام سے زیادہ تصوّر کرتا ہے۔ جانتا ہے کہ جمال و انعام میں محبوب کی مراد اپنی مراد کے ساتھ ملی جلی ہوتی ہے اور جلال و ایلام میں خاص محبوب ہی کی مراد ہے اور اپنی مراد کے برخلاف "شتّان بینہما"[1] اس سے قلب کی کشش دائمی طور پر محبوب ہی کی طرف ہوتی ہے دنیا و آخرت کی نعمتوں سے اس کا دل بے پروا ہو جاتا ہے، اس کو تمام احوال و مشاہدات سے یکسوئی و بے نیازی حاصل ہو جاتی ہے۔ حق تعالیٰ ہی سے دائمی آرام و آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی کو قرب و اتصال و وصال سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

گشتہ ام در جہاں و آخر کار
دلبرے برگزیدہ ام کہ مپرس (حافظ)

دوسرے الفاظ میں اس حالت قلبی کو "فقر" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فخر کیا ہے "الفقر فخری"۔ فقر میں قبلۂ توجہ حق تعالیٰ کے سوا کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسی فقر سے "غنا" پیدا ہوتی ہے جو حق سے کامل نیاز پیدا ہو جانے کی وجہ سے

[1] مجدد الف ثانی جلد سوم مکتوب ۶

Marfat.com

خلق سے بے نیاز ہو جانے کا نام ہے۔

آں کس کہ ترا شناخت جاں را چہ کند　　فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

دیوانہ کُنی ہر دو جہانش بخشی !　　دیوانۂ تو ہر دو جہاں را چہ کند

یہ حال تو منتہیوں کا ہے، ان کی نظر ذات بحت پر ہوتی ہے۔ ان کا قلب ماسوا اللہ سے فارغ و خالی ہوتا ہے۔ مقصود و مطلوب بجز واحدِ مطلق کے کچھ نہیں رہتا۔ تمام مقاصد اُن کے سینہ سے نکل جاتے ہیں اور اُن کی ساری ہمت حق تعالیٰ کی رضامندی کے حصول میں صرف ہوتی ہے۔ زندگی کا مقصد اُن کے نزدیک بس یہی ہے اور اسی طرف خلق کو وہ بلاتے ہیں

سر رشتۂ دولت اے برادر بکف آر　　ویں عمر گرامی بہ خسارت مگذار

دائم ہمہ جا با ہمہ کس در ہمہ کار　　می دار نہفتہ چشمِ دل جانبِ یار

مبتدیوں کا حال اس کی بالکل ضد ہے! یہ اپنے خدا کو زندگی کے مصائب سے نجات پانے کے لئے استعمال کرتے ہیں، گویا کہ وہ اُن کی خواہشوں اور تمناؤں کے پورا کرنے کا ایک آلہ ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے اس سے دعا کرتے ہیں۔ اُن کا مطلوب و محبوب اُن کی اپنی تمنائیں ہیں۔ ان کا سینہ ان کی اپنی خواہشوں اور آرزوؤں سے بھرا ہوتا ہے۔ ہر خواہش پر اُن کا دم نکلتا ہے، تلخیوں سے اُن کا دل پُر خون ہوتا ہے۔ دراصل یہی آرزو و ارمان اُن کے معبود ہیں! مصائب میں گرفتار ہونے کے بعد خوف و حُزن لوازم قلب ہو جاتے ہیں۔ اُن سے جب یہ کہا جاتا ہے کہ اپنے سینے سے مقاصد کی نفی کر دو اور قلب کی توجہ کو حق تعالیٰ پر مرکوز کرو۔ اپنے مصائب سے نظر اُٹھاؤ اور حق تعالیٰ پر اس کو قائم رکھو کہ یہی راحتِ جان کے حصول کا واحد طریقہ ہے۔

مکُن رغبت بہ چیزے ورنہ حالت بے صفا گردد

برغبت آنچہ خواہی عاقبت برہان بلا گردد

بات تو ان کی سمجھ میں آتی ہے لیکن اس پر عمل ان کے لئے ناممکن سا معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ ناممکن نہیں۔ اس کا آسان طریقہ ہم بتلاتے ہیں اور وہ یہ ہے: مصائب کے نزول کے وقت

تجریدی طور پر خدا کی طرف توجہ واقعی ابتداء میں مشکل ہے۔ ایسے وقت قرآن کریم کی آیت پر توجہ مرکوز کی جا سکتی ہے۔ مثلاً اس آیت کو لیجئے،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (اپنے رب کے حکم پر صبر کر کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے)

اس آیت کے مفہوم کو سمجھ کر کہ حق تعالیٰ ہماری حالت سے واقف ہیں، ہم ان کی نگاہوں کے سامنے ہیں اور جو خنجر دست پر قربان ہو جاتا ہے وہ سر سے لے کر پیر تک سیان ہی جان ہو جاتا ہے۔ ہم اس آیت کی تکرار کرتے جائیں تو ہمارا دلِ شوریدہ رفتہ رفتہ ساکن و مطمئن ہوتا جاتا ہے اور روح کو بتدریج روشنی و فہم عطا کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ہمیں یہ یقین ہونے لگتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے، اب بھی اور ایک کروڑ سال بعد بھی!

مبتدی کے یہ بات گو سمجھ میں نہ آئے لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ ہمارا کام نزولِ بلا کے وقت صرف اتنا ہے کہ قلب کو حق تعالیٰ سے مربوط کر لیں اور اس طریقہ سے سکینت و اطمینان حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ مصیبت خواہ کتنی ہی بڑی ہو، قلب کی سنبھال اصل چیز ہے اگر کل ہمیں سُولی ہی دی جانے والی ہو ہمیں آج صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ قلب کی وسعتوں میں حق تعالیٰ کو گھیر لیں، اور اُن کے سوا کسی اور کی جگہ نہ چھوڑیں۔

در دل بجز یکے نشاید کہ بود　　　در خانہ اگر ہزار باشد شاید!

اِس کا طریقہ ابتداء میں یہی ہے کہ کسی موزوں آیت پر توجہ کو پوری قوت سے مرکوز کر دیں ابتداء میں ہمیں معلوم ہو گا کہ ہمارا قلب گویا ایک مینا بازار ہے جس میں شور و غوغا، چیخ و پکار کے سوا کچھ نہیں۔ ہمیں اس سے بچ نکلنا ناممکن معلوم ہو گا لیکن اگر ہم آیتِ کریمہ کی تکرار کرتے جائیں، تو رفتہ رفتہ شور میں کمی ہوتی جائے گی۔ ہمیں ہمت و استقلال سے کام لینا ہو گا۔ کیونکہ جوں ہی خیال آیت پر جمنے لگے گا پھر مصیبت کا تصور ہمیں پریشان کرنے لگے گا اور ہمیں پھر شروع سے کوشش کرنی پڑے گی۔ ایسا معلوم ہو گا کہ گویا ہم ایک عمیق غار میں ہیں، جس کی تمام دیواریں چکنی اور پھسلنی ہیں، ہم اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور پھسل کر نیچے گر رہے ہیں۔ گھڑی گھڑی چڑھ رہے ہیں اور

یا... بھس کر گر رہے ہیں۔ بہرحال ہمت و استقامت کی آخر میں جیت ہوگی اور ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ توجہ آیت پر جم رہی ہے۔ اور خدا کی طرف نظر اُٹھ رہی ہے اور سکون و اطمینان کی ایک لہر باطن قلب سے سر اُٹھا رہی ہے۔

اس حالت یا مقام پر پہنچنے کے بعد ہماری تمنا صرف یہ ہوگی کہ حق تعالیٰ وہی کریں جس میں ہماری خیر ہو

ما کار خود بیار گرای گزاشتیم — گر زندہ سازد ار کشد رائے رائے دوست

اور ہماری زبان سے بے اختیار نکلے گا اللھم خرلی واخترلی ولا تکلنی الیٰ اختیاری

رسول کریمؐ نے ہمیں یہ دعا سکھلائی ہے کہ اللھم لا تکلنی الیٰ نفسی طرفۃ عین او اقل من ذالک " مولیٰ ہمیں ایک لحظہ کے لئے یا اس سے بھی کم عرصہ کے لئے ہمارے اپنے نفس اور اس کی تمناؤں کے حوالہ نہ کر" ہمیں اپنی تمناؤں کی تکمیل کی کوشش کے بجائے اور زندگی کے معاملات کو اپنی رائے کے مطابق سنوارنے کے بجائے رضائے حق کا طالب بن جانا چاہیئے۔ احکام شریعت کی رعایت اور اخلاص و توجہ بحق کا دوام ہی ہماری دولت ہے۔ ع

ایں داشتہ باش گو دگر ہیچ مباش!

تو چوں گوئی دریں میداں بیندیش — کجا خواہی رسید از کوشش خویش

برو تسلیم چوں گان شو زمانے — مگر یابی ز حال خود نشانے

بہت سے لوگ ایسے بھی نظر آئے جو زندگی کی کسی تکلیف کو دُور کرنے کے لئے برسوں درد و رقت کے ساتھ دعائیں کرتے رہے۔ آخر میں تھک کر اور "سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے" کہہ کر انھوں نے رضا بالقضا اختیار کیا۔ فوراً ہی ان کے حالات میں ایک ایسا تغیر پیدا ہوا جو اُن کی آرزوؤں و تمناؤں سے بھی زیادہ بہتر تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دُعائیں مرضئ حق کے مطابق نہ تھیں، اور انھوں نے کبھی قلب کی گہرائیوں سے نہیں کہا تھا۔

رَضِیتُ بِاللّٰہِ رَبًّا — مَیں اللہ کی ربوبیت سے راضی ہوں۔

انھوں نے ربوبیت کے بوجھ کو اپنے ہی کمزور کاندھوں پر اُٹھا لیا تھا اور اپنے کاموں کے خود رب

Marfat.com

بن گئے تھے۔ اور جب بالآخر انھوں نے محسوس کیا کہ اس سے تو کام نہیں چلتا اور

من بدستِ دوست دادم اختیارِ خویش را

کہہ کر انھوں نے "توافق بالقضا" پر اپنے نفس کو آمادہ کر لیا اور

بگذاشتہ ام مصلحتِ خویش بدو   گر بکشد و در زندہ کند او داند

کہہ کر حضرت کریم سے تقاضا چھوڑ کر حسنِ ظن سے کام لینا شروع کر دیا تو اُن کی ساری الجھنیں سلجھ گئیں، اسی لئے تو کسی عارف نے کہا تھا کہ

• سالک را دو حال باید، یکے سوختن بے تکلف، دیگرے ساختن بے تصرف۔ کما قیل

کمالِ عاشقی پروا نہ دارد

کہ جز از سوختن پروا نہ دارد

ہمیں نہ کسی سے لڑنا ہے نہ جھگڑنا، ہمیں صرف جاننا ہے، کہ کائنات کے حوادثِ یومیہ واجب الوجود جل شانہ کے ارادہ سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی کے فعل سے ظہور پذیر ہوتے ہیں، بندہ اپنے ارادے کو حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع بنا کر اُن حوادث کو اپنی مُرادیں سمجھنا چاہیئے اور ان سے لذت حاصل کرنی چاہیئے، اگر بندگی ہے تو یہ نسبت ضرور پیدا کرنی چاہیئے۔ ورنہ بندگی سے پاؤں نکالنا اور اپنے مولیٰ جل شانہٗ سے مقابلہ کرنا ہے۔ حدیث قدسی میں آیا ہے:

مَنْ لَمْ يَرْضَ بِقَضَائِيْ وَلَمْ يَصْبِرْ عَلٰى بَلَائِيْ فَلْيَطْلُبْ رَبًّا سِوَائِيْ وَيَخْرُجْ مِنْ تَحْتِ سَمَائِيْ [1]

جو میری قضا سے راضی نہیں اور میری بلا سے صبر نہیں کرتا وہ میرے سوا کوئی اور رب کو پیدا کر لے اور میرے آسمان کے نیچے سے نکل جائے۔

ہماری زندگی ایک روحانی کائنات میں بسر ہو رہی ہے، روحانی قوانین کے یہ زیر تصرف و حکمرانی ہے، روحانی قوتیں اس کو چلا رہی ہیں! تمام حوادث حق تعالیٰ ہی کے فعل سے ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ہر تجربہ میں حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اپنے ارادے کو حق تعالیٰ کے ارادے کے تابع بنا کر نظر

---

[1] مکتوبات مجدد الف ثانی ج ۳ مکتوب ۵۹

اُن کے فضل پر جا کر قلب کو ساکن و مطمئن رکھیں اور لذتِ دید سے حظ اٹھاتے رہیں۔ غم و الم ہوائے نفس سے ہمیں رہائی کرنے، ہمارے ارادے کو ارادۂ حق میں تبدیل کرنے آتے ہیں۔ ان تلخیوں کا مقصد ہمارے قلب سے ساری تلخیوں کو دور کرنا ہوتا ہے۔ اس راز کو عیسیٰ عاشقِ شیدا اپنے الفاظ میں حق تعالیٰ کی زبان سے یوں ادا کرتا ہے:

من ترا غمگین و ہم گریاں کنم — تا کت از چشمِ بداں پنہاں کنم
اناں بجوشانم کہ مکروہ نہی — بلکہ تا گیری تو ذوقِ چاشنی
زاں حدیثِ تلخ می گویم ترا — تا ز تلخیہا فرو شویم ترا
تو ز تلخی چوں ہمہ پر خوں شوی — پس ز تلخیہا ہمہ بیروں شوی

اس ساری گفتگو کا کوئی یہ مطلب نہ سمجھ لے کہ ہمیں اپنے فرائضِ زندگی کی ادائی میں جد و جہد نہیں کرنی چاہیئے، تساہل کی زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ نہیں، یہاں تساہل حرام ہے "الکاہلۃ حرام" ہمیں مردانہ وار قدم اٹھانا چاہیئے۔ زندگی کے تمام فرائض کو جرأت و استقلال سے ادا کرنا چاہیئے۔

شیر شو شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ
مرد شو مردانہ پیشِ ناصحاں یا گوش گیر

ہمیں مجاہدانہ زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ لیکن اسی دوران میں ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمیں ہر وقت پر صحیح مقام تک پہنچایا جا رہا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کچھ ایسے مل جل کر کام کر رہے ہیں کہ انجام تعجب خیز طریقہ پر اچھا ہو رہا ہے۔ صاف طور پر نظر آنے لگتا ہے کہ حق تعالیٰ کا دستِ کرم ہماری رہبری کر رہا ہے، وہ حالات میں ترتیب و تطابق پیدا کر رہے ہیں۔ خارِ خشک بھی گلِ تر ہوتا جاتا ہے۔ اس حالت میں ہم عقل و ہوش کے پرستاروں سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

طالب اندر زلفِ لیلیٰ بند کار از عقلِ مجنوں کن
کہ عاشق را زیاں دارد مقالاتِ خردمندی

قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ اٰمَنَّا بِهٖ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (ملک ..)

Marfat.com

قرآن اور علاجِ حزن

بے خلشہا زیستن نا زیستن — باید آتش در تہِ پا زیستن

زیستن این گونہ تقدیرِ خودی است — از ہمیں تقدیر تعمیرِ خودی است (اقبال)

ابتلاء یا آزمائش انسان کی تقدیر ہے، اور ابتلاء ہوتی ہے زندگی کی محبوب و مرغوب چیزوں کے روک لیے جانے یا فنا کر دیے جانے سے، ان پر آفات کے نزول سے، ان کے حصول میں مشکلات کے پیدا ہونے سے، خلش سے، درد و غم سے، رنج و الم سے، قلب کے تار ٹوٹنے سے یا زیادہ جامع الفاظ میں یوں کہو خوف سے، بھوک سے، جان و مال و ثمرات کے نقص و کمی سے، اور ابتلاء کا مقصد سیرت کی تعمیر ہوتی ہے، خودی کی پختگی ہوتی ہے، حیات کی زیادتی ہوتی ہے، قوت کی توفیر ہوتی ہے، خاص و عام رحمتوں اور راحتوں کا نزول ہوتا ہے اور جو شخص ابتلاء سے بھاگنا چاہتا ہے، وہ ایک کلی و وجوبی قانون کی ہمہ گیر قوت سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اور نادانستہ طریقہ پر اپنا ہی نقصان چاہتا ہے، اپنی خودی کی تکمیل و تعمیر نہیں چاہتا، حیات و قوت کی توفیر نہیں چاہتا، وہ بھول جاتا ہے کہ

دوامِ ما ز سوزِ نا تمام است — چو ماہی جز تپش بر ما حرام است

مجو ساحل کہ در آغوشِ ساحل — تپیدِ یک دم و مرگِ دوام است (اقبال)

اپنے اس دعوے کی تائید میں ہم آپ کو کچھ دیر کے لیے فکر و نظر کی دعوت دیتے ہیں، اور کائنات و فطرتِ انسانی کے چند کلی و جزوی قوانین کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔

یک تنقیۂ دماغ می باید کرد!

انسان، احتیاج کا دوسرا نام ہے، انسان کی عضویت کی تحدید و تقیید ہی سے احتیاج

پیدا ہوتی ہے یعنی اس کی فطرت ہی میں احتیاج ہے، وہ حاجتمند ہے، فقیر ہے، اور درد نتیجہ ہے اسی فقر و احتیاج کا، اور فطری طور پر وہ اس درد کی دوا چاہتا ہے۔

عالم ہمہ در دست دوا میخواہد　　از خوانِ کرم برگ و نوا میخواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن　　درویش غذا شہ اشتہا میخواہد (سحابی استرآبادی)

اب اس عالم اسباب و علل میں جس کی تشبیہ انگارہ سے دی جا سکتی ہے، مجاہدہ اور عمل ہی سے احتیاج و فقر اور درد و غم بڑی حد تک دور کیے جا سکتے ہیں، جو اپنی بنیاد و اساس کے طور پر علم صحیح کو فرض کرتا ہے، مجاہدہ بغیر علم صحیح کے ممکن نہیں، اور علم صحیح عمل سے علٰحدہ ہو کر نافع نہیں ہو سکتا، اس لیے ہم انہیں دو پہلوؤں کو یہاں اختصار کے ساتھ پیش کر کے اپنے دعوے کی تائید کریں گے۔

یاد رکھو کہ انسان کی زندگی اس معنی میں ہمیشہ خطرناک زندگی ہے کہ درد و غم، سوز و الم اس کی ماہیت میں داخل ہیں، کائنات کے اندرونی اسرار سے جو لوگ واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کا ایقان ہے کہ کائنات کا مبدء حق تعالیٰ ہیں جو حکمت و خیر کے اعتبار سے مطلق و لامحدود ہیں، وہی اس کائنات پر حکمراں ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، مشیت انہی کی نافذ ہو رہی ہے، لہٰذا یہ کائنات مظہر ہے خیر و حکمت کا، پھر درد و غم جو انسان کی زندگی کا ساتھ نہیں چھوڑتے، اور ہر رنگ میں انسان جو جلتا رہتا ہے، اس میں کونسی حکمت ہے، اور خیر کا کونسا نمایاں پہلو ہے؟ ان ہی واقفانِ راز کا بیان ہے، کہ اہل ذکر یا مشاہدہ پر اس کی حکمت مبرہن ہے۔ اس کی توضیح تین قوانین کی شکل میں پیش کی جا سکتی ہے۔

(۱) درد و غم، سوز و الم نتیجہ ہے، جرم و معصیت کا، گناہ و بدکرداری کا، بد اخلاق اور ان سے پیدا ہونے والے افعال و اعمال کا، اس راز کو قرآنِ حکیم نے اس آیت میں پیش کیا ہے:-

مَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِيبَةٍ فَبِمَا	تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں
کَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ	کے کیے ہوئے کاموں سے ہے اور بہت سے تو

Marfat.com

كَثِيرٍ ۔ (پ ۲۵ ع ۵) درگزرہی کردیتا ہے ۔

اسی راز کو کسی اور جگہ زیادہ واضح الفاظ میں یوں ظاہر فرمایا گیا ہے :-

اَوَلَمَّا اَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۔ اور جس وقت تم کو ایک تکلیف پہنچی، کہ تم اس سے دو چند پہنچا چکے ہو، تو کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی، آپ فرما دیجیے کہ یہ تکلیف تم کو تمہاری طرف سے پہنچی ۔

صاحبِ کتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس اصول کی تفسیر میں فرمایا کہ اِنَّمَا هِیَ اَعْمَالُكُمْ تُرَدُّ عَلَيْكُمْ [1]، یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو تم پر لوٹائے جاتے ہیں، قرآن و خبر سے اس راز کو معلوم کر کے حکماء وصوفیائے اسلام نے یہ اصول قرار دے لیا ہے کہ

اِن جمیع الوجود یقابلکم بحسب ما برز منکم من الاعمال فانظروا کیف تکونون فانّ الظل تابع للشاخص فی العوج والاستقامۃ (شیخ ابوالنجا)

یعنی جو اعمال تم سے سرزد ہوتے ہیں ویسا ہی بدلہ بھی دیا جاتا ہے، اس لیے ذرا اپنے اعمال پر نظر رکھنا، کیونکہ ظل یا سایہ شخص کے تابع ہوتا ہے، اگر کوئی شے ٹیڑھی ہے، تو اس کا سایہ بھی ٹیڑھا ہوگا، اور اگر سیدھی ہے تو سایہ بھی سیدھا ہوگا جس نے توقع کی ٹیڑھی شے کا سایہ سیدھا ہو تو اس نے محال کی تمنا کی ۔ مَنْ طلب استقامۃ الظل مع عوج الشاخص فقد رام المحال ۔ اس لیے یاد رکھو اور خوب سمجھ لو کہ یہ جو سوز و غم تمہارے قلب کو کھائے جا رہا ہے نتیجہ ہے تمہارے ہی اعمال بد کا، مثلاً جب تم کسی کو دیکھتے ہو کہ وہ تم کو ناحق آزار پہنچا رہا ہے، بے وجہ تکلیف دے رہا ہے، زبردستی ستا رہا ہے، تو ذرا سوچ کر دیکھو کہ کیا تم نے بھی اسی قسم کی حرکت کسی معصوم و مظلوم کے ساتھ نہیں کی تھی، جس نے تم کو کوئی تکلیف نہیں پہنچائی تھی؟ ممکن ہے کہ فوراً یاد نہ آئے، لیکن تحت الشعور نفس کی گہرائیوں میں یہ واقعہ ضرور مندرج ہے، وہ ایک روز تمہارے غور و فکر کرنے پر ظاہر و باہر ہو جائیگا، ہر حادثہ اور مصیبت کے وقت اسی قسم کی سوچ بچار

[1] انما ھی اعمالکم احصیہا علیکم فمن وجد خیراً فلیحمد اللہ ومن وجد غیرہ فلا یلومن الا نفسہ

سے کام لیا جائے اور دیانتِ فکری کو ہاتھ سے نہ دیا جائے تو آدمی بالآخر اس امر کا قائل ہو جاتا ہے کہ اللوم علیَّ لا علیھم ملامت مجھ پر ہے، میرے دشمنوں پر نہیں، کیونکہ حقیقی معنی میں میرا دشمن کوئی نہیں، میں ہی اپنی ذات کا بڑا دشمن ہوں، دوسرے دشمن میری ہی طبیعت کے پیدا کردہ ہیں ؎

زادۂ طبع من اند آنانکہ خصمانِ من اند (خاقانی)

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی جان و دل سے تصدیق کرنے لگیگا کہ اعدیٰ عدوک نفسک التی بین جنبیک تیرا سب سے بڑا دشمن تیرا وہ نفس ہے جو تیرے دونوں پہلوؤں میں ہے! درد و الم تیرے ہی ہاتھوں کی کمائی ہے، یداک کسبتا وفوک نفخ[1]

جو مصیبت و آفت، درد و غم، گناہوں کی عقوبت کے طور پر وارد ہوتے ہیں، ان کی پہچان بس یہی ہے کہ انسان نزولِ بلا پر صبر نہیں کرتا۔ اپنی جیسی بے بس و بیکس ہستیوں کی طرف اپیل کرتا ہے، جزع و فزع کرتا ہے، شکایتوں کا دفتر کھول دیتا ہے، "مقامِ شکویٰ" میں داخل ہو جاتا ہے، اور "مقامِ صبر" سے خارج ہو جاتا ہے۔ مصیبت کے دفع کرنے کا واحد علاج یہی ہے کہ اپنے اعمال کی اصلاح کی جانب توجہ کرے، اپنے نفس کا تزکیہ کرے، قلب کا تصفیہ کرے، اپنے سر کا اوہام باطلہ سے تخلیہ کرکے، خیر کی جانب لوٹے، نور کی طرف پلٹے ظلمتوں سے نکل جائے، غم والم کی تاریکیاں خود بخود دور ہو جائینگی، اور راحت و مسرت کا نور اس کی رگ و پے میں سرایت کرنے لگیگا۔

درد و غم وہ اشارات ہیں جو انسان کو اس کے اعمال کی جانب متوجہ کرتے ہیں، یہ خیر کی طرف ہدایت کرتے ہیں ان کا وجود اس پر اسرار کائنات میں بے معنی نہیں، شرِ محض نہیں، یہ خیر کے تحقق کا زبردست آلہ ہیں، خیر کی منزل تک لیجانے کا نہایت قوی ذریعہ ہیں، یہ جرائم و معاصی کی ظلمتوں کو رفع کرنے میں نور کا کام دیتے ہیں، ایک لفظ میں یوں

---

[1] قول شیخ اکبرؒ۔ تیرے ہاتھوں نے کمایا، اور تیرے منہ نے پھونکا،

Marfat.com

کہو کہ یہ خام کو پختہ بنانے کے لیے ضروری ہیں، اقبال نے اسی مفہوم کو یوں ادا کیا ہے

جہانِ ما کہ جز انگارۂ نیست　　　اسیرِ انقلابِ صبح و شام است

ز سوہانِ قضا ہموار گردد　　　ہنوز ایں پیکرِ گِل ناتمام است

سوہانِ قضا پیکرِ خاکی کے نقص و تحدید کو، کجی و خامی کو غم و الم کے انگارہ سے دور کرتا جاتا ہے، اور اس کو کمال کی طرف کھینچ لاتا ہے!

(۲) بعض دفعہ درد و الم، سوز و غم معاصی و جرائم کی عقوبت کے طور پر نہیں عائد کیے جاتے، مقصود محض سزا دینا نہیں ہوتا، بلکہ تطہیر ہوتی ہے، تکفیر و تمحیص ہوتی ہے، شہوتوں اور لذتوں کے اتباع سے نفس میں تاریکی پیدا ہوتی ہے، اوامرِ الٰہی کی مخالفتوں سے قلب مردہ ہو جاتا ہے، درد و غم، سوز و الم نفس سے ظلمتوں کو رفع کرتے ہیں، مردہ قلب کو جِلاتے جگاتے ہیں، حق تعالیٰ کی طرف اس کا رُخ پھیرتے ہیں، جو نورِ مطلق ہیں، وہ ان کی طرف رُخ کر کے نورانی ہو جاتا ہے، اور گناہوں کی ساری تاریکیاں دور ہو جاتی ہیں، بلاؤں اور مصیبتوں سے نفس دب جاتا ہے، ذلیل و خوار ہو جاتا ہے، حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے، شہوتوں اور لذتوں سے ٹوٹ کر ان سے جڑ جاتا ہے، ربط قائم کر لیتا ہے، غم سے زیادہ موثر تطہیر کے لیے کوئی اور شے نہیں، اور بلا آتی ہے اسی تطہیر کی خاطر۔

ایں بلائے دوست تطہیرِ شما است　(رومی)

اسی مقصود کو پیشِ نظر رکھ کر عارفِ روم درد و غم قبض سے رنجیدہ نہ ہونے کی تاکید فرماتے ہیں، اور اس کو سالک کے لیے مفید قرار دیتے ہیں۔

چونکہ قبض آمد تو دروے بسط بیں　　　تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو　　　آں صلاحِ تست آیس دل مشو

اس خیال سے صوفیائے کرام نے بلا و مصیبت کو حق کے انعامات سے زیادہ بہتر قرار دیا ہے، آلامِ محبوب بہ از انعامِ محبوب، بلا بھی عطا ہے، اور عطا پر غم کیسے، بلا از دوست عطا است و

از عطا نالبدن خطا است

زخم چوں از تو رسد باہمہ آزار خوشیم   کے ز آزار تو بیزار شود جان حسین

بلا و غم جب تکفیر و تمحیص کے لیے آتے ہیں تو اس کی صاف علامت یہی ہے کہ مبتلیٰ جزع و فزع نہیں کرتا، صبر جمیل سے کام لیتا ہے، دوستوں اور ہمسایوں کے سامنے اپنی مصیبت پیش کر کے شکوی و شکایت نہیں کرتا، صبر کر کے بے حساب اجر کا اُمیدوار رہتا ہے۔

(۳) اور بعض دفعہ بلا و مصیبت محض تطہیر و تکفیر کے لیے بھی نہیں آتی بلکہ ارتفاعِ درجات اور بلوغِ منازل عالیات اس کا مقصد ہوتا ہے، یہ قانون اہل اللہ کے متعلق ہے، جنہوں نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا ہے، جن کے قلوب پاک و مصفیٰ ہیں، جن میں ربط بحق قائم ہے، دیکھا جاتا ہے کہ کثرت سے بلائیں ان ہی پر نازل ہوتی ہیں، چنانچہ اُلْبَلَاءُ لِلْوِلَاءِ دوستوں کے لیے ہوتی ہے مشہور خاص و عام بھی ہے، اس قانون کو رازدانِ حقیقت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے۔ اذا احب اللہ عبداً ابتلاہ فان صبر اجتباہ وان رضی اصطفاہ یعنی جب حق تعالیٰ بندے سے محبت کرتے ہیں تو اس کو مصیبت میں مبتلا کرتے ہیں، اگر وہ صبر کرے تو اپنا پسندیدہ بنا لیتے ہیں، اور اگر راضی رہے تو برگزیدہ قرار دے لیتے ہیں، اسی لیے حضرت معروف ؒ فرمایا کرتے تھے:-

لیس بصادق فی دعواہ من لم   جو اپنے مولا کی مار سے لذت نہیں لیتا وہ سچا غلام
یتلذذ بضرب مولاہ۔   ہی نہیں!

اس مفہوم کو کسی عاشق نے ان سریلے نغموں میں ادا کیا ہے:-

گفت اگر تو عاشقی صبر کن و رضا طلب   جاں بلب آمد ز درد کردم از و دوا طلب
سر بفدائے یار کن ہیچ نہ خون بہا طلب   یار دمے کہ بر سرت تیغ زند تو دم مزن

محو مراد یار شو تا شود او بکام تو!
قابلِ التفات نیست عاشقِ مدعا طلب

انسان کی فطرت کے اقتضاءات وقابلیات کا جن کو حکیمانہ علم حاصل ہے، وہ اس راز کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ منازلِ عالیہ تک رسائی کے لیے درد و غم لابدی ولازمی ہے تقیید جو انسان کی فطرت ہے، اطلاق کے کسی درجہ کی متحمل نہیں ہو سکتی، درد و الم ہی سے رفتہ رفتہ اضافی اطلاقیت پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ اطلاقیت کیا ہے، نفس کی تحدیدات سے رہائی ہر ذمائم اخلاقیہ تحدید ہی کا نتیجہ ہیں، صفاتِ حسنہ کا پیدا کرنا مشقتوں کا برداشت کرنا ہی، تحمل مشاق موجب الم ہوتا ہے، لیکن ایک دفعہ جب صفاتِ حسنہ پیدا ہو جاتے ہیں تو انسان تمتع محسوس کرنے لگتا اور ہزاروں غموں سے نجات پاتا ہے، گو درد و غم کو وہ فطرۃً مکروہ سمجھتا ہے لیکن نتائج سے واقف ہونے کے بعد وہ حق تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق کرنے لگتا ہے کہ

عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰهُ یعنی شاید تم کسی چیز کو برا جانو اور اللہ تعالیٰ نے
فِیْهِ خَیْرًا کَثِیْرًا اس میں خیر کثیر رکھی ہو،

اولیاء پر جو بلائیں نازل ہوتی ہیں، وہ ان کے درجات کے ارتفاع کے لیے ہوتی ہیں، حق تعالیٰ انہیں اپنا قرب عطا کرتے ہیں، فقر و نیستی میں انہیں مبتلا کرتے ہیں، درد و حزن ان پر طاری کرتے ہیں، ان سے ارشاد ہوتا ہے کہ البلاء کنز من کنوز الجنۃ لا یعطی الا باولیاء ئہ۔

عشاق بلا کی اہمیت وقیمت سے واقف ہوتے ہیں مستانہ وار وہ اس کے طالب ہوتے ہیں کہ:

دردۂ قدح درد کہ آں می باید دردیکہ ز تست بیشتر می باید
تلخ ست عجب لیک بسے خوشگوار است ہر چند ہمی خورم دگر می باید

کبھی وہ اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر تسکین دیتے ہیں کہ

بفقر و نیستی یک دو روزہ خوش می باش
کہ یار خود زکرم عذر خواہِ ما میگردد

ان کے نزدیک جان کے مقابلہ میں تن کی زیادہ قدر نہیں اور جان کی قدر بہ قوّتِ جاناں ؟

کی وجہ سے ہی، تن اگر تکلیف میں ہو لیکن جان جاناں کے مرام کے مطابق ہو اور اس کے جمال سے کیف اندوز، تو پھر تن کی تکلیف کی کیا شکایت! اسی لیے بلا میں یہ عوام کالانعام کے خلاف:

(۱) کسی غیر کے آگے شاکی نہیں ہوتے، اور اپنی تنگ دلی کا کسی کے سامنے اظہار نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا۔

ستم کشانِ محبت دم از فغاں بستند — گرہ ز جبہ کشادند و بر زباں بستند

(۲) اپنے باطن میں اتہام اپنے رب پر نہیں رکھتے، اس کی حکمتِ بالغہ میں انہیں کوئی شک نہیں ہوتا، وہ حق تعالیٰ سے یہ خطاب سنتے ہیں۔

با درد بساز چوں دوائے تو منم — در کس منگر کہ آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشقِ ما کشتہ شوی — شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم

(۳) انہیں یقین کامل ہوتا ہے، کہ حق تعالیٰ نے جو بات ان کے لیے اختیار کی وہی ان کے لیے دین و دنیا میں اچھی ہے۔

صلاحِ ما ہمہ آنست کاں تراست صلاح

"حدیث الولی" میں اس آخری نکتہ کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میرے بندوں میں کوئی ایسا بھی ہے کہ تونگری یا غنا کے سوا کوئی چیز اس کو صالح نہیں کر سکتی، اگر میں اس کو فقیر کر دوں تو یہ فقر اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو فقیری و درویشی کے سوا کوئی چیز نیک نہیں بنا سکتی، اگر میں اس کو غنی کر دوں تو غنا اس کے ایمان کو فاسد کر دے اور کوئی ایسا بھی ہے کہ اس کو صحت و تندرستی کے سوا کوئی چیز درست نہیں رکھ سکتی اگر میں اس کو بیمار کر دوں تو وہ بیماری اس کے ایمان کو بگاڑ دے، اور کوئی ایسا بھی ہے کہ بیماری کے سوا کوئی چیز اس کے ایمان کو درست نہیں رکھ سکتی، اگر میں اس کو تندرست رکھوں تو یہ تندرستی اس کے ایمان کو فاسد کر دے، مجھے اپنے بندوں کے احوال سے

Marfat.com

پوری آگاہی ہے، اور میں ان کے مطابق اپنا کام کرتا ہوں۔

حق تعالیٰ کی ان ہی حکمتوں سے واقف ہو کر عشاق ان کی حسنِ تدبیر، قضا و اختیار سے راضی اور مطمئن رہتے ہیں، اور ہر حال میں رضا بالعطا اور "حفظِ حال" ضروری سمجھتے ہیں، اور قلب کی گہرائیوں سے ؎

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

کے قائل ہوتے ہیں، اسی لیے گو وہ "طبعی" غم و اندوہ میں مبتلا ہوتے ہیں، لیکن "عقلی سرور" سے ان کے قلب خالی نہیں ہوتے! یہ ہے "جمع بین الاضداد" اور "ضدوں کی جمع کا یہ ہنر" ان ہی کو آتا ہے! رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ!

غرض طبعی حزن و غم کے لحاظ سے کلیہ یہ ہے کہ ؏ عالم ہمہ درد است و دوامی خواہد یہ درد یا تو گناہوں اور بد کرداریوں کا نتیجہ ہے، یا تطہیر و تکفیر کے لیے وارد ہوتا ہے، یا رفع درجات کے واسطے عائد کیا جاتا ہے، بہر حال

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ (پ ۳۰ ع ۲) ہم نے انسان کو بڑی مشقت میں پیدا کیا۔

کے کلی قانون کا کوئی استثنا نہیں دکھائی دیتا، انسان کی ساری عمر محنت اور دکھ، غم و اندوہ میں گذرتی ہے، سوز و الم میں بسر ہوتی ہے، وہ ایک موج بیقرار کے مانند ہے، جس کی ماہیت ہی میں پیچ و تاب ہے۔ چنانچہ اقبال نے اس حقیقت کو خوب بیان کیا ہے۔

چہ پرسی از کجایم چیستم من؟ ‏‏‏‏ بخود پیچیدہ ام تا زیستم من
دریں دریا چو موجِ بیقرارم ‏‏‏‏ اگر بر خود نہ پیچم نیستم من

لیکن جیسا کہ اوپر واضح ہوا وہ درد و غم، سوز و الم بے معنی نہیں، بغیر مقصد و غایت کے نہیں، اس کا مقصد خودی کی تعمیر ہے، قوتِ حیات کی توفیر ہے، اسی مقصود کو پیش نظر رکھنے سے انسان کو طبعی درد کی حالت میں بھی عقلی سرور حاصل ہو سکتا ہے، یعنی اس کو اپنی جہت سے غم ہی غم ہے لیکن حق تعالیٰ کی جہت سے سرور ہی سرور، اسی نکتہ کو سمجھ کر

Marfat.com

عارف رومی نے فرمایا تھا۔

چوں بدانستی کہ ظلِ کیستی
فارغی گر مردی و گر زیستی
قطرۂ نوری سراپا نور باش
بگذر از غم دائما مسرور باش

فافھم و تدبر!

Marfat.com

زندگی میں غم کیوں ہے؟

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے بارہویں اجلاس ۱۹۳۶ء میں پڑھا گیا تھا۔

اگر غم را چو آتش دود بودے | جہاں تاریک بودے جاودانہ
درین گیتی سراسر گر بہ گردی | خردمندے نیابی شادمانہ (شہید بلخی)

غم نتیجہ ہے احتیاج کا اور انسان سرتاپا احتیاج ہے، لہذا انسان غم کا پتلا ہے۔ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ۔ رفع احتیاج ہی کے لیے وہ شب و روز حیران و سرگرداں رہتا ہے، تمام اسباب و علل کو کام میں لاتا ہے، درد کی دوا چاہتا ہے، احتیاج کا سلسلہ لامتناہی ہوتا ہے۔ ایک احتیاج کی تشفی ہوتی ہے، تو دس دوسری پیدا ہو جاتی ہیں، اور غم و الم برابر جاری رہتا ہے، لہذا کلیہ یہ قرار پاتا ہے:۔

عالم ہمہ دردست و دوا میخواہد | از خوانِ کرم برگ و نوا میخواہد
کس بے حاجت نمی تواند دیدن | درویش غذا شہ اشتہا میخواہد (سحابی استرآبادی)

اس کلیہ کا استثناء اَلشَّاذُّ کَالْمَعْدُوْمِ کا حکم رکھتا ہے۔ جس کسی سے پوچھیے "میانِ دل چیست" جواب ملیگا، "درونِ سینہ سوزے و تفے!" اگر پوچھا جائے "تن چیست" کہیگا، "غم و رنج و بلا را ہدفے" کسی اور سوال کا انتظار کیے بغیر خود کہہ اٹھیگا، القصہ بہ قصدِ جاں ما بستہ صفے مرگ از طرفے و زندگی از طرفے۔

دل چیست؟ درونِ سینہ سوزے و تفے | تن چیست؟ غم و رنج و بلا را ہدفے

۱؎ معارف میں جنوری ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا۔

القصہ بہ قصد جانِ ما بستہ سیغے   مرگ از طرفے و زندگی از طرفے (مومن یزدی)

مرضِ غم ہمہ گیر ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن یہ کلیہ بھی مسلمہ ہے، کہ ہر مرض کا علاج مذہب اور فلسفہ اور نفسیات نے ہمیشہ پیش کیا ہے، کچھ دیر کے لیے آپ میرے ساتھ چند نسخوں پر غور کیجیے، ایک زمانہ سے میں نے ان کا اپنی ذات کے لیے اور دوسروں کے لیے بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے، میں پدرانہ نصیحت کے لیے نہیں کھڑا ہوں چند اساسی عقلی اصول کی طرف آپ کی عقلِ روشن کو متوجہ کروں گا، اگر یہ اصول آپ کی سمجھ میں آجائیں اور آپ ان کے استعمال پر راضی ہو جائیں تو شفایابی متیقن ورنہ تضیع اوقات کی معافی کا خواستگار ہوں۔ غم کا حتمی و یقینی علاج مذہب پیش کرتا ہے، اس کی تائید فلسفہ اور نفسیات سے ہوتی ہے۔ اس علاج کے مختلف اجزا ہیں، پہلا جزو:

(۱) زندگی کے خیر ہونے کا یقین: اگر آپ خدا کے وجود کے قائل ہیں (اور اسی صورت میں میرا آپ سے روئے خطاب ہے) تو آپ بھی یہ مانتے ہیں کہ خدا ہمہ خیر ہے، خیرِ مطلق ہے، خیرِ محض ہے، نیز وہ ہمہ تواں یا قادرِ مطلق بھی ہے، آپ کا یہ بھی یقین ہے کہ ہر شئے کا صدور خدا سے ہوتا ہے، زندگی کا مبدء خدا ہے، اس لیے زندگی کا خیر ہونا بدیہی طور پر لازم آتا ہے، اگر معاذ اللہ خدا خیرِ محض نہ ہوتا تو اس سے شر کا صدور ممکن تھا یا اگر خیرِ مطلق ہونے کے باوجود قادرِ مطلق نہ ہوتا تو سمجھا جا سکتا کہ وہ خیر کے پیدا کرنے میں مجبور ہے، لیکن خدا کو خیرِ مطلق و قادرِ مطلق مان کر زندگی کے شر ہونے کا یقین کرنا نہ عقل ہی کے مطابق ہے، نہ نقل کے، بتائیے مقدمات کے صحیح ماننے کے بعد منطقی نتیجہ سے گریز کیسے ممکن ہے؟ اور مقدمات کی توثیق مذہب اور وجدان سے ہوتی ہے، لہذا

ہر چہ بینی محض خیر و حکمت است   گر ترا زو رحمت و گر زحمت است

زانکہ ناید فعلِ باطل از حکیم   فعلِ حق باطل نباشد اے سلیم

یہ دلیل تو میں نے اہلِ عقل کے لیے دی ہے، اہلِ عشق جن کی صفت "یومنون بالغیب" ہے

مبدءِ کائنات کو خیرِ محض ملتے ہیں، اس کے گرویدہ ہوتے ہیں (اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ) اور زندگی کے خیر ہونے کا انہیں راسخ یقین ہوتا ہے۔ علاجِ غم کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اس یقین کو پختہ کریں کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی، زندگی کے تجربات اچھے۔ زندگی کے ساتھ تعاون کرنا اچھا، اس تعاون کے نتائج اچھے، انجام اچھا! اسی یقین، اسی "اللہ مستی" و "خودگزینی" کی وجہ سے آپ بیک وقت جبن، قنوطیت، یاس، غم واندوہ کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے! اس معاملہ میں "بے یقینی" آپ کو ہمیشہ کے لیے رنج والم میں گرفتار رکھے گی، اقبال کی تنبیہ بھول نہ جائیے!

سُن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی

جب ہم یہ یقین کر لیں کہ زندگی اور اس کے تجربات اچھے ہیں، اور ہمیں ان سے خوشی کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے، اور پھر خوشی کے ساتھ تعاون کرنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو ہم میں اور زندگی کے واقعات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے، اور حالات خود بخود سدھرنے لگتے ہیں، شادمانی و کامیابی نصیب ہوتی ہے، یہ ایک راز ہے، مذہبی زندگی کے تجربات کا، جو میں آپ پر فاش کر رہا ہوں!

یہ محض ایک اعتقادی بات نہیں ہے، بلکہ مسلمہ نفسیاتی اصول پر اس کی بنیاد قائم ہے، خیالات کا اثر افعال پر ہوتا ہے، اور افعال ہی آثار میں تغیر پیدا کرتے ہیں، قنوط و یاس خوف و حزن پیدا کرتے ہیں، اور یہ وہ سلبی جذبات ہیں جو قوائے عملی کو مفلوج بناتے ہیں، خیالات اور جذبات اگر سلبی ہوں تو سیرت اور قسمت کے سیہ رو ہونے میں باقی کیا رہتا ہے، کیونکہ نفس کا یہ ایک ہمہ گیر قانون ہے کہ خیالات ہی سے مقاصد کی تشکیل ہوتی ہے، مقاصد عمل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، اعمال عادات کا تعین کرتے ہیں، عادات کی ترتیب و تنظیم سے سیرت بنتی ہے اور سیرت ہی تو قسمت ہے، انسان کی زندگی میں وہ دن نہایت ہی مبارک ہوتا ہے، جب اس کو اس امر کی یافت

ہوتی ہے کہ وہ خود ہی اپنی قسمت کا بنانے اور بگاڑنے والا ہے اس کی ذات ہی میں اس کے آلام کے اسباب پنہاں ہیں اور وہیں راحت و شادمانی کے علل کا نشان ملتا ہے! آفات کے نزول پر خدا کو ظالم اور اپنی ذات کو مظلوم ٹھہرانا نہ صرف الحاد ہے، بلکہ کج فہمی اور بے وقوفی بھی، جب تم خدا کو ہمہ خیر مان کر تمام اچھی صفات سے متصف کرتے ہو تو پھر اس کی طرف ظلم کی نسبت کیسے ہو سکتی ہے اور خدا ظالم بن کر لائق عبادت کیسے ہو سکتا ہے؟ اور جو لائق عبادت و استعانت نہ ہو وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے؟ اب اگر خدا پر یقین باقی رہ سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ خدا کو ظالم نہیں عادل مانا جائے، اب ظلم کی نسبت ہمیں اپنی ذات کی طرف کرنی پڑیگی، اور اسی کو تمام مصائب و آلام کا مبدء قرار دینا پڑیگا۔ مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ۔

ان حقائق کے سمجھ لینے کے بعد تم جرأت کے ساتھ یقین کر لو کہ دنیا اچھی، زندگی اچھی اور اس کے واقعات و تجربات اچھے، نقص کجی، یا شر کہیں ہے، تو تمہاری ہی ذات میں ہے، مصائب کے نزول کے وقت قضا و قدر پر اعتراض نہ کرو، بلکہ توافق بالقضا سے کام لو، اس احساس کو قلب میں نہ آنے دو کہ تم پر ظلم ہو رہا ہے، اور تم قابلِ رحم ہو، کیونکہ اس احساس کے ساتھ ہی تم خدا کو ظلم سے متصف کرنے لگوگے، اور اپنے کو بے خطا و بے قصور قرار دوگے، اور تم نے دیکھا ہے کہ واقعہ ہمیشہ اس کے خلاف ہوتا ہے! اپنی ذات کو بے خطا و بے قصور سمجھنا جب کہ وہی تمام سوء کا مبدء ہو، کس قدر عظیم الشان مغالطہ ہے، ایسی صورت میں کیا اصلاحِ نفس کی گنجائش بھی باقی رہتی ہے؟ کیا ترقی کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند نہیں ہو جاتا؟ جو شخص اپنی ہی جان پر ترس کھا رہا ہو، اپنی ہی قسمت پر آنسو بہا رہا ہو۔ اپنی ہی تقدیر کی شکایت میں ہمیشہ مصروف رہتا ہو، اور ساری دنیا کو اپنا مخالف سمجھتا ہو، میرے نزدیک اس قابل ہے کہ کوہِ ہمالیہ کی چوٹی سے نیچے گرا دیا جائے تاکہ اس کو بھی نجات ملے اور دنیا بھی خس و خاشاک سے پاک ہو جائے۔ اقبال ایسے ہی بدبخت سے مخاطب

Marfat.com

ہو کر کہتا ہے:

اے زجورِ چرخِ ناہنجار تنگ | جامِ تو فریادیٔ بیدادِ سنگ
نالہ و فریاد و ماتم تا کجا | سینہ کوبیہائے پیہم تا کجا
در عمل پوشیدہ مضمونِ حیات | لذتِ تخلیق قانونِ حیات
خیز و خلاقِ جہانِ تازہ شو | شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو
با جہانِ نامساعد ساختن | ہست در میداں سپر انداختن
گر نہ سازد با مزاجِ او جہاں | می شود جنگ آزما با آسماں
برکند بنیاد موجودات را | میدہد ترکیبِ نو ذرات را
میکند از قوتِ خود آشکار | روزگارِ نو کہ باشد سازگار
در جہاں نتواں گر مردانہ زیست | ہمچو مرداں جاں سپردن زندگی است

یقین کی اساس قائم ہونے کے بعد عمل کی مشید عمارت اٹھائی جانی چاہیے، اب تک ہم نے اس امر پر زور دیا کہ یقین درست کرنا چاہیے، یقین کہ زندگی اچھی چیز ہے، اور زندگی کے واقعات و تجربات اچھے ہیں، ان کے ساتھ تعاون ضروری ہے، یہ علاج غم کے نسخہ کا پہلا جزو تھا، اس کا دوسرا جزو عمل ہے، جس کو زندگی کے ساتھ تعاون کہا جا سکتا ہے۔

(۲) **عمل**، مبدءِ غم احتیاج، احتیاج کا دفعیہ عمل ہی سے ممکن ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ عمل ہمیشہ کامیاب ہی ہو، اور ساری احتیاجات کو رفع کر سکے، عمل کو کامیاب بنانے اور ناکامی کی صورت میں غم و اندوہ سے متاثر نہ ہونے کا بھی کوئی طریقہ ہو سکتا ہے؟ بات بڑی آسان ہوتی اگر انسان کی ساری احتیاجات عمل سے رفع ہو جاتیں، اور وہ محض چین و راحت کی زندگی بسر کر سکتا، عمل کے دو ہی نتائج ہو سکتے ہیں کامیابی یا ناکامیابی، عام طور پر فطرت کا یہی اصول ہے کہ مجاہد کے آگے دنیا اپنا سر جھکاتی ہے، مجاہد خطرہ ہی کی زندگی کو حقیقی معنی میں زندگی سمجھتا ہے ع اگر خواہی حیات اندر خطر زی۔ ناکامی سے یہ مایوس ہو کر

نالہ و فریاد، سینہ کوبی اور ماتم نہیں کرتا، کیوں؟ اس کے چند یقینات و عقائد ہیں ان ہی کی تحلیل سے علاجِ غم کے دوسرے جزو کی تشریح ہو جائیگی۔

مجاہد زندگی کو جہادِ اکبر سمجھتا ہے، دشمنوں سے جنگ اور میدانِ کارزار کا جدال و قتال اس کے نزدیک "جہادِ اصغر ہے" اس کا بنیادی یقین یہ ہوتا ہے کہ حق بالاخر کامیاب ہوگا اور باطل کو شکست ہوگی، چونکہ وہ ہمیشہ حق کے غلبہ و استیلاء کے لیے جہاد کرتا ہے اس لیے اس کو یقین ہے کہ خدا سے نصرت و تائید کا پانا اس کا حق ہے۔ کَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ اس وعدہ اور یقین کی وجہ سے "احساسِ کمتری" یک لخت اس سے مفقود ہو جاتا ہے، اب وہ کامیابی کے یقین کی ناقابلِ مدافعت قوت کے ساتھ عمل کرتا ہے، اس کا ایمان ہوتا ہے کہ تمام حول و قوت من اللہ ہے، لاحول ولا قوۃ الا باللہ! وہ صرف اللہ ہی کو فاعل اور موثرِ حقیقی سمجھتا ہے، اور خود کو امین و خلیفہ، قوت و اثر و حرکت میں وہ اللہ ہی سے استعانت کرتا ہے، اور اسی کے سامنے سرِ عبودیت خم کرتا ہے، ذُلّ و افتقار کی اسی سے نسبت رکھتا ہے، عبادت و استعانت میں وہ اپنی نسبت صرف اللہ ہی سے رکھتا ہے، اور فانی عن الخلق ہوتا ہے، یعنی نہ مخلوق سے استعانت طلب کرتا ہے، اور نہ ان کے سامنے سرِ نیاز جھکاتا ہے کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیْلًا اس کا ماٹو ہے، فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا اس کا اصولِ عمل قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرْھُمْ اس کا طریقۂ کار حَسْبِیَ اللّٰہُ اس کا راحتِ جان کلمہ، ایک لفظ میں وہ موحد ہوتا ہے، اور لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا قائل و مصدق و عامل۔

اس یقین و عقیدہ کی تحریک سے اس کا ہر عمل پیدا ہوتا ہے، اب جیسا کہ ہم نے اوپر کہا عمل کے دو ہی نتائج ہوتے ہیں، کامیابی یا ناکامیابی، کامیابی میں وہ شکر کرتا ہے، کیونکہ وہ اس راز سے واقف ہے جو ایک مسلّمہ نفسیاتی اصول پر مبنی ہے کہ شکر سے نعمت میں اضافہ ہوتا ہے، قوتِ عمل میں جوش پیدا ہوتا ہے اور تسخیرِ کائنات آسان ہو جاتی ہے۔ لَئِنْ شَکَرْتُمْ لَاَزِیْدَنَّکُمْ کا قطعی وعدہ اس کو مسرور کرتا ہے، وہ اس کامیابی اور نعمت کو خدا کی جانب سے سمجھتا ہے

اور خلق کی طرف اس کی نسبت نہیں کرتا، گو خلق ہی کے ہاتھ سے نعمت ملتی ہے، لیکن محض بمنزلہ اسباب و آلات و ادوات نعمت ہوتے ہیں، قاسم و مجری و موجد و فاعل و مسبّب صرف اللہ ہی ہوتا ہے، اس لیے وہی شکر کا مستحق ہے، مثلاً جب تمہیں تمہارا کوئی دوست ہدیہ بھیجتا ہے تو تمہاری نظر اس خادم کی طرف نہیں جاتی جو یہ ہدیہ تمہارے یہاں لے کر آیا ہے، بلکہ اپنے دوست کے تم شکر گزار ہوتے ہو، جس نے تمہیں یہ بھیجا ہے۔ منعم حقیقی اللہ ہے "العاطی اللہ - وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ" اس ادراک سے نعمتِ زوال کے خطرہ سے آزاد ہو جاتی ہے، یہ ایک عظیم الشان حکمت ہے، جس کو بصیرت محمدیہ نے بنی نوع انسان کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس راز کو ان الفاظ میں ادا کیا گیا ہے:

النعمۃ وحشیٌ فقیدوھا بالشکر نمت ایک وحشی جانور ہے شکر کی زنجیروں سے اس کو باندھو۔

یہ تفسیر ہے باری تعالیٰ کے اس قول کی کہ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ۔

موحد جب اپنی جد و جہد میں ناکام ہوتا ہے تو یاس و حُزن، خوف و الم کا شکار نہیں ہو جاتا، کیوں؟ اس لیے کہ وہ کائنات کے ایک قدیم راز سے واقف ہوتا ہے جو دفع غم کے لیے اکسیر ہے، اور جس کو بصیرت محمدیہ نے دریافت کیا ہے، وہ کیا ہے؟ یہی کہ بلاؤں پر صبر کرنے سے بلائیں نعمتوں میں مبدل ہو جاتی ہیں، ذرا نفسیاتی نقطۂ نظر سے اس قانون پر غور کرو، مصائب کے نزول کے وقت صبر سے بہتر کوئی اور پہلو ذہن اختیار بھی کر سکتا ہے؟ حزن و یاس سے قوائے عمل مفلوج ہو جاتے ہیں، مصیبت کے مقابلے اور برداشت کی قوت فنا ہو جاتی ہے، تردد و فکر بھی عمل کے قاتل ہیں، تشتت اور پریشانی کو بڑھاتے ہیں۔ گلہ و شکوہ تو نامردی کی صریح علامت ہے "کلبیت" استہزاء و استخفاف غم کی دارو نہیں، بلاؤں کے نزول کے وقت جب انسان حق تعالیٰ کی گزشتہ عطاؤں کو یاد کر کے صبر کر لیتا ہے، تو حق تعالیٰ اس کے قلب کی حفاظت کر لیتے ہیں مستغنی کر دیتے ہیں، اب بارِ غم سبک ہو جاتا ہے، برداشت کی قوت بڑھ جاتی ہے اور وہ انہی بلاؤں میں عطاؤں کو پا تا ہے۔

Marfat.com

خود بلا و ابتلار کی ماہیت کے متعلق جاہد صحیح علم رکھتا ہے، ہر بلا ایک اخلاقی سبق دینے آتی ہے، یہ ہمارے کسی نہ کسی نقص کو رفع کرتی ہے، اور اخلاقی اعصاب کو قوی کرتی ہے، سیرت میں پختگی پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ہمارے مراتب بلند کرتی ہے اور درجات میں ترقی دیتی ہے، یہ بظاہر شر ہے لیکن دراصل خیر کے تحقق کا ایک ناگزیر ذریعہ ہے، زندگی ایک مدرسہ ہے، واقعاتِ زندگی کے ذریعہ معلم حقیقی ہمیں ہر روز سبق دے رہا ہے، اگر ہم میں عقل ہے تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہماری ہر ناکامی میں ایک حکمت ہے اور ایک خاص عظمت، سوائے اس ناکامی کے تجربہ کے دنیا کی کوئی اور شے ہمیں نہ یہ درسِ حکمت دے سکتی ہے اور نہ عظمت کے اس درجہ پر فائز کر سکتی ہے، ہر غلطی جو تم سے سرزد ہوتی ہے ایک اہم سبق سکھاتی ہے، اگر تم اس کی تحقیق کرو اور جو شخص کہ اس شے میں جو بظاہر شر معلوم ہوتی ہے، خیر کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہو وہ واقعات کا محکوم نہیں حاکم ہے، ناکامی اس کے لیے ایک صبا رفتار مرکب ہے جو اس کو بہترین کامیابی تک پہنچاتا ہے۔

بلا کی شدت اگر تمہیں بالکل ہی مغلوب کر لے، اور اس کے خیر اور فائدہ کے جز سے مستفید ہونے کے قابل نہ رکھے تو پھر تمہیں صبر ہی کے دامن میں سکون ملیگا، اور صرف مذہب ہی تمہاری دلجوئی کریگا، ان وعدوں اور بشارتوں پر غور کرو جو مومن صابر کے حق میں وارد ہوتی ہیں، اگر تم میں ایمان ہے اور ایمان کا ذوق بھی موجود ہے، تو یقیناً تمہارا غم ہلکا ہو جائیگا، صابر خدا کا محبوب ہوتا ہے اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ۔ دردمند صابر خدا کی معیت کا ادراک کرتا ہے، کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ، اس امر کا یقین کہ خدا میرے درد و غم سے واقف ہے، کیونکہ وہ میرے ساتھ ہی ہے، غم کی چبھن کو کم کر دیتا ہے، اور واصبر لحکم ربک فانک باعیننا کا حکم اور بشارت تو اس کو رقص میں لے آنے کے لیے کافی ہے! مشہور ہے کہ کسی عاشق پر سر بازار ننانوے تازیانے لگائے گئے اور اس نے آہ تک نہ کی، جب سواں تازیانہ لگا، تو اس نے آہ کرنی شروع کی، پوچھا گیا کہ اس آخری تازیانے پر آہ و بکا کیسی؟ کہا جس کے

سبب مار کھائی ہے، وہ ننانوے تازیانوں تک یہاں تماشائیوں میں موجود تھا، اور میری حالت دیکھ رہا تھا، اس لیے مجھے کچھ بھی درد محسوس نہ ہوا، آخری تازیانے کے وقت وہ چلا گیا، اور اس وقت میں نے درد محسوس کیا! ؎

با درد بساز چوں دوائے تو منم | در کس منگر کہ آشنائے تو منم
گر بر سر کوئے عشقِ ما کشتہ شوی | شکرانہ بدہ کہ خوں بہائے تو منم (جامی)

صبر پر استقامت پیدا ہو جائے تو تسلیم و رضا کا آخری مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے، اب مجاہد صاف طور پر یہ محسوس کرنے لگتا ہے، کہ بلا از دوست عطاست و از عطا نالیدن خطا ست، البلاء کنزٌ مِن کنوز الجنۃ لا یُعطی اِلا باولیائہ کی وہ تصدیق کرنے لگتا ہے، اب نہ شکوہ شکایت ہی کا امکان باقی رہتا ہے، اور نہ جزع و فزع کا،

ستم کشانِ محبت دم از فغاں بستند | گرہ زجبہ کشادند بر زباں بستند

سچ ہے درد و غم کا قطعی علاج تسلیم و تفویض ہے اس کے سوا کچھ نہیں ؎

تسلیم نمی شوی ازاں غم گینی | تسلیم شو ہر انچہ آید پیشت

رضا بالعطا اور حفظِ حال سے نہ صرف غم ہی دور ہو جاتا ہے اور فرح و سرور کے دروازے کھل جاتے ہیں، بلکہ حق تعالیٰ بھی قطعی راضی ہو جاتے ہیں، اور جانتے ہو کہ ان کی رضامندی کا کیا نتیجہ ہوتا ہے!

آنانکہ رضائے حق بجاں میجویند | در راہ رضائے او بسر می پویند
ہر یک ہمہ آں کند کہ حق فرماید | حق نیز ہماں کند کہ ایشاں گویند

قال علیہ السلام اِنّ اللہ رجالاً یرضیٰ برضائِہم و یَغضبُ بِغضبہِم کما انہم یَرضوا برضائہ ویغضبوا لغضبہ

ہر چہ خواہی آن کند گر ہر چہ خواہد آں کنی
انچہ گوئی بشنود گر ہر چہ گفت او بشنوی

Marfat.com

اے درد! تو بھی کیا نعمت ہے، تیری برداشت نے مجھے کیا سے کیا کر دیا!

دردہ قدحِ درد کہ آں می باید
دردیکہ زقست بیشتر می باید
تلخ ست عجب لیک بسی خوش خوار است
ہرچند تہی خورم دگر می باید

Marfat.com

قرآن اور علاجِ غضب[1]

یہ مقالہ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے چودھویں سالانہ اجلاس نومبر ۱۹۳۲ء میں پڑھا گیا۔

ناتوانی خستہ گرداں کس را | بر آتشِ خشم خویش مستاں کس را
گر راحتِ جاوداں طمع میداری | می رنج ہمیشہ و مرنجاں کس را (عطار)

انسان کی مادی و روحانی ترقی میں جو شے سب سے زیادہ مانع و مزاحم نظر آتی ہے وہ جذبۂ غضب ہے! اس آتش فشاں جذبہ کے اشتعال کے وقت انسان انسان نظر نہیں آتا، بلکہ وہ ایک مہیب غار کا منظر پیش کرتا ہے جو دخانی آگ سے پُر ہے جس میں سوائے خوفناک آوازوں اور جاں سوز چنگاریوں کے کچھ نہیں نکلتا، اسی لیے اہل غضب بنا نسب شیطان سے ملاتے ہیں کیونکہ اسی نے تو کہا تھا کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَارٍ۔

ترا با چنیں تندی و سرکشی | نہ پندارم از خاک از آتشی!

ایک غضبناک شخص کو اعصابی تناؤ کی حالت میں دیکھ کر حضرت حسنؓ نے خوب فرمایا تھا کہ اے شخص تو غصہ میں اتنا اچھلتا ہے کہ مجھے ڈر لگتا ہے کہ اب کی اچھال میں تو دوزخ میں جا پڑیگا۔ اس قابلِ نفرت جذبہ کے تسلط کے وقت انسان کی صورت پاگل یا درندے کی سی ہو جاتی ہے، دماغ اور اعصاب سیاہ دخانات سے بھر جاتے ہیں، نورِ عقل تاریک ہو جاتا ہے، خون میں زہر پیدا ہو جاتا ہے، دنیا تاریک نظر آنے لگتی ہے، اس تاریکی میں اس کو نیک و بد کی تمیز نہیں رہتی دوستی اور محبت کے پاک رشتے، قرابت اور رحم کے مقدس تار، عزت و حرمت کے قیمتی روابط ایک ہی ضرب میں پاش پاش کردیے جاتے ہیں،

[1] معارف فروری ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔

تند خو کا دنیا میں کوئی دوست نہیں، پاگل اور مجنوں کا کوئی دوست کیسے ہو سکتا ہے، اس کی قسمت میں سوزش و تپش لکھی ہوتی ہے، اسی سوز و غم کی وجہ سے وہ اطمینانِ قلب اور طمانیتِ خاطر سے محروم ہوتا ہے، اور جب قلب مطمئن نہ ہو تو بدن کیسے تندرست رہ سکتا ہے، اس جہانِ فانی میں شادماں زندگی کے نسخے کے یہی دو اجزار تو ہیں، صحیح و تندرست بدن اور مطمئن و آزاد ذہن تند خواں دونوں سے محروم! اس کی سیاہ بختی و سیاہ روئی میں کسی کو شک کیسے ہو سکتا ہے، اب سوز و تپش، غم و ہم، رنج و حزن کے سوا اس کے ہاں ذخیرہ کس چیز کا ہوتا ہے؟

برقِ از زبانِ حال برجستہ گفت　　سوز و تپش بقسمت ہر تند خو بود

غرض غضب کا جذبہ ہر برائی کی کنجی ہے، (حضرت جعفر صادقؓ) بیوقوفی کی جڑ ہے، مسرت و شادمانی کا قاتل ہے، ایمان سوز ہے، اور طمانیت کش، اسی لیے جب بنی نوع انسان کے محسن اعظم آنحضرت صلعم (فداہ ابی و امی) سے کسی نے درخواست کی کہ مجھے اپنی زندگی کو سنوارنے کے لیے ذرا سا عمل بتلا دیجیے، تو آپ نے فرمایا لا تغضب یعنی تو غصہ نہ کر، جب اس نے دوبارہ یہی سوال کیا تو یہی جواب دیا گیا، اور تیسری مرتبہ کے سوال کا بھی یہی جواب[۱] ملا، کسی دوسرے موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کسی گھونٹ کا پینا اس قدر محبوب نہیں جس قدر کہ پی جانا غصہ کا[۲]۔

قرآن کریم نے اَلْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ کی تعریف کی ہے، اور ان کے اتباع کی تحریص و تاکید۔

کیا اس خونخوار جانستاں جذبہ سے نجات ممکن ہے؟ علمائے نفسیات کا کیا خیال ہے؟ قرآن کریم نے کیا طریقے تعلیم کیے ہیں؟ کیا علم کی تصحیح عمل میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے؟ کیا ریاضت و مجاہدہ غصہ کو محو کر سکتا ہے؟ انہی چند اعتبارات پر یہاں بحث کرنی مقصود ہے

ہشدار کہ رہ خود بخود گم نہ کنی؟

[۱] رواہ البخاری　[۲] رواہ احمد

Marfat.com

سقراط نے ایک ازلی صداقت کو اپنے الفاظ میں پیش کر دیا تھا کہ "نیکی علم ہے" یعنی علم صحیح ہی سے نیک عمل پیدا ہوتا ہے، بشرطیکہ علم زبان ہی کی حد تک محدود نہ رہا ہو، بلکہ قلب میں بھی اترا ہو، تیقن کے درجہ تک پہنچا ہو، جو شخص علم کو زبان ہی کی حد تک محدود رکھتا ہے۔ اس کو زبانِ سنت میں "علیم باللسان" اور "جاہل بالقلب" کہا گیا ہے، اس کا شمار ان واعظوں میں ہوتا ہے جن کی شکایت حافظؒ نے اپنی اس مخلود الذکر شعر میں کی ہے:

واعظاں کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت میروند آں کار دیگر می کنند

علم صحیح بہر حال ضروری ہے، اور پھر اس کے مطابق عمل ہو تو فلاح انسان کے ہاتھ چومتی ہے، جذبۂ غضب کی تعدیل کے لیے بھی یہ دونوں ضروری ہیں، اس لیے ہم یہاں ان ہی دو کے متعلق دو باتیں عرض کرتے ہیں:۔

(۱) علمِ صحیح:۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ انسان کسی چیز کو محبوب رکھتا ہے اور کسی چیز کو مبغوض و مکروہ، وہ محبوب چیز کے حصول کے لیے کوشش کرتا ہے، اور اس کے تحفظ کا خواہاں و متمنی ہوتا ہے، اور مکروہ شئے سے بھاگتا ہے، اور اس کو دفع کرنا چاہتا ہے، یہ اس کی فطرت ہے، وہ اسی پر مجبول ہوا ہے، جب اس کی مخالفت کی جاتی ہے تو اس کو غصہ آتا ہے، بذاتِ خود غصہ بُری چیز نہیں، یہ مدافعت کا آلہ ہے، تحفظِ حیات کے لیے ضروری ہے، استمرار نسل کے لیے ناگزیر ہے، تنازع للبقا میں اس کا خاص مقام ہے، اس کے بغیر ارتقا میں نسلِ انسانی کا بقا ممکن نہ تھا جس طرح کائنات خارجی میں عنصر ناری ضروری ہے اس کے عدم سے اختلال رونما ہوتا ہے، اسی طرح فطرت انسانی میں جذبۂ غضب بھی ضروری ہے، اس کے فقدان سے تباہی پیدا ہوتی ہے، موت لازم آتی ہے، اب غضب کے تین درجے ہوتے ہیں:۔

(۱) تفریط: یعنی کمی، یہ بالاتفاق مذموم ہے، ایسے ہی آدمی کو بے غیرت کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

امام شافعی نے کہا تھا کہ جس شخص کو غصہ دلانے سے بھی غصہ نہ آئے وہ "گدھا ہے" حمیت و غصہ کا بالکل نہ ہونا بھی سخت برا ہے، اگر کسی شخص کی بیوی اس کے ساتھ خیانت کرے فحش کا ارتکاب کرے، اور وہ حلم سے کام لے تو بتاؤ کیا یہ عقلاً، شرعاً و عرفاً سخت مذموم نہیں! غصہ کا صحیح موقع پر استعمال ضروری ہے، حق تعالیٰ نے صحابہ کرام کی صفت "اشدّاء علی الکفار" قرار دی، اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ جَاھِدِ الْکُفَّارَ وَالْمُنَافِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْھِمْ، ظاہر ہے کہ شدت و غلظت غضب کے بعد رونما ہوتی ہے، لہذا

قہر و لطف اندر محل خود نکوست ۔۔۔ جائے گل گل باش و جائے خار خار

(۲) افراط : یعنی زیادتی، یہ بھی بالاتفاق مذموم ہے، اسی سے نجات کے طریقوں پر یہاں غور کیا جا رہا ہے، جب غضب عقل و دین کی سیاست و قہرمانی سے نکل جاتا ہے تو انسان درندہ بن جاتا ہے، تمام دنیوی و روحانی اقدار سے محروم ہو جاتا ہے، جنون کا تسلط اس کے دماغ پر ہو جاتا ہے، اہلِ غضب کی فہرست میں اس کا شمار ہونے لگتا ہے جن کے متعلق یہ کہنا صحیح ہوتا ہے کہ ؎

سایۂ جن میں یہ انسان رہا کرتے ہیں

(۳) اعتدال : یہ درجہ محمود ہے، یہاں انسان کا غصہ عقل کی قہرمانی میں ہوتا ہے، دین کا مطیع ہوتا ہے، اس کے اشارہ کا منتظر ہوتا ہے، جہاں حمیت شرعاً واجب ہوتی ہے وہاں وہ شدت سے کام لیتا ہے، اور جہاں اس کا پی جانا ضروری ہوتا ہے وہاں وہ حد اعتدال سے نہیں بڑھتا، اپنے نفس کا مالک ہوتا ہے، جانتا ہے کہ ایسے موقع پر ؎

ہر کرا علم نیست او چو ددست

ظاہر ہے کہ ہم یہاں غضب کے 'استیصال' کی تعلیم نہیں دے رہے ہیں، بلکہ اس کے 'اعتدال' کی ہم غضب میں، افراط و تفریط کو رفع کر کے وسط کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں، کہ خیر الامور اوساطہا۔

دیکھو غصّہ کا کوئی معروض ضرور ہوتا ہے، یعنی اس کا تعلق کسی شئے سے ہوتا ہے، اب اس معروض کی تین شکلیں ہوتی ہیں۔

(۱) ایک وہ جو سب کے لیے ضروری اور لازمی ہے جیسے غذا، لباس، مکان، صحت، جب ان پر حملہ کیا جاتا ہے تو شعلۂ غضب ان کے تحفظ کے لیے بھڑک اٹھتا ہے، حفاظت ذات وبقائے نسل کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر جاندار اپنے دشمن کا مقابلہ کرے اور ضروریات زندگی کے تحفظ میں شدت وقوت کا استعمال کرے، ورنہ وہ صفحہ ہستی ہی سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیگا، اور یہ فطرت کا مقصود نہیں، مجاہدہ اور ریاضت سے اس قسم کے غصّہ کو محو کرنا ممکن نہیں، اور نہ ہی اس کی کوشش ہی کرنی چاہیے، کیونکہ یہ خلافِ فطرت ہے، اور غیر اختیاری، غیر اختیاری شئے پر حکم اخلاقی لگایا نہیں جاسکتا، ہاں یہاں بھی حدِ اعتدال سے تجاوز، ظلم وستم ناروا ہے اور بتکلف حلم وبرداشت کرتے کرتے تحمل کی عادت پیدا کی جاسکتی ہے۔

(۲) غصّہ کے معروض کی دوسری قسم میں وہ اشیاء داخل ہیں، جو بعض کے لیے تو ضروری ہیں، اور بعض کے لیے غیر ضروری جیسے صنّاع کے لیے آلات واوزار اور عالم کے لیے کتابیں، اگر ان محبوب اشیاء کو نقصان پہنچتا ہے، تو رنج ہوتا ہے، اور نقصان پہنچانے والے پر غصّہ آتا ہے اس قسم کے غصّہ کا بھی بیخ وبن سے استیصال نہیں کیا جاسکتا لیکن مجاہدہ سے غصّہ کی شدت باطن میں باقی نہیں رہتی اور صبر کی خو پیدا ہوسکتی ہے، اور سختی صبر کا احساس کم ہوسکتا ہے۔

(۳) غصّہ کے معروضات کی تیسری قسم میں وہ اشیاء شامل ہیں، جو کسی کے لیے بھی ضروری نہیں، جیسے مال وجاہ، خدم وحشم یہ عادۃً محبوب ہیں، لیکن قطعاً داخلِ ضرورت نہیں، یعنی ضروریاتِ زندگی میں ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا، یہ "تعیشاتِ محض" میں شامل

لہ مقالۂ سر احیا العلوم باب غضب۔

ہوتے ہیں، جو غیظ و غضب ان کے تعلق سے پیدا ہوتا ہے وہ ریاضت و مجاہدہ سے قطعاً قابلِ استیصال ہے، ہم یہاں جو کچھ عرض کر رہے ہیں، اس کا زیادہ تر تعلق اسی قسم سے پیدا ہوتا ہے۔

جب ہم غصہ کی نفسیات پر غور کر کے یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ اس کا انبعاث محبوب اشیاء کے فقدان یا ضیاع سے ہوتا ہے، تو ہمیں ایک صداقتِ کلیہ کا صحیح وجدانی علم حاصل ہوتا ہے اور وہ یہ کہ غیظ و غضب کا اصل مبدأ "حُبِّ اشیاء" ہے، جس طرح تمام حزن و ملال کا مبدأ بھی یہی حُبِّ اشیاء ہے، نیز تمام حمق و جہالت کا بھی مبدأ یہی ہے، رفع غضب کے لیے سچ پوچھو تو تبدیلِ مزاج کی ضرورت ہے، جیسا کہ عارفِ روم نے فرمایا تھا کہ انما اللہ بیر تبدیل للمزاج اس تبدیلی کے لیے تنقیۂ دماغ ضروری ہے، جس کا انحصار تزکیہ قلب پر ہے۔

اس کے لیے چند قرآنی اور نفسیاتی حقائق پر تجرید ذہنی کے ساتھ غور کرو، تم مال و دولت کو جو تمہارے قبضہ میں ہے، اپنی ملک سمجھتے ہو، کیونکہ تم اس پر متصرف ہو، اپنی مرضی سے خرچ کرتے ہو، اپنی مرضی سے ذخیرہ کرتے ہو، اپنے مالک ہونے میں تمہیں کوئی شبہ نہیں ہوتا، ناگہاں تم بیمار ہو جاتے ہو، دولت تمہیں حالتِ صحت میں جان سے زیادہ عزیز تھی، لیکن جب درد کی شدت تمہیں بیقرار کرتی ہے، تو مال تمہیں 'مار' نظر آنے لگتا ہے، تم اضطرار کے ساتھ طبیب کو طلب کرتے ہو، علاج معالجہ پر بے دریغ خرچ کرتے ہو، اسی چیز سے مفارقت گوارا کرتے ہو جو تم کو بہت زیادہ پیاری تھی، اب تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ مال سے زیادہ محبوب شے صحت ہے، یعنی درد و الم سے رہائی، اور سکون و آرام کا حصول، لیکن باوجود تمہاری تمام سعی و کوشش کے تمہیں صحتِ بدنی اور راحتِ قلبی حاصل نہیں ہوتی، تمہارے طبیب کا نسخہ اثر نہیں دکھلاتا، طبیب کے ابلہ ہونے کا تم کو یقین ہو جاتا ہے، اور تمہیں خوف ہوتا ہے کہ یہ کہیں اجل کی پیش قدمی کی علامت نہ ہو، اس سے زیادہ قابل طبیب تمہارے علاج میں مصروف ہوتے ہیں، تیر بہدف نسخوں کا استعمال ہوتا ہے، لیکن تمہارا درد بڑھتا

Marfat.com

جاتا ہے، اضطرار واضطراب میں ترقی ہوتی ہے، تمہارا مال تمہاری جاہ وحشمت تمہارے خادم ونوکر اپنے تمام ذرائع کا تم استعمال کر رہے ہو، لیکن ان سے تمہیں کوئی فائدہ کوئی نفع حاصل نہیں ہو رہا ہے، تم اپنی تکلیف، اپنے درد میں کسی قسم کی کمی نہیں پاتے، اب تمہیں یاد پڑتا ہے کہ تم نے کہیں پڑھا تھا، یا کسی سے سنا تھا کہ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا، الفاظ تمہارے ذہن میں ہیں، معنی کا تمہیں کھلا فہم حاصل نہ تھا، وجدان میں ان کا تحقق نہ ہوا تھا، ان کے مصداق سے بے خبر تھے، اب شاید تمہیں پہلی دفعہ روشنی نظر آرہی ہے، جہل کی ظلمت دور ہو رہی ہے، اپنی ہی ذات میں معنی کا تحقق ہو رہا ہے اور خود کو نہ نفع پر قادر پا رہے ہو، اور نہ ضرر کے دفع کی قوت ہی کا تمہیں احساس ہو رہا ہے، پھر تم مالک کس شے کے ہو؟ تمہاری مالکیت سے تمہیں کیا فائدہ؟ اپنی محبوب ترین جان سے تکلیف کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے، درد کی شدت میں رتی بھر کمی نہیں کر سکتے، مال تمہیں اس لیے محبوب تھا کہ اس سے درد کا ازالہ ہوتا ہے، راحت حاصل ہوتی ہے، پھر یہ کیا ماجرا ہے، اس کا اثر کہاں گیا؟ جب مال کے اثرات تمہارے اختیار میں نہیں تو ایسے بے اثر مال کو لے کر کیا کرو گے؟ یہ تو محض ایک بارگراں ہے، اس سے تو کمر ٹوٹتی ہی، یہ پھر اتنا عزیز اتنا محبوب کیوں ہو؟ سچ پوچھو تو یہ تمہاری ملک بھی نہیں، یہ حق تعالیٰ کی ملک ہے لِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (پ ۲۸ ع ۱۲) اور وہی اس کے حقیقی مالک ہیں۔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا (پ ۶) یہ تمہارا مغالطہ تھا کہ تم اس کو اپنی ملک سمجھ رہے تھے، اور اپنے کو اس کا مالک جان رہے تھے! سچ پوچھو تو تمہاری کوئی چیز ہی نہیں، تم اپنی ذات کے لحاظ سے فقیر محض ہو، اور حق تعالیٰ ہی غنی وحمید ہیں۔ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (پ ۲۲ ع ۶۔۳) حق تعالیٰ نے اپنی عنایت اور رحمت سے تمہیں دولت دی، عزت دی، مال و دولت تمہارے پاس امانت ہیں، تم امین ہو اس سے زیادہ نہیں، مالک و حاکم حق تعالیٰ ہیں، تمہیں حق امانت کا احساس

Marfat.com

ہونا چاہیے، استردادِ امانت کا جب وقت آئے تو تمہیں خوشی کے ساتھ اس کو مالک حقیقی کے سپرد کر دینا چاہیے، جانتے ہو استردادِ امانت کے مواقع کونسے ہیں؟ ان کی تفصیل کا یہ وقت نہیں، لیکن اتنا یاد رکھو کہ جب تمہاری دولت پر آفت آتی ہے، وہ تمہارے ہاتھوں سے چھین لیجاتی ہے، اور تم اس کو بچا نہیں سکتے، اور تمہارے قلب کے تار ٹوٹے جاتے ہیں تمہیں احساس ہوتا ہے کہ تم اپنی ملک سے محروم ہو رہے ہو، تو تمہاری نارِ غضب بھڑک اٹھتی ہے، یہی وقت اس علم صحیح کے تحضر کا ہے، کہ تم محض امین ہو، مالک نہیں، مالکِ حقیقی استردادِ امانت چاہ رہا ہے، متاعِ غیر پر تمہارا اختیار نہیں، تمہارا فریضہ ہے کہ تشکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ امانت کو حوالہ کر دو، غیظ و غضب کا کوئی موقع نہیں، بلکہ خوشی کا مقام ہے، دیانت دار امانت کے استرداد کے وقت ضیق محسوس نہیں کرتا، بلکہ اس کے قلب کو سرور و مسرت ہوتی ہے کہ اس نے اتنا عرصہ امانت کی حفاظت کی، شرائطِ مقررہ کے تحت اس پر متصرف رہا، اور بالآخر وقت مقررہ پر مالک حقیقی کے ہاتھ امانت سپرد کر رہا ہے۔

ہاں کیا تم جانتے ہو کہ تم پر ان بلیات کا نزول کیوں ہے؟ تمہارا مال تمہاری دولت آفتوں کا نشانہ کیوں بن رہی ہے اور تم غیظ و غضب کی آگ میں کیوں جل رہے ہو؟ کیا اس کا بڑا سبب یہی "خیانت فی الامانت" تو نہیں، جہاں تم نے اپنے علم کی تصحیح کی، اپنے کو امین جانا، اور امانت کے تصرف میں خیانت کو ترک کیا، اور شرائطِ معینہ کا خیال رکھا کہ فوراً تمہارے قلب کی حفاظت کر دی جاتی ہے، اب وہ غصہ کی آگ سے محفوظ ہو جاتا ہے، اپنے فقر و امانت کا علم ہو جانے کے بعد وہ اپنی حاکمیت کے وہم سے بھی نکل آتا ہے، حاکم حقیقی وہ حق تعالیٰ ہی کو جاننے لگتا ہے، اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کا اس کو یقین پیدا ہو جاتا ہے، اپنے حکم کی خلاف ورزی پر اس کو آگ نہیں لگتی، اس کا شعلۂ غضب نہیں بھڑکتا، احتیاجِ جاہ کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اور نتیجہ کے طور پر جذبۂ غضب کا بھی استیصال ہو جاتا ہے، اگر

Marfat.com

مجھ پر وجدان میں یہ بات کھل جائے کہ میری ذات فقیرِ محض ہے، مالک نہیں مملوک ہے، حاکم نہیں محکوم ہے، رب نہیں مربوب ہے، مولیٰ نہیں عبد ہے، ہاں اگر اس حقیقت کا محض تعقلی علم نہیں، وجدانی تحقق ہو جائے تو اب میری نظر میں غضب کے سارے معروضات فنا ہو جاتے ہیں، مال وجاہ خدم وحشم کا تعلق میری ذات سے باقی نہیں رہتا، فقیر کو ان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے! یہ تو اس ذات کے لوازمات ہیں، جو غنی وحمید ہے جو مولیٰ ورب ہے، جو مالک وحاکم ہے۔

حق تعالیٰ ہی الٰہ ہیں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ، وہی معبود ہیں اور مستعان اور ہم سب عبد، عبد اپنی ماہیت ہی کے لحاظ سے ذلیل ہے اور فقیر، اس کی یہ نسبت ذل وافتقار حق تعالیٰ ہی سے ہے، کسی غیر سے نہیں، وہ غیر اللہ کی نسبت سے غنی ہے، اور حق تعالیٰ کی نسبت سے فقیر، غنی کا فقیر سارے عالم سے مستغنی ہوتا ہے، جب قلب مومن پر اس توحید کا غلبہ ہو جاتا ہے، تو وہ ساری دنیا سے اور دنیا کی تمام محبوب ومرغوب چیزوں کی محبت سے آزاد ہو جاتا ہے

رفت آنکہ بقبلۂ بتاں رو آرم — حرفِ غم شاں بہ لوح دل بنگارم
آہنگِ جمالِ جاودانی دارم — حسنے کہ نہ جاوداں ازو بیزارم (جامی)

اور تم اوپر یہ دیکھ چکے ہو، کہ غیظ وغضب کی اصل ومنشا حُبِ اشیاءِ فانیہ ہے، لاالٰہ الا اللہ سے قلب کا تزکیہ اور روح کا تجلیہ ہوا کہ حب اشیاء فنا ہوئی اور اس حب کے فنا ہوتے ہی غضب کی بھی بیخ کنی ہو گئی!

(۲) مجاہدہ:- اس علم صحیح کے حصول کے بعد اب تمہیں مجاہدہ کی طرف توجہ کرنی چاہیے، مجاہدہ علم کے قلب میں نفوذ وسریان کے لیے ضروری ہے، مجاہدہ سے علم کا استقرار ہوتا ہے، تلوین جاتی ہے، تمکین پیدا ہوتی ہے، مجاہدہ ہدایت کے راستوں کو کھولتا ہے، حصول مقصود کا یہی واحد ذریعہ ہے، تمہارے سامنے جو علم صحیح اوپر پیش کیا گیا ہے، اس پر تدبر ضروری ہے، تفکر لازمی ہے، فجر کا وقت اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے،

Marfat.com

اس وقت اعصاب رات کی استراحت کی وجہ سے تازہ دم ہوتے ہیں، قلب کو سکون ہوتا ہے، دماغ افکارِ دنیوی سے نسبتہً خالی ہوتا ہے، ایسے وقت تمہیں زندگی کے کاروبار شروع کرنے سے پہلے اس ازلی وابدی صداقت پر غور کرنا چاہیے، اس کو قلب کی گہرائیوں میں اُتارنے کی کوشش کرنی چاہیے، کہ مالک حاکم حق تعالیٰ ہیں، حکم ان ہی کا چلتا ہے، ہر چیز ان ہی کی ملک ہے، وہی رب ہیں اور وہی مولیٰ، ہم ان ہی کے نفقیر ہیں، انہی کے در کے سائل ہیں، وہی ہمارے معبود ہیں، وہی مطلوب، وہی محبوب، وہی مقصود ان کو رکھ کر میں کسی چیز کا محتاج نہیں، میں "غنی عن الشئ" ہوں، ہر شے سے برتر، مجھ ہی سے ارشاد ہوا ہے،

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ — تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اُس پر رنج نہ کرو، اور جو
وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ — چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔
(پ۲۷ ع ۱۹)

کیونکہ ؎

عالم بطفیلِ ماست موجود — مائیم زکائنات مقصود!

جوں جوں تمہارا مراقبہ، تمہارا تفکر و تدبر عمیق ہوتا جائیگا، تمہارا نقطہ نظر بدلتا جائیگا، اور یاد رکھو کہ نقطہ نظر ہی کے بدلنے سے خودی میں انقلاب پیدا ہوتا ہے اور خودی کے انقلاب سے کائنات کے چارسو بدل جاتے ہیں ؎

تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چارسو بدل جائے (اقبال)

اسی انقلابِ مزاج سے تمہارے قلب سے اشیاء فانیہ کی محبت محو ہوتی ہے، اور غصہ کا مبنیٰ ہی مسمار ہو جاتا ہے، جب تک تم نے اپنے کو مالک و حاکم جانا، امانت میں تم نے خیانت کی، امین نہیں غاصب ٹھہرے، غاصب کو جہان کہاں امن وچین لینے دیتا ہے، تم میں اور کائنات میں توافق نہیں تخالف وتنازع قائم ہوگیا، اب ہر واقعہ تمہارے غضب کو بھڑکائیگا، جب تم نے اپنا نقطۂ نظر بدلا، حق تعالیٰ کو مالک و حاکم جانا، اور خود کو اُن کا

Marfat.com

مملوک و محکوم، آداب امانت سے واقف ہو گئے، تو آپ کائنات میں اور تم میں توافق پیدا ہو جائیگا
اس توافق کے بعد انبعاثِ غضب کا کوئی موقع نہیں پیدا ہو سکتا۔

تسلیم نمی شوی ازاں غم گینی تسلیم شو ہر آنچہ آید پیشت!

اسلئے تمہیں دورانِ تفکر میں رضا بالقضاء کے اعتبارات پر خاص طور پر توجہ کرنی چاہیئے۔ دیکھو مدبرِ امر
درحقیقت کون ہیں؟ حق تعالیٰ ہیں یُدَبِّرُ الْأَمْرَ مِنَ السَّمَاءِ إِلَى الْأَرْضِ جب وہ مدبر ہیں جب امر و حکم ان
ہی کا چل رہا ہے، تو ان کی تدبیر کے ساتھ حسنِ رضا درکار ہے، نہ کہ غصہ و غضب! دیکھو، حق تعالیٰ کی ذات
کامل، ان کے صفات کامل، ان کے افعال کامل، اور خود ہی خالق (خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ) تو اب
بات تمہارے ذہن میں جم جانی چاہیئے کہ ع ہر چہ از دوست می رسد نیکو است

دیکھو حق تعالیٰ مومن پر رحیم ہیں کَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا، اب اگر تم میں ایمان ہے، اسکی حفاظت تم
نے کرلی ہے تو اب ہر واقعہ تمہارے لیئے بشانِ رحمت ہی پیش آئیگا گو بصورتِ قہر کیوں نہ نظر آئے کیونکہ
حق تعالیٰ تم پر رحیم ہو کر تمہارا نقصان روا نہیں رکھتے، جب اس صداقت پر تم غور کروگے اور تمہارے
قلب پر وہ مسلط ہو جائیگی، تو بے اختیار تمہاری زبان سے یہ پُر ترنم الفاظ نکلنے لگیں گے۔

خواہی ز وصال شادماں دار مرا خواہی ز فراق بہ فغاں دار مرا
من با تو نہ گویم کہ چساں دار مرا زانساں کہ دلت خواست چناں دار مرا (خیام)

یہ مجاہدہ کا انجام ہوگا، لیکن اس غایت کا حصول یکدم نہیں ہوتا، تمہیں اپنے کام میں لگے رہنا چاہیئے
اور ہمت و استقلال سے قدم بڑھائے جانا چاہیئے۔ کامیابی بالآخر مجاہد کے ہاتھ چومتی ہے، اور
كَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِينَ کا وعدہ اس کے لئے پورا ہو کر رہتا ہے۔

اندریں رہ می تراش و می خراش تا دمِ آخر دمے فارغ مباش
دوست دارد دوست ایں آشفتگی کوشش بیہودہ بہ از خفتگی
کار کن تو کاہل مباش اندک اندک خاک چہ را می تراش
چوں رچا ہے می کنی ہر روز خاک عاقبت اندر رسی در آب پاک
چوں نشینی بر سر کوئے کسے عاقبت بینی تو ہم روئے سے

Marfat.com

دُعا کا فلسفہ

ہم دُعا از تو اجابت ہم ز تو ایمنی از تو مہابت ہم ز تو

دعا حق تعالیٰ سے مانگ ہے اور مانگا یہ جاتا ہے کہ وہ اپنی قدرتِ مطلقہ کا ہماری زندگی میں ظہور فرمائیں! ہمارے ضعف میں اُن کی قوت کا ظہور ہو، ہمارے فقر میں اُن کی غناء کا ظہور ہو، ہماری ذلت میں اُن کی عزت کا ظہور ہو، ہمارے عجز میں اُن کی قدرت کا ظہور ہو، اسی صورت میں یعنی حق تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ کے ظہور ہی کی وجہ سے ہماری دعا قضا یعنی تقدیر کو بھی پھیر سکتی ہے لَا یَرُدُّ الْقَضَاءَ اِلَّا الدُّعَاءُ (رواہ الترمذی)، اسی وجہ سے دعا سے بڑھ کر حق تعالیٰ کے یہاں کوئی چیز بزرگ تر نہیں لَیْسَ شَیْءٌ اَکْرَمَ عَلَی اللّٰہِ مِنَ الدُّعَاءِ (رواہ الترمذی وحسنہ) اسی بناء پر دعا ہر بلا سے بچاتی ہے، خواہ وہ نازل ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو اِنَّ الدُّعَاءَ یَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ یَنْزِلْ اور اسی کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فَعَلَیْکُمْ عِبَادَ اللّٰہِ بِالدُّعَاءِ "اس لئے اے خدا کے بندو دعا کرو" (رواہ احمد والترمذی)

ہمیں اپنے ضعف، فقر، عجز و ذلت کا بدیہی احساس ہے! اس احساس و وجدان کے باوجود اگر ہم دعا کے ہاتھ قادرِ مطلق ہستی کی طرف نہ اُٹھائیں یعنی اس کی قدرت کا اقرار اور اپنے عجز کا اعتراف نہ کریں تو یقیناً یہ چیز حق تعالیٰ کے رضا کا باعث نہ ہوگی۔ (رواہ الترمذی)

دنیوی زندگی میں جب ہم کسی دوست سے کوئی کام کرنے کو کہتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ہم اس سے مل کر اپنا کام بتلاتے ہیں اور اس صورت میں وہ ہمارا کام کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح جب ہم حق تعالیٰ سے کچھ عرض کریں تو ہمیں ایک بنیادی صداقت کو مان کر عرض کرنا پڑتا ہے اور وہ بنیادی صداقت یہ ہے "حق تعالیٰ قریب ہیں، مجیب ہیں" اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ

(سورہ ہود) وہ ہمارے قریب ہیں اور سن رہے ہیں۔ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ قَرِيْبٌ (سورہ سبا) ان کی رحمت ہم پر محیط ہے، قریب ہے اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (اعراف)

ایمان کی زندگی کا آغاز اسی وجدان سے ہوتا ہے: اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ! وہ ہماری رگ جان سے زیادہ قریب ہیں۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (۵۰، ق ۱۶) دعا کے وقت ہم کسی بہری اور غائب ہستی کو نہیں پکار رہے ہیں، ہم اس ہستی کو پکار رہے ہیں جو سمیع و بصیر ہے اور ہم سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اِنَّكُمْ لَا تَدْعُوْنَ اَصَمَّ وَّلَا غَائِبًا، اِنَّكُمْ تَدْعُوْنَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا۔ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَهٗ اَقْرَبُ اِلٰى اَحَدِكُمْ مِّنْ عُنُقِ رَاحِلَتِهٖ (متفق علیہ)

ہماری زندگی کا پہلا قدم حق تعالیٰ کے حضور و شہود کا کامل یقین و اذعان ہے! بجائے اس وہم و امید کے کہ ہم زندگی کے کسی آخری مرحلہ پر حق تعالیٰ کے قرب و حضور کا تحقق کر سکیں گے ہمیں آج ہی کامل ایمان و اذعان کے ساتھ کہنا چاہیئے۔

حق تعالیٰ آج میرے قریب ہیں، اقرب ہیں، محیط ہیں، ساتھ ہیں، اُن کے وعدے سچے ہیں، اُن کے ہاتھ فضل و کرم سے پر ہیں، اُن کی نعمتیں کامل و دراز ہیں، ان کی رحمتیں وسیع و کشادہ ہیں۔ وہ مجھے ہر تجربہ سے سلامتی و امن کے ساتھ نکال کر خیر کثیر کی طرف رہنمائی فرما رہے ہیں۔

يَا عَالِمًا بِيْ وَيَا قَرِيْبًا مِنِّيْ وَيَا شَاهِدًا عَلَيَّ
مَوَاعِيْدُكَ صَادِقَةٌ، اَيَادِيْكَ فَاضِلَةٌ، نِعْمَتُكَ سَابِغَةٌ، رَحْمَتُكَ وَاسِعَةٌ،
اُنْظُرْ اِلَيَّ مِنْكَ بِنَظْرَةِ رَحْمَةٍ يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

ہم اب حق تعالیٰ سے اسی طرح باتیں کر سکتے ہیں جس طرح بچہ اپنے باپ سے باتیں کر سکتا ہے! محبت سے، ادب سے، عجز و انکسار سے، پورے اعتماد و وثوق سے عرض مدعا کر سکتے ہیں! وہ ہمارے ساتھ بالذات حاضر و موجود ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ! وہ ہر چیز کے ساتھ حاضر ہیں، اُن سے کوئی چیز جو معلوم کی جا سکتی ہو یا دیکھی یا سنی جا سکتی ہو غائب نہیں ہو سکتی۔ اُن کا ارشاد ہے:

Marfat.com

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (پ ۱۱ ع ۲)

"تم جس حال میں ہوتے ہو، یا تم اُن سے کچھ پڑھتے ہو یا تم لوگ کوئی (اور) کام کرتے ہو، جب اس میں مصروف ہوتے ہو، ہم تمہارے سامنے ہوتے ہیں اور تمہارے پروردگار سے ذرہ برابر بھی کوئی چیز پوشیدہ نہیں، نہ زمین میں نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی ہے یا بڑی، مگر کتاب روشن میں لکھی ہوئی ہے"۔

اس ارشاد سے ہمیں صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ہم سب کے ساتھ بالذات حاضر ہیں، اس لئے وہ ہمارے ہر حال، ہر فعل اور ہر مصروفیت کو بالشہادت جانتے ہیں! ہمیں اپنا حال روشن کرنے کے لئے کسی مشقت، کسی جد و جہد کی ضرورت نہیں، وہ ان حالات کے شاہد ذاتی ہیں فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا "تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے" وہ کہہ رہے ہیں! جب ہمیں کوئی حاجت ہو تو ہمیں اس حاجت کو ان کے سپرد کر دینا چاہیئے۔ اور پھر اس کی طرف سے اپنی توجہ کو ہٹا لینا چاہیئے اور اُن ہی کی ذاتِ مبارک پر اپنی پوری توجہ مبذول و مرکوز کر دینا چاہیئے اور اس امر کا یقین کر لینا چاہیئے کہ ان کی کمالِ قدرت کا ظہور ہو رہا ہے اور اُن کا ارادہ ہمارے خیر بہتر کے ظہور میں کارفرما ہے،

اربابِ حاجتیم و زبانِ سوال نیست۔
در حضرتِ کریم تقاضا چہ حاجت است

یہی دعا اجابتِ حق کا تحقق ہے: حق تعالیٰ قریب و مجیب ہیں اور فرماتے ہیں اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (بقرہ آیت ۱۸۶) "جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں"۔ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ط اسی لئے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "دعا عبادت ہے" تمہارے رب نے کہا ہے، کہ تم مجھ سے دعا کرو میں قبول کروں گا (رواہ احمد و اہل السنن) اسی وجہ سے دعا کے وقت اجابت کا قوی یقین رکھنا چاہیئے، اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے

فرمایا تھا کہ جس چیز کی بھی تمھیں خواہش ہو، اس کے لئے حق تعالیٰ سے دعا کرو۔ اور جب دعا کرو تو اس کے قبول ہونے کا یقین رکھو اور وہ چیز تمھیں حاصل ہو گی۔

دعا کے وقت سب سے زیادہ اہم یہی چیز ہے کہ ہم اجابت حق پر یقین رکھیں اور اچھی طرح مان لیں کہ حق تعالیٰ کے نزدیک کوئی مسئلہ نہ چھوٹا ہے نہ بڑا۔ اُن کے لئے ہر چیز آسان ہے، وہ ہر شئے پر قادر ہیں اِنَّ تَیْسِیْرَ کُلِّ عَسِیْرٍ عَلَیْکَ یَسِیْرٌ، اِنَّکَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ وَّ بِالْاِجَابَۃِ جَدِیْرٌ، نِعْمَ الْمَوْلٰی وَ نِعْمَ النَّصِیْرُ! اس لئے کامل یقین و وثوق کے ساتھ ہمیں اپنے قلب کے رُخ کو حق تعالیٰ کی طرف پھیر دینا چاہیئے، یہ جانتے ہوئے کہ وہ ہماری حاجت سے واقف ہیں۔ اور اس کی تکمیل فرماتے ہیں، جب حق تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں تو پھر ہمارے تمام خوف بے بنیاد ہیں، فضول ہیں، ذرا اُس شخص کا تصور تو کرو جو ایک سرسبز و شاداب وادی سے گذر رہا ہے، لیکن یہ غم اس کو کھائے جا رہا ہے کہ اس کے سامنے تو ایک دریا ہے اور وہ اس کو عبور نہیں کر سکتا حالانکہ دریا پر پُل بھی ہے اور وہ نہیں جانتا! یا اس شخص کا تصور کرو جس کے ساتھ سفر میں ایک دانا و بینا، قوی و عزیز دوست ہے جو راہ و رسم منزل سے بخوبی واقف ہے، جو اس سفر کا کامل نقشہ بنا چکا ہے اور یہ یقین دلا چکا ہے کہ اس سفر میں کوئی اتفاقی حادثہ تک پیش نہیں آئے گا، اس پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے، اس پر بھی یہ مسافر پریشان ہے!

مومن کا قلب احمقانہ خوف سے خالی ہوتا ہے وہ "حبل اللہ" کو مضبوط پکڑ کر ہمت و مردانگی سے زندگی کے میدان میں قدم اُٹھاتا جاتا ہے اور کل کے مسائل اس کو پریشان نہیں کرتے، وہ حق تعالیٰ پر کامل توکل و اعتماد رکھتا ہے:

قُلْ لَّنْ یُّصِیْبَنَآ اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ط (۹، توبہ ۵۱)

"کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے کہ خدا نے ہمارے لئے لکھ دی ہو، وہی ہمارا کارساز ہے اور مومنوں کو خدا ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے"

اجابتِ دُعا کے یقین کے ساتھ اپنی حاجت کارسازِ حقیقی کے سامنے پیش کرنے کے بعد دعا

کی قبولیت پر ہمیں حق تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیئے، یہ جان کر کہ کوئی جدید ایجاد، نہ برق نہ مقناطیس، نہ زر، ہمارے اندر اس قوت کا کروڑواں حصہ بھی پیدا کر سکتی ہے جو ہم میں حق تعالیٰ کی لامتناہی قدرت پر بھروسہ کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے، ہم حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، اس شکر کے ادا کرنے سے ہمارے شعور کے مُقفّل دروازے کھُل جاتے ہیں اور ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے لامحدود انعامات کو قبول کر سکیں اور ان کی نعمتِ سابغہ و رحمتِ واسعہ کا مظہر بن سکیں! حق تعالیٰ کا شکر نہ صرف اُن نعمتوں پر جن کا ہم نے اپنی گذشتہ زندگی میں تجربہ کیا ہے، بلکہ اُن بے شمار نعمتوں پر جو ہماری آئندہ زندگی میں ظاہر ہونے والی ہیں، ایک کامل آزاد شاد و بامراد زندگی میں داخل ہونے کا سب سے زیادہ یقینی اور سب سے زیادہ آسان طریقہ ہے، ہمیں نہ کسی چیز کی فکر کرنی چاہیئے نہ کسی چیز کا غم! حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ پر یقین اُن کی گذشتہ و آئندہ نعمتوں پر شکر، مشکلات کے پہاڑوں کو اُڑا کر بکھیر دے گا اور زمین کو ہموار میدان کر چھوڑے گا:

يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا! (۲۰ طٰہٰ ۱۰۵)

ختم دعا پر ہمیں کہنا چاہیئے،

أَنْتَ غِيَاثِيْ فِيْ كُلِّ كُرْبَةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ! — ہر بڑے غم میں تو ہی میرا فریادرس ہے، خدایا تیرا شکر!

وَأَنْتَ رَجَائِيْ فِيْ كُلِّ شِدَّةٍ فَلَكَ الْحَمْدُ! — ہر سختی میں تو ہی میری اُمید ہے، خدایا تیرا شکر!

أَرْجُو الْخَيْرَ فَتُيَسِّرُهُ وَأَخَافُ الشَّرَّ — میں تجھ سے خیر کی اُمید رکھتا ہوں اور تو آسان کر دیتا ہے اور ہر شر سے ڈرتا ہوں۔

فَتَصْرِفُهُ فَلَكَ الْحَمْدُ! — اور تو اس کو دفع کر دیتا ہے، خدایا تیرا شکر!

وَأَرَيْتَنِي الثَّنِيَّاتِ فَلَكَ الْحَمْدُ! — خوشی کے مارے میرے اگلے دانت دکھلا دیتا ہے خدایا تیرا شکر!

بِيَدِكَ مَوْتِيْ وَحَيَاتِيْ فَلَكَ الْحَمْدُ! — میری زندگی و موت تیرے ہاتھ ہے، خدایا تیرا شکر!

حق تعالیٰ کی ذاتِ قادر پر بھروسہ، اس سے پیدا ہونے والی مسرت و شادمانی، تمام مصائب و آفاتِ زندگی کا کامل علاج ہے، اسی لئے کہا گیا ہے:

Marfat.com

شادیٔ جاوید کُن از دوست تُو!

تا نہ گنجی ہمچو گُل در پوست تُو!

"شادیٔ جاوید" یا دائمی خوشی اس وجہ سے کہ حق تعالیٰ ہمارے مولیٰ ہیں، "نِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ" اچھے مولیٰ اور اچھے مددگار ہیں، لامتناہی قدرت و قوت کے مالک ہیں ہم اپنے اسی یقین وجدان کا اظہار کرتے ہیں، اس کی تکرار کرتے ہیں اور اس قوت سے تکرار کرتے ہیں کہ تمام شر کی قوتیں جو ہمارے خلاف صف آرا ہیں، راہِ فرار اختیار کرتی ہیں اور بالآخر فنا ہو جاتی ہیں، یہی ہمارا نعرۂ جنگ ہے:

وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ!

اِنَّ الْقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا!

اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّۃِ الْمَتِیْنُ!

اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرٌ!

کَانَ اللّٰہُ عَلٰی ذٰلِکَ قَدِیْرًا!

کسی حاجت کے وقت اگر ہمارے قلب کی نظر حق تعالیٰ کی قوت و قدرت پر جم جائے تو اس قوت کا اظہار ہم میں ہونے لگتا ہے! دیکھو، جس چیز کا بھی ظہور ہماری زندگی میں ہوا ہے، اسی وقت ہوا ہے جب ہم اس سے واقف ہوئے ہیں اور اس کو قبول کیا ہے۔ یہ ایک کلی نفسیاتی قانون ہے! یہ کلی بھی ہے اور ضروری بھی، اس کا اطلاق ہر تصور پر، ہر مادی شے پر ہوتا ہے، جو ہمارے علم میں آئی ہے، یا ہماری ملک بنی ہے، اسی لئے یہ چیز اہلِ عقل و اہلِ نقل دونوں کے نزدیک مسلّم ہے کہ جب ہم حق تعالیٰ سے کوئی چیز مانگتے ہیں تو ہمیں اجابت کا یقین کرنا چاہیئے، یعنی یہ یقین کرنا چاہیئے کہ ہمیں وہ چیز مل چکی اور صرف اسی صورت میں وہ چیز ہماری ملک بن جاتی ہے یہی تفسیر ہے اُدْعُوا اللّٰہَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَۃِ کی۔

حق تعالیٰ قادر و قوی ہونے کے علاوہ رحیم و ودود بھی ہیں، رؤف و رحیم بھی ہیں، غفور و

Marfat.com

رحیم بھی ہیں، رحمٰن و رحیم بھی ہیں، البر الرحیم بھی ہیں، اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا اُن کا محبت بھرا ارشاد ہے، یہ جان کر ہم اپنے قادر توانا، روٴف و رحیم مالک کی بیشمار نعمتوں و رحمتوں کو شکر و امتنان کے جذبات کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں تاکہ اُن کا کامل ظہور ہماری زندگی کی ہر جہت ہر پہلو میں ہو! محبّت و شکر سے سرشار رُوح بے اختیار چیخ اُٹھتی ہے۔

اے جانِ من، جانانِ من، صد جانِ من قربانِ تو!

بے لطف تو من قرار نتوانم کرد — احسان ترا شمار نتوانم کرد

گر بر تنِ من زباں شود ہر موئے — یک شکر تو از ہزار نتوانم کرد (ابو سعید جہنہ)

اسی نکتہ کو شیخ جیلی رح نے اپنے الفاظ میں یوں ادا کیا تھا:

"اہلِ ولایت می دانند کہ حضرتِ حق تعالیٰ جمیع ما یحتاج الیہ اینہا را مہیا ساختہ و مقرر نمودہ است، پس بسببِ علم خویش از رنج تقاضا فارغ اند! پس بہتر است کہ رجا در حق اینہا حسن ظن باید گفت نہ تقاضا، حسن ظن بحضرتِ حق تعالیٰ معرفت جمیع صفات باری است و امید رافت و رحمت اوست، از جہتِ او سبحانہ، تعالیٰ نہ از جہت بندہ، زیرا کہ صفاتش محسن و کریم و رحیم و لطیف و رؤف و ودود است و حسن ظن بحضرت حق تعالیٰ حوالہ کردنِ مقاصدِ خویش بر سابقہ امر عنایت جناب الٰہی است و نظرِ قلب بسوئے حق تعالیٰ بے تطبیع فواد و بے تمیزِ ارواح و نفوس"۔

(منقول در جواہر غیبی صفحہ ۳۴۶)

یعنی اولیاء جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے ان کی تمام احتیاج کی چیزیں مہیا کر دی ہیں اور مقرر فرما دی ہیں، اپنے اس علم کی وجہ سے وہ تقاضا کے رنج سے فارغ ہو چکے ہیں۔ لہٰذا بہتر ہے کہ اولیاء کے حق میں رجا یا امید کو حسن ظن سے تعبیر کریں نہ کہ تقاضے سے! حق تعالیٰ سے حسن ظن ان کے تمام صفات کی معرفت ہے۔ اللہ کی نرمی، مہربانی و رحمت سے امید ہے۔ یہ حق تعالیٰ کی جہت سے، نہ کہ بندہ کی جہت سے، کیونکہ حق تعالیٰ کی صفات محسن و کریم و رحیم و لطیف و روٴف و ودود ہیں،

اور حق تعالیٰ سے حسن ظن کے معنیٰ یہ ہیں کہ اپنے تمام مقاصد کو حق تعالیٰ کی عنایتِ سابقہ کے حوالہ کر دیا جائے، اور قلب کی نگاہ اُن پر جم جائے، ایسی حالت میں قلب سے طمع اور روح و نفس سے تمام تمنائیں نکل جاتی ہیں" اور ہم چیخ اُٹھتے ہیں:

تو در دلی بغم این و آں کہ پردازد
بجائے جاں کہ تو باشی بجاں کہ پردازد

زناز نیست ترا فرصت و مرا ز نیاز
کنوں بحالِ دلِ ناتواں کہ پردازد

اوپر کے ارشادات سے معلوم ہوا:

(۱) دعا پر ہم مامور ہیں، اُدْعُوْنِیْ نیز فعلیکم عباد اللہ بالدعا! اور دعا فطری ہے، ہماری فطرت کا تقاضا ہے۔

(۲) دعا کے بعد ہمیں اس کی اجابت پر اس کے قبول ہونے پر یقین رکھنا چاہیئے اُدعوا اللّٰہَ وانتم موقنون بالاجابۃ!

حق تعالیٰ چونکہ محسن و کریم و رحیم، لطیف و رؤف و ودود ہیں، اَن کی نعمتیں و رحمتیں ہم پر محیط ہیں، ہماری زندگی میں اُن کا ظہور اُن کے قبول کرنے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ یہ ایک کلی و ضروری و نفسیاتی قانون ہے، اس کی ہمیشہ پابندی کرنی چاہیئے۔ دعا کرنے کے بعد قلب کی نگاہ حق تعالیٰ کی اُن ہی صفات پر جم جانی چاہیئے اور شعور کے دروازے اُن صفات کے ظہور کے لئے کھول دیئے جانے چاہئیں، دن کے مختلف اوقات میں قلب کی کشش و نگرانی حق سبحانہٗ تعالےٰ کی اُن ہی صفات کی طرف ہونی چاہیئے:

سزد کہ از ہمہ کس چشم و گوش بربندیم
تمام چشم و ہمہ گوش کردہ مارا (درد)

(۳) دعا کے بعد اس کی قبولیت پر صمیم قلب سے شکر ادا کرنا چاہیئے، انسانی تخیل کی بلند ترین پرواز بھی حق تعالیٰ کی اُن نعمتوں و رحمتوں کا اندازہ نہیں کرسکتی جو اس نے بندۂ مومن کے لئے فراہم کر رکھی ہیں۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ

ہمارے اِن اشارات پر عمل کرتے ہوئے اب تم اپنی کسی ضروری حاجت کا تصور کرو۔

Marfat.com

(۱) اس کو حق تعالیٰ کے حضور میں پیش کرو، دعا کرو اور کہو یَارَبِّ اِنَّكَ مَلِيكٌ مُّقْتَدِرٌ مَا تَشَآءُ مِنْ اَمْرٍ يَكُوْنُ ۵؎ حق تعالیٰ آپ مقتدر بادشاہ ہیں جو چیز آپ چاہتے ہیں وہ ہو جاتی ہے۔

(۲) دعا کی اجابت پر کامل یقین رکھتے ہوئے اس حاجت کی تکمیل پر منعم حقیقی کا شکر ادا کرتے رہو

(۳) اب اپنی حاجت، اس کی مشکل، درد، حزن کا خیال مت کرو، بلکہ حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر نظر رکھو کہ وہ اس حاجت کی تکمیل کر رہی ہے۔ نفس و قلب و روح کی تمام قوتوں کے ساتھ حق تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کو اس حاجت کی تکمیل کی صورت میں نمایاں ہوتے ہوئے دیکھتے رہو! تمہاری دعا، مرتبۂ غیب میں اب بھی مستجاب ہو چکی ہے۔ اگر تمہاری نظر اس اجابتِ حق پر جمی رہے اور زبان سے اس کی تکمیل کا تم شکر ادا کرتے رہو تو اس کا ظہور مرتبۂ غیب سے مرتبۂ ظہور میں بھی نمایاں ہو جائیگا۔

ابو سعیدؒ کی بات سنو، وہ حق تعالیٰ کے ارشاد کی نقل فرماتے ہیں،

در حضرتِ ما دوستی یکدلہ کن   ہر چیز کہ غیر ماست از ایلہ کن

یک صبح با خلاص بیا بر درِ من   گر کار تو بر نیاید انگہ گلہ کن

اس طریقہ سے دعا کرتے رہو تمہیں گلہ کا موقع نہ رہے گا۔ یا تو تمہارا مقصود حاصل ہو جائے گا یا مقصود ہی بدل جائے گا اور تم مستانہ وار چیخ اٹھو گے

نمی خواہیم بجز زلفِ تو زنجیر   زہے دیوانہ عاقل کہ مائیم

۵؎ حضرت سعید بن المسیب تابعی رحؒ کا قول ہے کہ جو شخص ان کلمات کو پڑھ کر اس کے بعد کا تذکر کرے دعا کرے تو وہ دعا قبول ہوگی اکسی جانے والے سے وہ دعا بھی سیکھ لو جن کے توسل سے دعا قبول ہوتی ہے۔

دعاء اور دفع بلا

اگر آپ کا کوئی عزیز، آپ کا محبوب آپ سے ہزاروں کوس دور غم والم میں مبتلا، بلا و مصیبت میں گرفتار ہو اور آپ سے دعاء کا طالب ہو تو آپ جانتے ہیں کہ دعاء کے ذریعہ اس کی تائید کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ جو طریقہ خود ہمیں اپنی بلا و مصیبت، خوف و حزن کو دفع کرنے میں کام آتا ہے بالکل وہی اس محبوب کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے! اس کی تفصیلات اجمالی طور پر یہاں پیش کی جاتی ہیں، ممکن ہے کہ یہ آپ کی سمجھ میں آجائیں اور آپ کو اپنی ان باطنی ربانی قوتوں کا علم ہو جائے جن سے آپ اب تک بے خبر تھے، ان کے استعمال سے آپ خود کیف و سرور حاصل کریں اور دوسروں کی بھی راحت و آسائش کا باعث بن جائیں۔

زیں شہد یک انگشت بہ لنجم بلبت   از لذت اگر محو نہ گردی تف کن

ایک نامعلوم خطۂ زمین میں ایک مکتشف مصروفِ تحقیق ہے اور یکایک راستہ بھٹک جاتا ہے، اب وہ پختہ کار خوب جانتا ہے کہ اس حالت میں اس کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ وہ حواس باختہ نہ ہو جائے، اس کے اوسان جاتے نہ رہیں، ہستی گم نہ ہو جائے! اس کو خوب معلوم ہے کہ اگر خوف کے مارے اب اس کی عقل جاتی رہے تو پھر اس کو کبھی راستہ نہیں ملتا اور وہ ہمیشہ کے لیے ہلاک ہو جاتا ہے، اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر اس نے اس وقت اپنے قلب کو سنبھال لیا، اس کو خوف و ہراس سے آزاد رکھا، پرسکون، دل جمع اور مطمئن رہا تو ممکن ہے کہ اس کو راستہ مل جائے اور وہ ہلاکت سے بچ جائے۔

بالکل یہی حال تمام مصائب اور مشکلات کا ہے، سب سے پہلے ہمیں اپنے قلب کو خوف و

پریشانی سے بچنا چاہیے، جب ہم پر بلاؤں کا نزول ہوتا ہے، درد اور غم کے بادل اُمنڈ آتے ہیں تو سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ ہم حق تعالیٰ کی معیت کا احساس کر کے اپنے دل کو خوف سے محفوظ کر لیں، خوف دور ہوا اور ہم نے ذاتی نفع و ضرر کے خیال سے بلند ہو کر اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا کہ "حق تعالیٰ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں" اور تاباں کے الفاظ میں دنیا کے اچھے اور بُرے کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کر دیا کہ:

دنیا کے نیک و بد سے کچھ تاباں نہیں ہے مجھ کو غم

گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور دوں ہوا تو کیا ہوا

تو اب حالات میں تغیر ہو جاتا ہے، اور حیرتناک طریقہ سے ہمیں تمام بلاؤں سے نجات مل جاتی ہے اور وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهُ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے، اسی طرح ہم اپنے محبوب کی خواہ وہ ہم سے قریب ہو یا دور ہو، اس کے بارے میں پریشان اور خوف زدہ ہو کر مدد نہیں کر سکتے، خوف و پریشانی سے بجائے اس کی مصیبت کم ہونے کے اور زیادہ ہو جاتی ہے، کیونکہ ہم اپنی مسموم ذہنی فضا سے اس کو بھی متاثر کرتے اور اس کے خوف و پریشانی میں اور اضافہ کر دیتے ہیں، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہمیں اس کی طرف سے بے پرواہ ہو جانا چاہیے اور اس کا خدا مالک ہے کہہ کر بے فکر ہو جائیں وہ درد و تکلیف میں مبتلا ہے اور ہمیں اس کی مدد کرنی ضروری ہے، وہ ہم سے کوسوں دور ہے اور جسمانی خدمت کا ہمیں کوئی موقع حاصل نہیں، اس کی خدمت کا روحانی طریقہ ہی اختیار کیا جا سکتا ہے اور وہ دعا اور تفویض ہے، ہم اس کے لیے اس طرح دعا کر سکتے ہیں کہ گویا وہ خود اپنے لیے دعا کر رہا ہے اور معیت و نصرتِ حق کا اس طرح ادراک کر سکتے ہیں کہ گویا وہ خود اس کا ادراک کر رہا ہے۔

اس طریقہ کے استعمال میں سب سے زیادہ اسی شخص کو کامیابی حاصل ہوتی ہے جو متقی اور پرہیزگار ہے، توحید کے میدان کا مرد ہے، امتثالِ اوامر الٰہیہ میں اپنی زندگی بسر کر رہا ہے، نواہی سے مجتنب ہے اور فسق و فجور سے تائب، اس کی دعا میں بلا کا اثر ہوتا ہے اور حق تعالیٰ

نے اسی کے متعلق تو فرمایا ہے کہ میں اس کا ہاتھ، آنکھ، کان، پاؤں ہو جاتا ہوں کنت سمعہ الذی یسمع بہ وبصرہ الذی یبصر بہ ویدہ التی یبطش بہا ورجلہ التی یمشی بہا (الحدیث رواہ البخاری)

بہر حال پہلی چیز یہ ہے کہ ہم خود اپنے خوفزدہ اور پریشان قلب کو سکون وجمعیت عطا کریں اور اس کے انتشار و پریشانی کو رفع کریں، جب ہمیں اپنے محبوب کے متعلق بُری خبر پہنچے تو ہمیں چاہیے کہ فوراً الغوث ففروا الی اللہ حق تعالیٰ کی طرف گریز کریں کیونکہ تمام چیزوں کا اختیار ان ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہی پناہ دیتے ہیں اور ان کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔ قل من بیدہ ملکوت کل شیء وھو یجیر ولا یجار علیہ ان کنتم تعلمون (پ ۵۶) تمام اہل اللہ کو اس امر کا تجربہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی مصیبت کو ابتداً حق تعالیٰ کے سامنے پیش کرتا ہے اور خلق کو اس کی اطلاع نہیں دیتا تو بہت جلد نصرتِ الٰہی اس کو دور کر دیتی ہے اور اس کے قلب کو سکون اور طمانیت عطا کرتی ہے۔

یہ شاید ابتدا میں ہمارے لیے آسان نہیں جب ہم پر کوئی مصیبت وارد ہوتی ہے تو ہمارے قلب کے تار ٹوٹنے لگتے ہیں، ہماری نبضیں چھوٹنے لگتی ہیں، ہمارے خیالات میں بلا کا انتشار اور تشتت پیدا ہو جاتا ہے، خوف سے ہماری زبان سوکھنے لگتی ہے، ہماری آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے!

یاد رکھو یہی وقت ہے رجوع الی اللہ کا، یہی وقت ہے قلب کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف رجوع کرنے کا، سلبی و تخریبی خیالات سے اس کو چھڑا کر ایجابی تصور کی طرف مائل کرنے کا، اور حق تعالیٰ سے زیادہ کس کا خیال نورانی اور ایجابی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے وقت ان پاکیزہ الفاظ کو دہرانے کی تاکید فرمائی ہے:۔

لا الٰہ الا اللہ العلی العظیم لا الٰہ الا اللہ رب العرش العظیم، لا الٰہ الا اللہ رب السموات ورب العرش الکریم[1]

[1] نوٹ صفحہ ۳۰۳ پر دیکھیے۔

تم چاہو تو ان الفاظ کی تکرار کر سکتے ہو جو تمہارے کرب کو رفع کرنے میں اکسیر کا حکم رکھتے ہیں: اللہ اللہ ربی لا اشرک بہ شیئا[1] یا پھر یہ الفاظ دہرائے جا سکتے ہیں: یا حی یا قیوم برحمتک استغیث[2]۔

یہاں یہ نفسیاتی اصول یاد رکھنا چاہیے کہ خوف و غم کا مقابلہ ان کی سطح پر رہ کر نہیں کیا جا سکتا، اس سطح میں ان کی قوت ناقابل مدافعت ہوتی ہے، ہمیں ان سے نجات پانے کے لیے اس سطح سے بلند ہو جانے کی ضرورت ہے۔ جب ہم حق تعالیٰ کی ذات کی طرف توجہ کرتے ہیں، ان کے اسماء و صفات کا ذکر کرتے ہیں تو ہمارا قلب خوف کی سطح سے بلند ہو کر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں شر کا گزر نہیں، جہاں سوائے ذات کے سرور و سکون کے کوئی اور چیز نہیں اور ہمیں ذات کے اس سرور میں کافی حصہ مل جاتا ہے ؎

قطرۂ نوری سراپا نور باش　　　　بگزر از غم دائما مسرور باش　(سعدی)

ادعیۂ ماثورہ کی تکرار کے ساتھ تمہیں حق تعالیٰ کی معیت و احاطت کا ادراک بھی واضح طور پر کرنا چاہیے۔ حق تعالیٰ نے تمہیں اپنی معیت کا یقین دلایا ہے۔ ھُوَ مَعَکُمْ اَیْنَمَا کُنْتُمْ۔ جہاں کہیں تم ہو حق تعالیٰ تمہارے ساتھ ہیں، وہ تم پر محیط ہیں، ہر شے پر محیط ہیں، کوئی شے ان کے احاطہ سے خارج نہیں، وکان اللہ بکل شیء محیطا (پ ۵ ع ۱۱) الا انہ بکل شیء محیط (پ ۲۵ ع ۱) حق تعالیٰ ہر جا حاضر و موجود ہیں، تم اپنا منہ جدھر پھیر دو وہیں ذات حق موجود ہے۔ فاینما تولوا فثم وجہ اللہ۔

آنکھیں جو ہوں تو عین ہے مقصود ہر جگہ　　　　بالذات ہے جہاں میں وہ موجود ہر جگہ

(نوٹ صفحہ ۳۲۵) [1] رواہ بخاری و مسلم و ابو عوانہ و نسائی و الترمذی و ابن ماجہ وغیرہم ابن عوانہ نے اثنا اور زیادہ کیا کہ پھر اس کے بعد دعا کرے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] رواہ ابوداؤد و النسائی و ابن حبان طبرانی نے تین بار ان کا کہنا زیادہ کیا ہے واخرجہ ابن ماجہ ایضا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اپنے اہل بیت کو جمع کر کے فرمایا کہ تم میں جب کسی کو غم یا کرب پہنچے تو کہے۔ اللہ اللہ ربی الخ [2] ابن مسعود فرماتے ہیں کہ حضرت صلعم کو جب کوئی غم ہوتا تو یہ الفاظ دہراتے۔

Marfat.com

حق تعالیٰ خود ہم سے بہت قریب ہیں، اقرب ہیں، ہرگز بعید نہیں، دور نہیں! وہ اس کا ہمیں پورا یقین دلا رہے ہیں نَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡهِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ یعنی ہم رگِ جان سے زیادہ قریب ہیں ہمیں اپنے سے دور کیوں سمجھ رکھا ہے! اپنے جہل کو دور کرا ور ہم سے قریب ہو جا!

خوابِ جہل از حرمِ قرب مرا دور فگند ورنہ نزدیک تراز دوست کسے ہیچ ندید

حق تعالیٰ کے ان ارشادات پر یقین و ایمان رکھ کر خوف و غم، کرب و رنج کے وقت ہمیں اپنے نفس کو یقین دلانا چاہیے کہ۔

حق تعالیٰ اس جگہ حاضر و موجود ہیں الا انہ بکل شیٔ محیط

حق تعالیٰ قطعاً میرے ساتھ ہیں ھو معکم اینما کنتم

حق تعالیٰ قطعاً میرے قریب ہیں۔ ان ربی قریب مجیب

حق تعالیٰ قطعاً ہر جہت میں موجود ہیں فاینما تولوا فثم وجہ اللہ

ثواب

حضورِ حق رحمت ہے، حضورِ حق مسرت ہے، حضورِ حق امن و طمانیت ہے۔

اس مراقبہ و تدبر سے حق کا ادراک انفس و آفاق میں قائم ہونے لگتا ہے اور ادراکِ حق کے قیام کے ساتھ خوف و حزن، ہم و غم، کرب و الم سب غائب ہو جاتے ہیں کیونکہ قلب ان کی سطح سے بہت بلند ہو جاتا ہے اور سکون و مسرت و امن و طمانیت کی لہریں اندر سے اٹھنے لگتی ہیں حق کو اپنے ساتھ پا کر وہ ان میں مشغول ہو جاتا ہے اور ان سے راضی اور جب وہ حق سے راضی ہو جاتا ہے تو حق تعالیٰ بھی اس سے راضی ہو جاتے ہیں۔ رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ۔

اس طرح جب ہم نے اپنے خوف و حزن کو دور کر لیا اور حق تعالیٰ کی یافت و شہود کی بدولت قطرۂ نور بن گئے، ذاتِ الٰہی کے سرور سے لطف اندوز ہونے لگے تو ہم اب اپنے دور افتادہ مہجور محبوب کی دعا کے ذریعہ مدد کر سکتے ہیں، ذرا احتیاط کے ساتھ اس طریقہ پر غور کرو۔

Marfat.com

ہمیں اس کی جانب سے یافت قائم کرنا ہے، اگر اس کی جان خطرہ میں ہے، اگر وہ بلاؤں میں گرفتار ہے تو جب ہم اس کا خیال کریںگے تو ہمارے قلب میں وہی تاریکی پیدا ہوگی جس میں وہ گھرا ہوا ہے۔ جب ہم نے اپنی تاریکی یافت حق کی وجہ سے دور کرلی تو اب ہمیں اس کی تاریکی اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور جس طرح اپنی تاریکی رفع کی تھی بالکل اسی طرح اس کے خیال سے پیدا ہونے والی تاریکی کو بھی دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، یہ تو صاف ظاہر ہے کہ دوست کے غم سے ہمیں غم ہوتا ہے اس کی بے چینی ہمیں بے چین کرتی ہے۔ جب اس کے خطرے یا ضرر کا خیال قلب میں پیدا ہوا کہ قلب کی کیفیت بدلنے لگی اور اسی کیفیت کو حزن وخوف وکرب سے تعبیر کیا جاتا ہے، قلب کی کیفیت کو جب تم نے حق تعالیٰ کے اسماء وصفات کے تذکرے سے حق تعالیٰ کی ذات کی یافت سے ان کے حضور ومعیت واحاطت وقرب اقربیت کے ادراک فی الانفس والآفاق سے دور کرلیا کہ تمہارے محبوب کا خوف وحزن خود اس کے قلب سے ہٹ گیا اور چین وسکون کی کیفیت کا ظہور ہونے لگا۔

اپنے دور افتادہ محبوب کی مدد کرنے کا روحانی طریقہ بس یہی ہے کہ پہلے اس کے غم ومصیبت کے بوجھ کو اپنے کاندھوں پر اٹھانا چاہیے اور اس کا درد اپنے قلب میں پیدا کرنا چاہیے اور پھر حق تعالیٰ کے ذکر اور ان کی یافت کے ذریعہ امن وطمانیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اور اس طرح یہ بوجھ خود بخود اٹھ جاتا ہے اور اس کو بلا ومصیبت سے نجات مل جاتی ہے۔ وما ذلك علی الله بعزیز!

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے محبوب کو حق تعالیٰ کو تفویض کردینا چاہیے۔ ہمیں اس کی صورت کو ذہن میں مستحضر کرکے حق تعالیٰ سے یوں معروضہ کرنا چاہیے، حق تعالیٰ میں نے ان کو آپ کے سپرد کیا، تفویض کیا انہیں نور اور نورانی کردیجیے عافیت وامن عطا فرمایئے ان کی ضروریات کی تکمیل کیجیے، ربنا علیك توکلنا، حسبنا الله ونعم الوکیل، نعم المولیٰ

Marfat.com

ونعم النصیر۔

ہمیں اس امر کا بھی شدت کے ساتھ استحضار کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ ہماری اور ان کی زندگی کے ہر واقعہ کا بذات خود تعین فرما رہے ہیں، اور بشانِ رحمت تعین فرما رہے ہیں۔

اس استحضار ہی سے امر واقعہ کا تحقق ہوتا ہے ہمارے لیے اور ان کے لیے بھی انا عند ظن عبدی بی سے اس کی تائید ہوتی ہے، حالات میں آسانی اور سہولت پیدا ہونے لگتی ہے حق تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن تقویٰ ہے اور متقی کی مراد حق تعالیٰ قطعاً پوری کرتے ہیں ؎

می دہد یزداں مرادِ متقین! (رومی)

ومن یتق اللہ یجعل لہ من امرہ یسراً سے اس دعویٰ کی تائید ہوتی ہے اور من یتق اللہ یجعل لہ مخرجاً اس پر مزید روشنی ڈالتا ہے۔

امداد کے اس روحانی طریقے کے متعلق یہ بات واضح طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ کشفِ ضر حق تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں کرسکتا، مخلوق میں نہ اس کی قوت ہے اور نہ طاقت لاقوۃ الا باللہ حق تعالیٰ ہی فاعل ہیں اور مخلوق محض آلات، موثر حقیقی صرف حق تعالیٰ ہی ہیں، باقی اوہام وخیالات! وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَۚ وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ یُصِیْبُ بِهٖ مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (پ ۱۱ ط ۱۲۶)

یعنی اگر تم کو حق تعالیٰ کوئی تکلیف پہنچائیں تو بجز ان کے اور کوئی اس کا دور کرنے والا نہیں ہے اور اگر وہ تم کو کوئی راحت پہنچانا چاہیں تو ان کے فضل کا کوئی ہٹانے والا نہیں، وہ اپنا فضل اپنے بندوں میں سے جس پر چاہیں مبذول فرمائیں اور وہ بڑی مغفرت اور بڑی رحمت والے ہیں" جامی نے اسی عقیدہ کے تحت فرمایا ہے:-

حق فاعل و ہر چہ جز حق آلات بود | تاثیر ز آلت از محالات بود
ہستی کہ موثرِ حقیقی ست یکیست | باقی ہمہ اوہام وخیالات بود

جب ہم اپنے قلب میں اپنے محبوب کا درد لے کر مواجہ حق میں آجاتے ہیں تو حق ہی کے

Marfat.com

نور سے ہمارا اور ہمارے محبوب کا درد رفع ہو جاتا ہے، فاعل و موثر قطعاً حق تعالیٰ ہی ہوتے ہیں اور ہم محض وہ آلات جن کے ذریعہ ان کا فیضِ کرم جاری ہوتا ہے۔

اے سرِّ تو در سینۂ ہر صاحبِ راز پیوستہ درِ رحمتِ تو بر ہمہ باز
ہر کس کہ بدرگاہ تو آید بہ نیاز محروم ز درگاہ تو کے گردد باز

Marfat.com

اسرارِ حج

حج زیارت کردن خانہ بود   حج رب البیت مردانہ بود   (رومی)

صوفیائے کرام نے ہمیشہ مذہب کے ظاہری رسوم سے زیادہ زور اس کی باطنی روح پر دیا ہے۔ دین محمدی کی یہی دو حیثیتیں ہیں: ظاہری و باطنی!

"نیکی وطاعت کے ظاہری افعال سے قلب پر جو اچھے اثرات مترتب ہوتے ہیں ان کے احوال وکوائف کی تحصیل دین کی باطنی حیثیت یا تصوف کا مقصود اور نصب العین ہے۔"[۱]

قرآنی تعلیمات سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اصل چیز ظاہری رسوم نہیں بلکہ باطنی رُوح ہے۔ دیکھو قربانی کے سلسلہ میں حق تعالیٰ نے وضاحت فرمادی ہے کہ:

"نہ قربانی کا گوشت حق تعالیٰ کے پاس پہنچتا ہے اور نہ خون، بلکہ تقویٰ یا پارسائی"[۲]

یعنی حق تعالیٰ کی رضا وخوشنودی محض قربانی کردینے یا خون بہادینے سے نہیں حاصل ہوتی جب تک کہ اس قربانی کا مدار حق تعالیٰ کی محبت، ان کی رضاجوئی، اور ان کی قرب طلبی نہ ہو۔ اسی طرح دوسری جگہ واضح فرمایا گیا ہے کہ:۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ	نیکی اس کا نام نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ	مغرب کو، بلکہ نیکی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان
اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ (الخ پ ۲ ع)	ویقین سے حاصل ہوتی ہے۔

یعنی محض کسی سمت کو قبلہ بنا کر اس کی طرف مُنہ پھیر لینے سے انسان کے اندر نیکی نہیں پیدا ہو سکتی

---

[۱] شاہ ولی اللہ "ہمعات"۔ [۲] لن ینال اللہ لحومہا ولا دماؤہا ولکن ینالہ التقوی منکم۔

Marfat.com

جب تک کہ اس کی بنیاد اللہ اور آخرت کے یقین و ایمان پر نہ ہو!

لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھول نہ جانا چاہیے کہ قرآنی تعلیمات اور اسلامی تصوف کی رو سے دنیا میں جس طرح انسانی روح بغیر انسانی جسم کے نہیں پائی جاتی اور اس کے روحانی افعال کا اعتبار بغیر جسمانی افعال کے نہیں ہوتا، اسی طرح دنیا میں خاص خاص افعال یا جسمانی حرکات اور احوال کے بغیر روح کا ارتقا اور اس کی تکمیل نہیں ہو سکتی، اسی لیے صوفیائے کرام نے باطن کے ساتھ ظاہر کی حفاظت پر پورا زور دیا ہے اور متقدمین صوفیاء نے تصوف کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ "وہ نام ہے تعمیر ظاہر و باطن کا" بالفاظِ دیگر دونوں کی اصلاح و درستی ضروری ہے، نہ ظاہر بغیر باطن کے اور نہ باطن بغیر ظاہر کے درست ہو سکتا ہے۔ ظاہر عنوان ہے باطن کا، جب کبھی ظاہری افعال شرع محمدی کے خلاف ہوں تو اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا کہ اس کا باطن موافق و مطیع ہوگا، ظاہر تو تابع ہوتا ہے باطن کا، کیسے ہو سکتا ہے کہ باطن درست ہو اور اس کا اثر ظاہر پر نہ پڑے، یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح ظاہری افعال کا اثر باطن پر پڑتا ہے بلکہ ہر ظاہری عمل باطن کو متاثر کرتا ہے۔ ولیم جیمس جیسے ماہرِ نفسیات نے تو اس حد تک زور دیا ہے کہ "اگر تم باطن میں کوئی کیفیت یا جذبہ پیدا کرنا چاہتے ہو تو اس کی ظاہری صورت پیدا کر لو تمہارا باطن متاثر ہوئے بغیر رہ نہیں سکتا" جیمس لینگ نظریہ کی تفصیلات سے آج کل جامعات کے طالب علم بخوبی واقف ہیں۔

حج کے تمام اعمال پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مومن جس کا طرۂ امتیاز حق تعالیٰ کی شدید محبت ہے (والذین آمنوا اشد حبا للہ) اپنے عشق و محبت کے جذبہ کو جو اس کے قلب کی گہرائیوں میں نہاں ہے ظاہری اعمال و اشکال میں ہویدا کرتا ہے تاکہ

"اس کے اس حال کا چرچا دنیا میں پھیلے، وہ بلند آواز سے لبیک کہتے ہوئے نعرے لگاتا ہے اور ان نعروں سے محبت کی چھپی دبی آگ کو بھڑکاتا ہے!"

چنانچہ شاہ عبدالعزیزؒ اپنی تفسیر میں ابراہیم خلیل علیہ السلام کے حج کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

Marfat.com

"باز ایشاں را حکم شد کہ در ہر سال یک بار خود را عاشق شیدا ساختہ دیوانہ وار و عاشق کردار برائے گرد گشتن خانۂ محبوب خود برہنہ سرو برہنہ تن و برہنہ پا، ژولیدہ مو، پریشان حال و گرد آلودہ از شام بر زمین حجاز رسیدہ گاہے بر کوہ و گاہے بر زمین رو بہ سوئے خانہ کردہ استادہ شوند... گرد خانۂ تجلی آشیانہ او طواف کنند و بار بار کنجہائے آن را بہ بوسند و بلیسند[1]"

(پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ سال میں ایک دفعہ اپنے کو سرگشتہ و شیدا بنا کر دیوانوں کی طرح اور عشق بازوں کا وطیرہ اختیار کر کے محبوب کے گھر کے گرد ننگے سر ننگے پاؤں، الجھے ہوئے بال، پریشان حالی کے ساتھ گرد میں اٹے ہوئے سرزمین حجاز میں پہنچیں، اور وہاں پہنچ کر کبھی پہاڑ پر کبھی زمین پر محبوب کے اسی گھر کی طرف رُخ کر کے کھڑے ہوں ...... اسی تجلی خانہ کے ارد گرد گھومیں اور اس کے گوشوں کو چومیں، چاٹیں)

حج کے مناسک سے عشق و محبت کا یہی جذبہ ظاہر ہوتا ہے اور اسی بنیاد پر طوافِ کعبہ، صفا و مروہ کے درمیان سعی، مزدلفہ کی آمد و رفت، عرفات میں قیام، منیٰ میں ذبح و قربانی، و تلبیہ و احرام وغیرہ کا حکم دیا گیا ہے۔

اعمالِ حج کے ان ہی باطنی اسرار کو ہم یہاں امام الصوفیہ حجۃ الاسلام حضرت غزالیؒ کے اشارات کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں: ؎

زیں شہد یک انگشت بسانم بلبت ۔۔۔ از لذت اگر محو نگردی تف کن!

حق تعالیٰ کے گھر کی زیارت کا شوق[1] عاشق کے قلب میں بھڑک اٹھتا ہے: جس قلب میں اس "شاہ خوباں" کا عشق نہیں وہ مردہ ہے، یا یوں کہیے: ؎

دل کہ فارغ شد ز عشقِ آں نگار
سنگِ استنجائے شیطانش شمار!

[1] حج نمبر الفرقان بابت ماہ رمضان و شوال ۱۳۷۵ھ مقالہ مولانا گیلانی صفحہ ۱۱۰

Marfat.com

عاشق کی نگاہ میں اب دنیا کی ساری لذتیں ہیچ نظر آنے لگتی ہیں۔ مال و دولت، جاہ و عزت دوست و احباب اپنی دلفریبیاں کھو دیتے ہیں! "زندے" کا عشق اس کو مردوں کی محبت سے بیزار کر دیتا ہے اور وہ چیخ اُٹھتا ہے:۔

عشق با مردہ نباشد پائیدار　　عشق را باحیؑ جاں افزائے دار!
عشقِ زندہ در روان و در بصر　　ہر دمے باشد ز غنچہ تازہ تر!
عشق آن زندہ گزیں کو باقیست　　وز شرابِ جاں فزایت ساقیست
عشق آں بگزیں کہ جملہ انبیاء　　یافتند از عشقِ او کار و کیا!
غرقِ عشق شو کہ غرق است اندریں　　عشقہائے اوّلین و آخریں! (رومی)

اہل و عیال، دوست و احباب سے رخصت ہو کر جب وہ سوار ہوتا ہے تو اس کی نظر میں دارِ آخرت کی سواری آجاتی ہے، وہ اپنے جنازے کو آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے جس پر سوار ہو کر اس کو ایک روز آخرت کی طرف کوچ کرنا ہوگا اور وہ جانتا ہے کہ یہ دن کچھ زیادہ دور تو نہیں ہو سکتا۔ ؏ کیں عمر بیک چشم زدن نقش بر آب است!

جب وہ احرام کے لیے چادر خریدتا ہے تو اس کو وہ دن یاد آتا ہے جب اس کا تنِ بے جان کفن میں لپیٹا جائیگا اور وہ بے حس و حرکت پڑا ہوگا: اب اس کا ساتھ دینے والے نہ دوست احباب ہونگے اور نہ اہل و عیال صرف ایمان و عمل صالح ہی اس کے ساتھ جائینگے! وہ اپنے نفس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:۔

يَا مَنْ بِدُنْيَاهُ اشْتَغَلْ　　قَدْ غَرَّهُ طُولُ الْأَمَلْ
اَلْمَوْتُ يَأْتِيْ بَغْتَةً　　وَالْقَبْرُ صُنْدُوْقُ الْعَمَلْ (حضرت علی)

سوچتا ہے کہ احرام کی چادر تو خانہ کعبہ کے قریب پہنچ کر باندھنی پڑیگی، ممکن ہے کہ یہ سفر پورا نہ ہو سکے اور راہ ہی میں موت آجائے لیکن حق تعالیٰ سے ملاقات تو کفن میں لپٹے ہوئے ہی ہوگی، کفن کی اس چادر پر نظر کر کے شکستہ دلی کے ساتھ حق تعالیٰ سے عرض کرتا ہے:۔

Marfat.com

اَللّٰھُمَّ اغْسِلْ خَطَایَایَ بِمَآءِ الثَّلْجِ وَ	اے اللہ میرے گناہوں کو برف اور اولے کے پانی
الْبَرَدِ وَنَقِّ قَلْبِیْ مِنَ الْخَطَایَا کَمَا یُنَقَّی	سے دھوئے اور میرے دل کو گناہوں سے ایسا
الثَّوْبُ الْاَبْیَضُ مِنَ الدَّنَسِ وَبَاعِدْ	پاک کردے جیسا کہ سفید کپڑا میل سے پاک کیا جاتا
بَیْنِیْ وَبَیْنَ خَطَایَایَ کَمَا بَاعَدْتَ بَیْنَ	ہے اور مجھ میں اور میرے گناہوں کے درمیان ایسا
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (بخاری عن عائشہ)	فاصلہ کردے جیسا کہ مشرق و مغرب میں تونے

جب اپنے شہر سے باہر نکل آتا ہے تو سوچتا ہے کہ اس نے اپنے اہل و عیال اور وطن سے جُدا ہو کر ایسا سفر اختیار کیا ہے جو کسی طرح دنیا کے اور سفروں کے بالکل مشابہ نہیں! اس سفر سے اس کا مقصود حق تعالیٰ ہیں، ان کے گھر کی زیارت ہے، ان کی رضا و خوشنودی ہے، حق تعالیٰ ہی کی پکار پر، ان ہی کی توفیق سے، ان ہی کے شوق دلانے سے، ان ہی کے حکم پر وہ قطع علائق و ترک خلائق کر کے ان کے دربار کی طرف دیوانہ وار چل پڑا ہے، اس کی زبان پر ہے:-

بسم اللہ، ماشاء اللہ، حسبی اللہ، لا قوۃ الا باللہ، اللھم الیک خرجت و انت اخرجتنی!

من کہ باشم کہ براں خاطرِ عاطر گذرم لطفہا می کنی اے خاکِ درت تاجِ سرم (حافظ)

اس کو حق تعالیٰ سے پوری اُمید ہوتی ہے کہ وہ اس سفرِ شوق میں اس کے ساتھ ہونگے، اس کے نگہبان اور مددگار رہونگے، وہ حق تعالیٰ ہی کی دستگیری و رہبری سے اپنی منتہائے آرزو کو پائیگا، اپنے مولیٰ کے دیدار سے اپنی مراد کو پائیگا! ؎

من ایں دستے کہ افشاندم زکونین بدامانِ تمنائے تو باشد! (حزین)

سوچتا ہے کہ اگر وہ منزلِ مقصود کو پہنچنے بھی نہ پایا اور راستہ ہی میں طعمۂ اجلِ مسمّی ہو گیا، پھر بھی وہ "شمارِ رہِ یار" ہو گا! کیا حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا ہے:

وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْۢ بَیْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى	جو شخص اپنے گھر سے اس نیت سے نکل کھڑا ہوا کہ
اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ یُدْرِكْهُ الْمَوْتُ	اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کرونگا، پھر اس کو موت

"فقد وقع اجرُہٗ علی اللہ" اگر کٹ مرے تب بھی اس کا ثواب ثابت ہو گیا اللہ تعالیٰ کے ذمہ

ہاں، اس راہ میں موت بھی اچھی! کہہ سکیگا! ؎

حاصلِ عمر نثارِ رہ یارے کردم! شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اسی فکر و ذکر، اسی ولولہ و جنون میں وہ میقات پر پہنچ جاتا ہے، کپڑے اتارتا ہے بطور احرام کی چادریں باندھتا اور اوڑھتا ہے، ماسوا سے آزاد ہو کر چیخ اٹھتا ہے،

لبیک اللّٰھم لبیک لا شریک لک لبیک!

آنکھوں سے اس کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں، دل سے سرد آہیں نکلتی ہیں، اور زبان سے یہ چیخ:-

مارا ز خاک کویت پیراہن است بر تن! آنہم ز آب دیدہ صد چاک تا بدامن (جامی)

جانتا ہے کہ لبیک کی یہ پکار حق تعالیٰ کی اس پکار کے جواب میں ہے کہ:-

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ (پ ۱۷ع ۱۰) اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو

اور اس کا خیال عرصۂ قیامت کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتا ہے کہ جب صور پھونکا جائیگا اور لوگ اسی طرح پکارے جائینگے اور وہ اپنی قبروں سے نکل کر میدانِ قیامت میں جمع ہونگے اور حق تعالیٰ کی پکار کا جواب دینگے پھر ان میں سے بعض مقبول ہونگے اور بعض مردود! ابتدا میں تو وہ ہر ایک کو ہوگا، خوف و رجا ہر ایک کے سینہ میں ہوگی! دل ہی دل میں حق تعالیٰ سے کہتا ہے کہ

کارے بجز گناہ نداریم یا حفیظ! عذرے بغیر آہ نداریم یا حفیظ!

ہر چند روسیاہ و گنہگار و مجرمیم جز رحمت پناہ نداریم یا حفیظ! (مجذوب)

توبہ و استغفار، تسبیح و تہلیل، ندامت و شوق، رجا و خوف میں اس کی ہر ساعت بسر ہوتی ہے، دل میں حسرتوں کا ہجوم ہوتا ہے اور وہ راہ کی صعوبتیں برداشت کیے بڑھتا جاتا ہے! کبھی کہتا ہے۔

اللہ! کس قدر رہ مقصود دُور ہے پیکِ خیال راہ میں تھک تھک کے رہ گیا

جدہ کا قیام، ساتھیوں کی پریشانی اس کو متاثر نہیں کرتی، وہ تو "محوِ خیالِ یار" ہے:-

وہ تری گلی کی قیامتیں کہ لحد سے مُردے نکل پڑے یہ مری جبینِ نیاز تھی کہ جہاں دھری تھی دھری رہی

انتظار کی ساعتیں گزرتی جاتی ہیں اور وہ بیتابی میں گنگناتا جاتا ہے:۔

نظر ہے وقفِ غمِ انتظار کیا کہنا کھنچی ہے سامنے تصویرِ یار کیا کہنا (جگر مراد آبادی)

اب قافلہ مکہ معظمہ میں داخل ہو رہا ہے! "حرم مامون" میں پہنچ رہا ہے! اَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا کی نوید اس کے کانوں میں گونجتی ہے۔ بلد امین میں داخل ہو کر وہ چیخ اٹھتا ہے:۔

ذرۂ خاکم و در کوئے توام وقت خوش است ترسم اے دوست کہ بادے ز بہد ناگاہم! (حافظ)

آگے بڑھ کر جب اس کی نظر بیت اللہ پر پڑتی ہے تو رب البیت کی تجلی سے اس کے ہوش وحواس گم ہو جاتے ہیں ؎

آمد خبرے ز آمد او من بعد خبر نماند مارا!

وہ "بیت" کو نہیں، گویا "رب البیت" کو دیکھ رہا ہے!

آنکھوں میں روئے یار ہے، آنکھیں ہیں روئے یار پر
ذرہ ہے آفتاب میں، ذرے میں آفتاب ہے!

اسی ذوق و شوق کو لیے ہوئے وہ طواف کے لیے بڑھتا ہے، اس کے قلب میں تعظیم، خوف ورجا، عشق و محبت کے جذبات موجزن ہوتے ہیں، اس کا جسم خانۂ کعبہ کے طواف میں مصروف ہوتا ہے لیکن اس کی روح رب البیت کے گرد گھومتی ہے، اس کا دل حضرتِ ربوبیت کا طواف کرتا ہے، ان پر فدا ہوتا ہے، نثار ہوتا ہے، چھپتا ہے، ؎

یک جان چہ متاعیست کہ سازیم فدایت
اما چہ تواں کرد کہ موجود ہمیں است!

جب حجرِ اسود کو بوسہ دیتا ہے تو جانتا ہے کہ وہ حق تعالیٰ کے ہاتھ پر بیعت کر رہا ہے۔ اطاعت و فرمانبرداری، عہدیت و عبودیت کا اقرار کر رہا ہے، حجرِ اسود "یمین اللہ عز وجل فی الارض" ہے، حق تعالیٰ کا داہنا ہاتھ ہے زمین پر، "یصافح بہا خلقہ کما یصافح الرجل اخاہ"[1] جس سے وہ

[1] مسلم بروایت عبداللہ بن عمرؓ۔

اپنے بندوں کے ساتھ مصالحہ کرتے ہیں! وہ حق تعالیٰ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر عرض کرتا ہے: ؎

یارب منم و دست تہی چشم پُر آب ۔۔۔ جاں دادہ و دل سوختہ و سینہ کباب

نامہ سیہ و عمر تبہ، کار خراب ۔۔۔ از روئے کرم بفضل خویشم دریاب

پھر کعبۃ اللہ کے پردہ کو پکڑتا ہے یہ سمجھ کر کہ حق تعالیٰ کے دامن کو پکڑ رہا ہے اور ملتزم سے چمٹتا ہے یہ سمجھ کر کہ حق تعالیٰ سے قریب ہو رہا ہے، رو رو کر عرض کرتا ہے: ؎

تو کریم مطلق و من گدا چہ کنی جز اینکہ نخوانیم ۔۔۔ در دیگرے بنما کہ من بہ کجا روم چو برانیم

ہمہ عمر ہرزہ دویدہ ام عملم کنوں کہ خمیدہ ام ۔۔۔ من اگر بحلقہ تنیدہ ام تو بروں در منشانیم (بیدل)

آپ کا دامن چھوڑ کر کہاں جاؤں، کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں، کس کے قدم پکڑ لوں؟ میری پناہ گاہ آپ ہیں، میرا ملجا و ماویٰ آپ کے سوا کون ہے؟ آپ کے کرم و عفو کے سوا میرا ٹھکانا نہیں! آپ کا دامن نہ چھوڑوں گا جب تک کہ آپ اپنی رحمت سے میری سیہ کاریوں کو معاف نہ فرمائیں، اور آغوشِ دامن میں پرورش نہ فرمائیں! حق تعالیٰ آپ کریم ہیں، در کریم پہ عجز و نیاز کے ساتھ آیا ہوں، دیدۂ اشکبار کے ساتھ آیا ہوں، دردِ دل، نالۂ جاں آزار کے ساتھ آیا ہوں، اگر آپ دامنِ عفو میں پناہ نہ دیں تو کہاں جاؤں، کیا کروں! ؎

یارب دلم از بارِ گنہ محزون است ۔۔۔ جاں زار و دل افگار و جگر پُر خون است

ہر چند گناہِ من ز حد بیروں است ۔۔۔ عفوت ز گناہ من بسے افزوں است (درد)

صفا و مروہ کے درمیان جب وہ سعی کرتا ہے تو یہ احساس قلب میں لیے ہوئے، کہ ایک فقیر، مسکین، حقیر و ذلیل غلام اپنے آقا، مالک، بادشاہ کے محل کے صحن میں بار بار چکر لگا رہا ہے، نظرِ کرم کا ملتجی ہے، زبان پر سوال ہے کہ:

"رب اغفر وارحم و تجاوز عما تعلم انك انت الاعز الاكرم"

بار بار گھومتا ہے اور آواز لگاتا ہے کہ:

عبيدك بفنائك! مسكينك بفنائك! فقيرك بفنائك! سائلك بفنائك! انت

کریم رحیم ارحمنی واغفر لی یا رحیم یا کریم یا غفور!
جانتا ہے کہ کوئی سائل اس در سے محروم نہیں جاتا، یہ کریم کا دروازہ ہے، اس کو جو کھٹکھٹاتا ہے وہ اپنی مراد کو پاتا ہے:۔

گفت پیغمبر کہ چوں کوبی درے ۔۔۔ عاقبت زاں در بروں آید سرے
سایۂ حق بر سرِ بندہ بود ۔۔۔ عاقبت جوئندہ یابندہ بود
چوں نشینی بر سرِ کوئے کسے ۔۔۔ عاقبت بینی تو ہم روئے کسے
چوں ز چاہے میکنی ہر روز خاک ۔۔۔ عاقبت اندر رسی در آب پاک

عرفات کے میدان میں جب وہ قدم رکھتا ہے اور لوگوں کا اژدحام اور آوازوں کا بلند ہونا اور زبانوں کا اختلاف جب اس کو نظر آتا ہے تو اس کو میدانِ قیامت کا منظر یاد آتا ہے کہ اس روز بھی ہر امت اپنے نبی کے ساتھ اسی طرح جمع ہوگی اور اس کی پیروی کریگی اور اس کی شفاعت کی اُمید کریگی، اب وہ اضطرار کے ساتھ حق تعالیٰ کی طرف رجوع ہوتا ہے اور چیختا ہے:

یا من لا یشغلہ شانٌ عن	اے وہ ذاتِ مطلق کہ جس کو ایک حال دوسرے حال
شانٍ ولا سمعٌ عن سمعٍ ولا	سے نہیں روکتا اور نہ ایک عرض کا سُننا دوسرے عرض
تشتبہ علیہ الاصوات، یا	کے سننے سے باز رکھتا ہے، اور نہ مشتبہ ہوتی ہیں اس پر
من لا تغلطہ المسائل ولا	آوازیں! اے وہ ذاتِ مطلق کہ جس کو بہت سے سوال
تختلف علیہ اللغات! یا من	مغالطہ میں نہیں ڈال سکتے اور نہ مختلف ہیں اس کے نزدیک
لا یبرمہ الحاح الملحین و	بہت سی زبانیں! اے وہ ذات پاک جس کو ہٹ کرنے والوں
لا تضجرہ مسئلۃ السائلین!	کا اصرار تھکا نہیں دیتا اور مانگنے والوں کا سوال تنگ نہیں
اذقنا برد عفوک وحلاوۃ	کرتا ہم کو اپنے عفو کی ٹھنڈک اور رحمت کی حلاوت سے آشنا
رحمتک!	کر! (دعائے خضر علیہ السلام)

پھر رو رو کر کہتا ہے:۔

الٰہی! انت انت وانا انا، انا العواد الی الذنوب وانت العواد الی المغفرۃ! الٰہی ان کنت لا ترحم الا اہل طاعتک فالی من یفزع المذنبون:

حق تعالیٰ آپ آپ ہیں اور میں میں ہوں! میں گناہوں کی طرف بار بار پلٹتا ہوں اور آپ مغفرت کی طرف بار بار رجوع کرتے ہیں! حق تعالیٰ اگر آپ اپنے طاعت والوں ہی پر رحم کریں، تو گنہگار کس طرف ملتجی ہوں!

الٰہی تجنبت عن طاعتک عمداً وتوجہت الی معصیتک قصداً فسبحانک ما اعظم حجتک علی و ما اکرم عفوک عنی فبوجوب حجتک علی وانقطاع حجتی عنک وفقری الیک وغناک عنی الا غفرت لی! یا خیر من دعاہ داع وافضل من رجاہ راج بحرمۃ الاسلام وبذمۃ محمد علیہ السلام اتوسل الیک فاغفر لی جمیع ذنوبی واصرفنی عن موقفی ھذا مقضی الحوائج وھب لی ما سألت وحقق رجای فیما تمنیت!

حق تعالیٰ میں آپ کی اطاعت سے قصداً علیحدہ رہا اور آپ کی نافرمانی پر دانستہ متوجہ ہوا، آپ پاک ہیں آپ کی حجت مجھ پر کتنی بڑی ہے اور آپ کا مجھے معاف کرنا کتنا بڑا کرم ہے پس جس صورت میں کہ آپ کی حجت مجھ پر ضروری ہوئی، میری حجت آپ کے ہاں جاتی رہی، میں آپ کا محتاج ہوں اور آپ مجھ سے بے پرواہ بے نیاز، آپ مجھے معاف ہی فرما دیجیے! اے ان سے بہتر ذات جن کو جن کو کوئی دعا مانگنے والا پکارے، اور افضل ان سے جن سے کوئی توقع رکھنے والا رکھے اسلام کی حرمت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ کا وسیلہ تیرے سامنے پیش کرتا ہوں، میرے سارے گناہ بخش دیجیے اور مجھے اس موقف سے حاجتیں پوری کرکے لوٹائیے اور جو کچھ میں نے مانگا مجھے دلا دیجیے اور جس چیز کی میں نے تمنا کی اس میں میری توقع پوری کیجیے!

پھر چلا اٹھے درد بھرے دل سے!

الٰہی من مدح لک نفسہ فانی لائم نفسی! الٰہی اخرست المعاصی

الٰہی! جو تیرے سامنے اپنی تعریف کیا کرے میں تو اپنے نفس کو ملامت کرتا ہوں! الٰہی گناہوں نے میری زبان

Marfat.com

لسانی فمالی وسیلۃ من عملی و	گونگی کردی، پس مجھ کو اپنے عمل کا وسیلہ نہ رہا، اور نہ سوا
لاشفیع سوی الامل! الٰھی انی	اُمید کے اور کوئی سفارش کرنے والا! الٰہی مجھے معلوم
اعلم ان ذنوبی لم تبق لی عندک	ہے کہ میرے گناہوں نے تیرے نزدیک میری قدر
جاھاً ولا للاعتذار وجھا ولکنک	کچھ باقی نہ رکھی اور نہ عذر کرنے کی کوئی صورت
اکرم الاکرمین الٰھی ان لم اکن اھلاً	چھوڑی لیکن تو تمام کریموں سے زیادہ کریم ہے! الٰہی
ان ابلغ رحمتک فان رحمتک	اگر میں اس قابل نہیں کہ تیری رحمت تک پہنچوں
اھل ان تبلغنی و رحمتک وسعت	تو تیری رحمت تو شایاں ہے کہ مجھ تک پہنچے! الٰہی
کل شیٔ وانا شیٔ! الٰھی ان ذنوبی	تیری رحمت ہر چیز کو شامل ہے اور میں بھی ایک چیز
وان کانت عظاماً ولکنھا صغار	ہوں! الٰہی اگرچہ میرے گناہ بڑے ہیں لیکن تیرے
فی جنب عفوک، فاغفرھا لی یا کریم![1]	عفو کے مقابلہ میں چھوٹے ہیں: میرے گناہوں سے
	درگزر کر اے کریم!

جاننا ہو کہ یہ وہ مبارک مقام ہے جہاں حق تعالیٰ کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور ان رحمتوں کو وہ قلوب جذب کرتے ہیں جو اس میدان میں موجود ہوتے ہیں، یہ ابدال و اوتاد کے قلوب ہیں، ان صالحین کے قلوب ہیں جو حق تعالیٰ کے آگے سربسجود ہیں، ان کے حضور میں دست بستہ ذلت و مسکنت کے ساتھ گڑگڑا رہے ہیں: رحمتِ الٰہی کے جذب کا اس سے زیادہ قوی و موثر کوئی طریقہ نہیں کہ:

"ان ابرار کی ہمتیں اکٹھی ہوں اور ایک وقت میں ایک زمین پر قلوب ایک دوسرے کی مدد کریں!"

اس ادراک کے ساتھ ہی اس کی زبان سے یہ چیخ نکلتی ہے:

غمناکم واز درِ تو با غم نروم　　　جز شاد و اُمیدوار و خرم نروم

[1] یہ سب دعائیں احیاء العلوم باب نہم سے لی گئی ہیں۔ فلیرجع۔

از درگہ ہچو تو کریمے ہرگز نومید کسے نرفت من ہم نروم (ابوسعید)

اسی لیے کہا گیا ہے کہ:

عرفات شریف کے میدان میں اگر یہ سمجھا کہ حق تعالیٰ نے میری مغفرت نہیں کی، سب سے بڑا گناہ ہے"

رحمت اینجا کہ کند وسعتِ خود اظاہر
ہر کہ تقصیر نہ کرد است گنہ گارتر است!

رمیِ جمار[۱] کے موقع پر احرام باندھتے وقت کے اپنے اس قول کو یاد کرتا ہے کہ:

لبیک لحجۃ حقا تعبداً ورقا[۱]

اور محض اپنی غلامی و بندگی کے اظہار کے لیے امر کی اطاعت کا قصد کرتا ہے اور محض تعمیل ارشاد وامتثال امر الٰہی کے لیے رمی کرتا ہے، جانتا ہے کہ اس فعل میں نہ تو نفس کو کوئی حظ ہے اور نہ عقل کو، اپنی عقل اور نفس کو حق تعالیٰ کے حکم پر قربان کرتا ہے، اور دیوانہ وار "اقامت ذکر اللہ"[۲] کے لیے شیطان پر کنکر مارتا ہے اور زبان سے کہتا جاتا ہے:

اللہ اکبر علیٰ طاعۃ الرحمٰن ورغم الشیطان تصدیقاً بکتابک واتباعاً لسنۃ نبیک۔

جب قربانی[۳] کرتا ہے تو جانتا ہے کہ حق تعالیٰ کے حکم پر وہ اپنی بھی جان قربانی کے جانور کی طرح فدا کرنے کو تیار ہوگا بلکہ عاشق کی زندگی تو ہر "زمان مردتی" ہے وہ اپنی جان کو ہردم فدا کر رہا ہے،

اے حیاتِ عاشقاں در مردگی دل نیابی جز کہ در دل بردگی
ما بہا و خوں بہا را یافتیم جانبِ جاں باختن بشتافتیم

---

[۱] میں حاضر ہوں حج کے واسطے حقیقت میں بندگی اور غلامی کی راہ سے (دارقطنی در علل بروایت حضرت انسؓ)
[۲] انما جعل الطواف بالبیت والسعی بین الصفا والمروۃ ورمی الجمار لاقامۃ ذکر اللہ لا لغیرہ یعنی طواف کعبہ، سعی درمیان صفا و مروہ اور کنکریوں کا پھینکنا ذکر اللہ کے قائم رکھنے کے واسطے مقرر کیا گیا ہے (ابوداؤد و ترمذی بروایت

عاشقاں راہر زمانے مردنیست — مردنِ عشاق خود یک نوع نیست

او دو صد جاں دارد از نورِ ہدیٰ — واں دو صد را می کند ہر دم فدا

ہر یکے جاں را ستاند دہ بہا — از نبی خواں عشرة امثالہا[1] (رومی)

غرض حج کے اعمال ہیں دل کا وظیفہ یہ ہے جس کا اجمالاً اوپر ذکر ہوا، قلب کی یاد کے ساتھ حج کے اعمال وہی ادا کرتا ہے جس کے دل پر حق تعالیٰ کی محبت و غلامی کا داغ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس غلام کو خود بادشاہ خریدتا ہے اس کا مرتبہ سوا ہوتا ہے۔

داغِ غلامیت کرد پایۂ خسرو بلند،

صدرِ ولایت شود بندہ کہ سلطاں خرید

زیارتِ مدینہ

"زیارتِ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) اوکد مستحبات و افضل قربات سے ہے اور صاحبِ قدرت کے لیے قریب واجب کے ہے۔"

خوش آنکہ بندم در رہت بر ناقہ محمل از وطن!

خیزم چو گرد، افتم چو اشک، آیم بسر غلطم بہ تن (راہ حدی)

مدینۂ رسول کی راہ میں درود کے شغل سے بہتر کوئی شغل نہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ من صلّی علیّ واحدۃً صلی اللہ علیہ عشراً (مسلم)

اس راستہ کو درود و سلام کے ورد ہی میں ختم کرنا چاہیے، محبتِ نبوی کا تقاضا یہی ہے ؎

من مذہبی حب النبیّ وصحبہ

وللناس فیما یعشقون مذاہب

[1] دہ ما تداں، اشارہ بآیہ من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالہا (سورۃ الانعام)

[2] مولانا صدیق حسن مرحوم، در الشمامۃ العنبریہ من مولد خیر البریہ ص ۱۱-۱۲

جب مدینہ منورہ کی دیواروں پر نظر پڑتی ہے تو عاشق کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ یہ وہ مبارک شہر ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے محبوبؐ کے لیے پسند فرمایا ہے، اور اس کو ان کا دار الہجرۃ بنایا ہے یہ وہ مقام مقدس ہے جہاں آپؐ نے حق تعالیٰ کے فرائض وسنن مشروع فرمائے، اعدائے دین سے جہاد کیا اور حق تعالیٰ کے دین کو ظاہر کیا، اسی پاک زمین میں آپؐ نے اپنی زندگی بسر فرمائی، یہاں تک کہ حق تعالیٰ نے آپ کو اپنے جوارِ رحمت میں بلا لیا اور آپ کی قبر مطہر اس میں مقرر فرمائی، اور آپ کے دو وزیر جو آپؐ کے احکام کی بجا آوری میں کامل تھے آپؐ ہی کے پہلو میں آرام فرما رہے ہیں! اس خیال کے آتے ہی وہ فرطِ مسرت سے چیخ اٹھتا ہے: ؎

من ویثرب کہ بہ از نور بود خاک انجا! — باشد از مہر مبین سایۂ افلاک آنجا!
شرفِ خاکِ رہش راست کہ تا بود دینِ آب — از تیمم شود اعضائے وضو پاک آنجا!
بحر رحمت شود آں قطرہ کہ از وے ریزد — چوں کند تابِ سفر جبہۂ عرقناک آنجا!
صاحبش راست جنابے کہ ز بس تعظیمش — بال جبرئیل بروبد خس و خاشاک آنجا!

(مولوی احسان اللہ ممتاز)

جب عاشقِ رسولؐ مدینہ منورہ کی پاک زمین پر قدم رکھتا ہے تو اس کی زبان سے بے اختیار نکلتا ہے: ؎

اندر دو جہاں کعبۂ ما کوئے محمدؐ
محراب دل و جاں خم ابروئے محمدؐ

وہ دیوانہ وار حق تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے ؎

اللہ! ایسے جذبِ محبت کو کیا کروں!
رگ رگ کو جس نے درد بھرا دل بنا دیا

ہر قدم پر وہ یہ سوچتا ہے کہ اس مقام پر آقائے نامدارؐ کے قدم پڑے ہونگے، قدم اٹھاتا ہے پھر ٹھہر جاتا ہے، بڑھتا ہے، پھر تھم جاتا ہے ؎

ترے کوچے میں ہم کل اس طرح سے جابجا ٹھہرے
چلے، چل کر تھمے، تھم کر بڑھے، بڑھ کر ذرا ٹھہرے

اس گلی کے ہر ذرّے کو وہ اپنا دل سمجھتا ہے۔

ہم اس کوچے کے ہر ذرّے کو اپنا دل سمجھتے ہیں:

تجلیات جب اس کو آگے قدم بڑھانے نہیں دیتیں، تو وہ چیختا ہے ؎

پایم بہ پیش از سرِ ایں کو نمی رود
یاراں خبر دہید کہ ایں جلوہ گاہِ کیست (نظیری)

اسی محبت کی تجلی میں وہ دیکھتا ہے کہ:

کوچۂ جاناں کا ہر ذرّہ چراغِ طور ہے!

اپنے محبوبؐ کا وہ خیال کرتا ہے، حق تعالیٰ نے اپنی معرفت کس درجہ آپ کو عطا فرمائی تھی! آپؐ کے ذکر کو کس درجہ بلند فرمایا تھا کہ اپنے ذکر کے ساتھ اس کو ملا دیا تھا۔ رفعنا لك ذکرك کی نوید سے آپ کو سرفراز فرمایا تھا! آپؐ کی تعظیم کے ترک کرنے پر کیسی وعید فرمائی تھی، گو آپ کی آواز پر اپنی آواز ہی کے بلند کرنے سے وہ ترکِ تعظیم کیوں نہ ہو! حبطِ اعمال اس کی سزا تھی: پھر نظامیؒ کے الفاظ میں وہ اس طرح ثناخواں ہوتا ہے ؎

شمسہ نہ مسندِ ہفت اختراں	ختم رسل خاتم پیغمبراںؐ
احمدِ مرسل کہ خرد خاکِ اوست	ہر دو جہاں بستۂ فتراک اوست
اُمیِّ گویا بہ زبانِ فصیح	از الف آدمؑ و میم مسیحؑ
اے تنِ تو پاک تر از جانِ پاک	روحِ تو پروردۂ روحی فداک
اے مدنی برقع و مکی نقاب	سایہ نشیں چند بود آفتاب
اے گوہرِ تاجِ فرستادگان	تاجِ دہ گوہرِ آزادگاں

پھر وہ خیال کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان نیک بختوں پر کتنا بڑا احسان فرمایا، جنھوں نے

Marfat.com

آپ کی صحبت پائی، اور مشاہدۂ جمال، استماعِ اقوال و ملاحظۂ احوال سے سعادت حاصل کی، اور اپنے حال پر آنسو بہاتا ہے کہ یہ دولتِ سرمدی مجھے نصیب نہ ہوئی، اور نہ آپ کے اصحابِ کرامؓ کی صحبت ملی! دنیا میں تو آپ کو نہ دیکھا، آخرت میں بھی شاید آپ کی زیارت نگاہِ حسرت ہی سے ہو اور اعمالِ بد کے باعث آپ ہمیں قبول نہ فرمائیں کیونکہ آپ کا ارشادِ مبارک ہے کہ،

"قیامت کے روز کچھ لوگوں کو فرشتے دوزخ کی طرف لے جائیں گے (جن میں اپنی امت کی بعض نشانیاں دیکھ کر) میں حق تعالیٰ سے عرض کرونگا، حق تعالیٰ یہ میرے لوگ ہیں! حکم ہوگا کہ نہیں، تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے بعد انہوں نے کیا کام کیے ہیں!

تب میں کہونگا کہ مجھ سے دور ہو، مجھ سے دور ہو!" (رواہ الشیخان)

یہ حال اُن لوگوں کا ہوگا جنہوں نے شریعتِ مطہرہ کی توقیر نہیں کی، سنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی قدر نہ سمجھی، اور بدعت کو ترجیح دی! اب وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے، اس وعید سے کانپ اٹھتا ہے، اپنے گناہوں سے توبہ کرتا ہے، چیختا ہے ؎

هر چند گناہ بے شمار است — صد مرتبہ بے شمار توبہ
در بارگہت کنم خدایا — با دیدۂ اشکبار توبہ
گر رفت بہ ترہات عمرم — کردم نہ بیک دو بار توبہ
شد ہر سرِ مو کنوں زبانے — آرم بتو بار بار توبہ (ملا اعلیٰ)

پھر غرقِ خجالت میں غرق ہو کر حق تعالیٰ سے التماس کرتا ہے:۔

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر — روزِ محشر عذر ہائے ما پذیر
یا اگر بینی حسابم ناگزیر — از نگاہِ مصطفےٰ پنہاں بگیر! (اقبال)

پھر امید و رجا کی موج اس کے سینے میں اٹھتی ہے، وہ اس امر کا احساس کرتا ہے کہ حق تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے اس کو سرفراز فرمایا، اپنے محبوبؐ کی زیارت کے لیے وطن سے نکال کر اس مقدس مقام پر پہنچایا، حظِ دنیا یا تجارت اس سفر سے اس کا مقصود

Marfat.com

نہ تھا، فقط آپؐ کی بے پایاں محبت اور آپ کے آثار کے دیکھنے کے شوق ہی نے اس کو وطنِ مالوف سے نکالا، زندگی میں جب آپؐ کا دیدار نصیب نہ ہوا تو اس نے اس پر ہی قناعت کی کہ آپؐ کی مسجد مبارک میں حاضر ہو کر آپؐ کی قبر اطہر کی دیوار پر ہی نظر ڈالے۔

غریبے گر روی بشہر و دیار　　روی در مسجد مصفا کن

دوست راگر نمی توانی دید　　خانۂ دوست را تماشا کن

جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ سامان مہیا کر دیے تو اب اس کی رحمت سے یہی توقع ہے کہ وہ اس کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھینگے، اور اس کے گناہوں کو معاف فرمائینگے۔

اندر علم انچہ ترا شاید نیست

اندر کرمت انچہ مرا باید ہست

جب مسجدِ نبوی میں قدم رکھتا ہے تو یہ سوچتا ہے کہ یہ وہ مقدس جگہ ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنے نبیِ مکرم اور مسلمانوں میں سے اول اور افضل لوگوں کے لیے تجویز فرمایا، جو بقول عارف رومیؒ

برتر نداز عرش و کرسی و خلا

ساکنانِ مقعدِ صدقِ خدا

اور جو حق تعالیٰ کی نظر میں محبوب و مطلوب و پسندیدہ رہے ہیں۔

جانتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں سب سے پہلے حق تعالیٰ کے فرائض ادا ہوئے، اور کامل عبودیت کے ساتھ ادا ہوئے! یہی وہ زمین ہے جس میں تمام مخلوق سے افضل و برتر لوگ حالتِ حیات و حالتِ ممات میں جمع ہیں! اب وہ توقع کرتا ہے کہ حق تعالیٰ اس پر بھی رحم فرمائینگے، اور دل ہی دل میں عرض کرتا ہے:

بضاعت نیاوردم الا امید

خدایا ز عفوم مکن نا امید

پھر مسجد مبارک میں خشوع و تعظیم سے داخل ہوتا ہے، زبان پر یہ دعا ہوتی ہے :-

Marfat.com

اللّٰھم ھٰذا حرم رسولك فاجعلہ لی وقایۃ من النار وامانا من العذاب وسوء الحساب اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتك وارزقنی من زیارۃ نبیك ما رزقت اولیائك واھل طاعتك واغفر لی وارحمنی یا خیر مسئول۔

پھر نیتِ اعتکاف الی الخروج کرکے روضۂ جنت کی طرف بڑھتا ہے اور محرابِ نبویؐ کے پاس، ممکن ہو تو مصلّٰی نبویؐ یا اُس سے متصل یا منبر کے پاس، اور نہ ہو سکے تو کسی ایک مقام پر تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا کرتا ہے، پھر اس نعمتِ عظمٰی کے حصول پر حق تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے، اور رضا، توفیقِ خیر، قبولِ اعمال و بلوغ مقاصد کی دعا کرتا ہے! دعا کے الفاظ یہ ہوتے ہیں:

اللھم ان ھذہ روضۃ من ریاض الجنۃ شرفتھا وکرمتھا ومجدتھا وعظمتھا ونورتھا بنور نبیك وحبیبك محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللھم کما بلغتنا فی الدنیا زیارتہ ومآثرہ الشریفۃ فلا تحرمنا یا اللہ فی الاٰخرۃ من فضل شفاعۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم واحشرنا فی زمرتہ وتحت لوائہ وامتنا علی محبتہ وملتہ واسقنا من حوضہ المورود بیدہ الشریفۃ شربۃ ھنیۃ لا نظماء بعدھا ابدًا انك علی کل شیء قدیرا۔

پھر زیارت کی نیت سے نہایت ادب و خشوع کے ساتھ روضۂ پاک کے سامنے حاضر ہوتا ہے، اس کا عقیدہ ہے کہ حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس کے آنے، کھڑے ہونے، اور زیارت کرنے کا علم ہوتا ہے، اور اس کا درود و سلام آپؐ کی خدمتِ مبارک میں پہنچتا ہے۔[1] آپؐ نے فرمایا کہ:

من صلّی علیّ واحدۃ صلی اللہ علیہ عشرًا (مسلم)

یہ جزا تو صرف زبان سے درود پڑھنے کی ہے، جب وہ خود زیارت کے لیے تمام بدن سے

[1] یہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ "جو لوگ میری قبر پر آکر سلام کریں گے میں اس کا سلام خود سنونگا اور دور سے سلام کرنے والوں کا سلام مجھے پہنچایا جائیگا۔" (مشکوٰۃ)

حاضر ہوا ہے تو اس کا بدلہ کس قدر عظیم الشان ہوگا!

اب وہ اپنے آقائے نامدار (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے:

الصلوٰۃ والسلام علیك ایھا النبی السید الکریم والرسول العظیم والحبیب الرؤف الرحیم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ الصلوٰۃ والسلام علیك یا محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب ابن ھاشم یا طٰہٰ یا یٰسٓ یا بشیر یا سراج یا مبین یا مقدم جیش الانبیاء والمرسلین ؎

یا خیر من دفنت فی التراب اعظمہ ۔۔۔ فطاب من طیبھن القاع والاکم
نفسی الفداء لقبر انت ساکنہ ۔۔۔ فیہ العفاف وفیہ الجود والکرم
انت الحبیب الذی ترجی شفاعتہ ۔۔۔ عند الصراط اذا ما زلت القدم

پھر صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہے۔

پھر حضورؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منبر شریف کے پاس حاضر ہوتا ہے اور تصور کرتا ہے کہ گویا آپؐ منبر پر چڑھے کھڑے ہیں اور مہاجرین وانصار آپؐ کے گرد حلقہ کیے ہوئے ہیں اور آپ ان کو خطبے میں حق تعالیٰ کی اطاعت کی ترغیب وہمت دلا رہے ہیں اور نافرمانی سے روک رہے ہیں اور ڈرا رہے ہیں ؎

محمدؐ شہنشاہِ خیلِ رسل ۔۔۔ کہ خرد ند پیشش چہ جزو چہ کل
درخشاں دُرِ درجِ عبدِ مناف ۔۔۔ بانگشتِ اعجاز مہ را شگاف
زابروش محرابِ عین الیقین ۔۔۔ زگیسوش اسبابِ حبل المتین
فلک ہا ز دریاش در شبنمے ۔۔۔ فصیحاں زعوغاش در لبکمے
چناں عقدہ از کارِ امت کشاد ۔۔۔ کہ دنداں دریں کار بر باد داد! (ظہوری)

دل میں توحید پر جینے مرنے کا پختہ عزم کرتا ہے، حضورؐ کی محبت کو قلب میں اور زیادہ راسخ کرتا ہے، اور آپؐ کی سنتِ مطہرہ پر ساری عمر عمل کا پورا ارادہ کرتا ہے۔ اس عقیدے کو پختہ کرتا ہے کہ

Marfat.com

حق تعالیٰ ہر حال میں اس کے نگراں ہیں ۔۔۔ "الم یعلم بان اللہ یریٰ" ۔۔۔ اس کے دل کے وسوسوں اور خفیہ خطرات وخیالات کو دیکھتے اور جانتے ہیں تاکہ سب کاموں میں ادب کا لحاظ رکھے جیسے کہ کوئی شخص کسی بادشاہ کی نظروں کے سامنے ہے، ہر وقت گردن جھکائے، اور ہر کام میں ادب! اس یقین کو بھی دل میں مضبوط کرتا ہے کہ:

"فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَہٗ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَہٗ"

یعنی طاعات کو ثواب سے ایسی نسبت ہے کہ جیسے غذا کو پیٹ بھرنے سے اور گناہوں کو عذاب سے وہ تعلق ہے جو زہر کو ہلاکت سے!

عزم کرتا ہے کہ اپنے تمام حرکات وسکنات، خطرات ولحظات، لفظات وفلتات، غدرات و فجرات پر ہمیشہ نظر رکھیگا، اور تقویٰ کے اختیار کرنے میں اور ہر برائی سے اجتناب کرنے میں مبالغہ سے کام لیگا۔ بحول اللہ وقوتہ

آخر میں اس تسکین بخش عقیدے کو بھی پختہ کرتا ہے کہ رزق کی کفالت خود حق تعالیٰ نے فرمائی ہے، یہ کہہ کر کہ:۔

"مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا"

یہ رزق مضمون ضرور ملیگا، جتنا مقدر ہے وہ قطعاً پہنچ کر رہیگا، طلب رزق بطور شرعی کرنا چاہیے۔ اور جو چیز فوت ہو جائے اس پر افسوس نہ کرنا چاہیے۔

لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ!

مبز ستریف کے س پہنچ کر تصور کرتا ہے کہ کچھ ان ہی تیقنات پر حضور انور (صلی اللہ علیہ وسلم) زور دے رہے ہیں اور وہ انھیں اپنے قلب میں اُتار رہا ہے، اور اپنے تحت شعوری نفس میں انھیں پختہ کر رہا ہے۔

حج وزیارت کے اعمال میں یہ ہے دل کا وظیفہ، جس کے اجمال کا ذکر ہوا۔ اس طرح فارغ ہو کر حاجی فرط مسرت سے چیخ اُٹھتا ہے ۵

نازم بچشمِ خود کہ جمالِ تو دیدہ است
افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است
ہر دم ہزار بوسہ زنم دستِ خویش را
کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است

Marfat.com

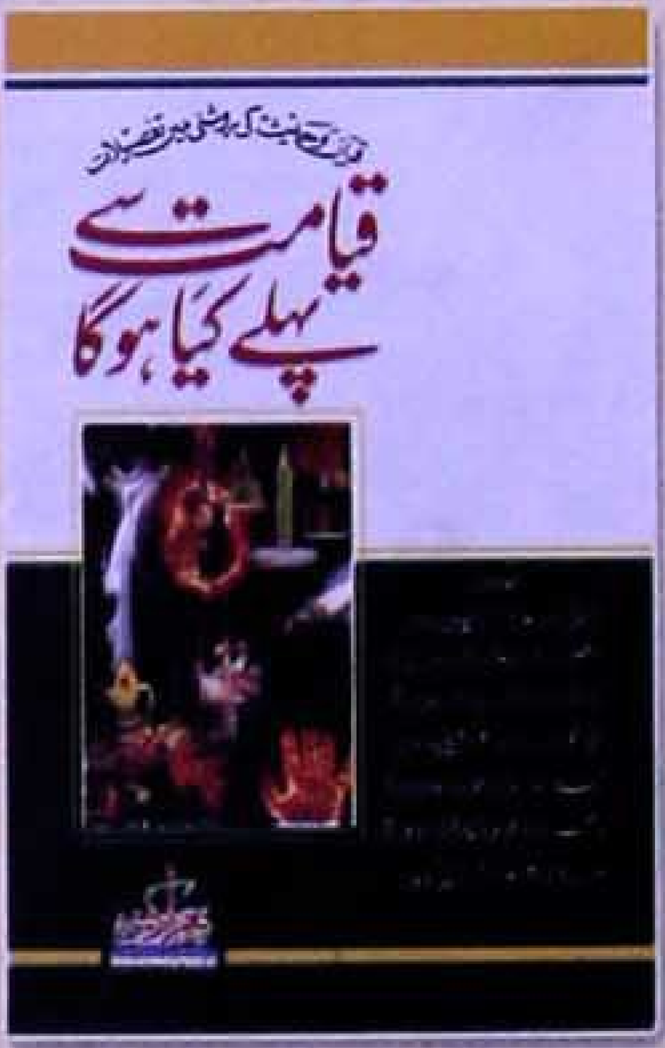

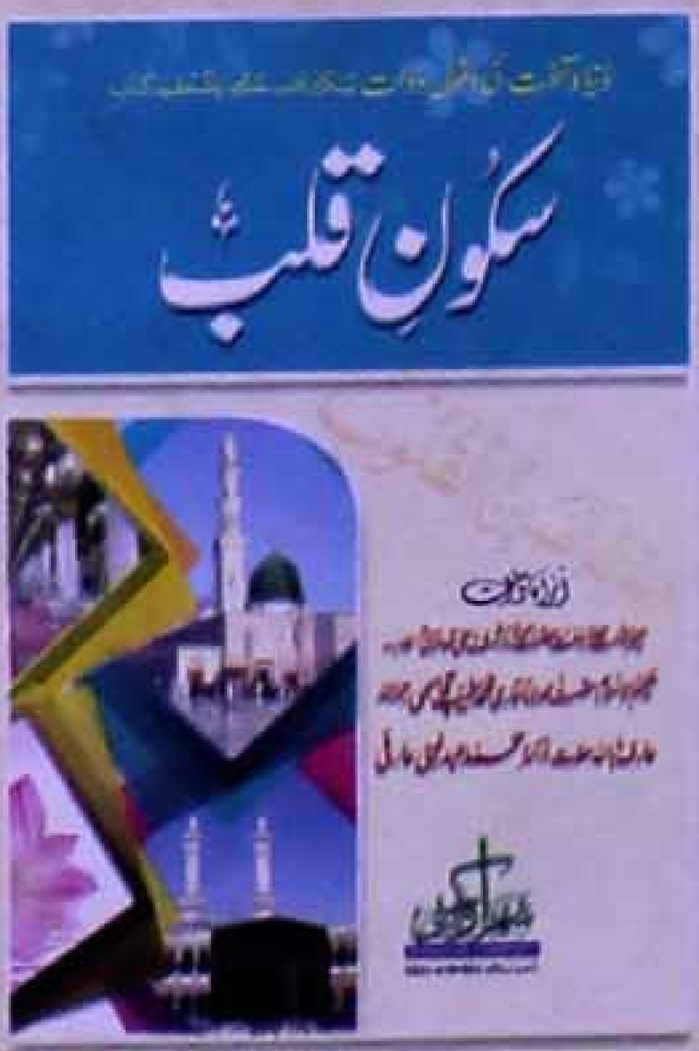

پروگریسو بکس
یوسف مارکیٹ ۔ غزنی سٹریٹ
اردو بازار ۔ لاہور
فون 042-37124354 فیکس 042-37352795

Marfat.com